کشمیر میں عربی علوم

اور

اسلامی ثقافت کی اشاعت

ڈاکٹر سید محمد فاروق بخاری

کشمیر میں عربی علوم

اور

اسلامی ثقافت کی اشاعت

-«حصہ اول»-

ڈاکٹر سید محمد فاروق بخاری

سال اشاعت ۱۹۸۷ء

تعداد اشاعت .... ایک ہزار

کتابت .... عبدالحمید جاوید عیدگاہ سرینگر

طباعت .... نیو کشمیر پریس سرینگر

قیمت مجلد .... چالیس روپے (/40-Rs)

پتہ
بخاری منزل
عیدگاہ سرینگر

فہرست مضامین

مضمون	صفحہ

مضمون	صفحہ
خانقاہِ شمسی چک	۱۲۱
خانقاہِ میر سیّد علی ہمدانیؒ	"
خانقاہِ ملک جلال	"
خانقاہِ نقشبندیہ	"
مدرسۂ مُلّا عبید اللہ	۱۲۲
عہدِ مغلیہ کے ممتاز علماء اور مدرسین	۱۲۳
افغان دَور اور ذلّت و نکبت کی ابتداء	۱۲۴
افغان دَورِ حکومت کے ممتاز علماء	۱۲۸
سکھ اور ڈوگرہ دَورِ حکومت	۱۲۹
منصوبہ بند ظلم و استبداد	۱۳۲
ڈوگروں کی سودا بازی	۱۳۴
علمی زوال	۱۳۸
مسلم معاشرے کی تباہی اور عقائد میں فساد	۱۳۹
اصلاحی کوششیں	۱۴۲
کشمیر کے مہاجر علماء اور اربابِ فکر و سیاست	۱۵۱
فصل اوّل	
تفسیر اور قرآنی علوم کی تدریس و تعلیم	۱۵۷
الرسالۃ فی الناسخ والمنسوخ : میر سیّد علی ہمدانیؒ	۱۶۵
مطلب الطالبین : شیخ یعقوب صرفی کشمیری	۱۶۹
جامع المفردات : سیّد مراد نقشبندی	۱۷۶
زبدۃ التفاسیر : شیخ معین الدین نقشبندی	۱۸۴
آیات الاعجاز : مولانا عبد الرشید شوپیانی	۱۹۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

کشمیر کی اسلامی دور کی تاریخ کے جو اہم پہلو اب بھی مستور ہیں ان میں وہ شاندار علمی خدمات بھی شامل ہیں جو یہاں کے علماء نے عربی علوم و فنون کی ترویج و اشاعت میں انجام دی ہیں۔ اگرچہ پچھلے بیس پچیس سال کے دوران کشمیر کی سیاسی تاریخ، معاشی و معاشرتی حالات اور ادب اور ادبی تحریکات پر کئی قیمتی کتابیں منظرِ عام پر آچکی ہیں مگر یہاں کے علماء نے عربی دینی علوم میں جو شاندار کارنامے انجام دیئے ہیں انہیں کسی جانب سے اُجاگر کرنے کی کوئی ٹھوس کوشش نہیں ہوئی ہے۔ اس لاپروائی اور کوتاہی کا نتیجہ یہ نکلا کہ اگر قدیم مصنفوں نے اپنی کتابوں میں کشمیر کے اسلامی عہد کی تمدنی ترقی کا تذکرہ درج نہ کیا ہوتا تو شاید کشمیر کے مسلمان آج اپنی عظیم الشان تاریخ، اپنے تمدن، اپنی ثقافت، اپنے اقدار اور اپنے علمی اور فکری ورثے سے بالکل بے خبر ہوتے، اور یہی بے خبری، جیسا کہ اقوام و ملل کی تاریخ کھول کھول کر بتاتی ہے کہ بڑی سے بڑی قوم کے زوال کا اوّلین سبب بن جاتی ہے۔ آج جب کہ کشمیر میں بڑی تیزی سے تمدنی اور فکری تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ ہم اپنے مقدس اسلاف کے علمی اور فکری کمالات کا کھوج لگا کر ان کی حفاظت اور تبلیغ کا اہتمام کریں تاکہ

چراغ سے چراغ روشن ہوکر شاندار ماضی سے تعلق قائم رہے اور تاریخ مسخ کرنے والے مداریوں کو تاریخ کے نام پر کوئی خطرناک کرتب دکھانے کا موقعہ ہاتھ نہ آئے ــــــ زیرِ نظر تالیف اسی احساسِ ذمہ داری کا ایک ادنیٰ سا اظہار ہے۔

مؤلف نے اس تالیف کو کسی مخصوص دور تک محدود رکھنے کے بجائے پورے اسلامی دور ــــــ یعنی کشمیر میں داخلۂ اسلام سے لیکر دورِ جدید تک ــــــ وسعت دی ہے اور اسی طرح اس میں تمام اہم علوم کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ یہاں اس کی مجمل ترتیب پر سرسری نگاہ ڈالنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

- باب اوّل : عربی دینی علوم؛ اس باب کو چار فصلوں میں تقسیم کیا گیا اوّل : تفسیر اور قرآنی علوم ، دوّم : علم حدیث اور محدثین، سوم : فقہ اور علمائے فقہ ، چہارم : فقہ امامیہ۔
- باب دوّم : عقلی علوم؛ اس میں دو فصل ہوں گے۔ اوّل : عقائد اور کلام ، دوّم : ریاضی، نجوم اور طب۔
- باب سوم : ادبی علوم؛ اس میں صرف عربی شعر و شاعری اور ادب کے دوسرے فنون، جیسے صرف و نحو، معانی و بیان وغیرہ سے متعلق معلومات درج کئے گئے ہیں۔
- باب چہارم : اس باب کو علم تصوف اور ممتاز اہلِ قلم صوفیاء کے حالات اور کمالات سے مخصوص رکھا گیا۔

اس ترتیب و تشکیل سے اگرچہ کتاب کسی حد تک جامع تو ضرور بن گئی مگر مواد کے پھیلاؤ اور وسائل کی کمی کی وجہ سے اسے ایک ہی جلد میں پیش کرنا

ناممکن بن گیا۔ مجبوراً ہم نے کتاب کے چار ابواب کو چار مستقل حصوں میں تقسیم کیا۔ اس وقت انہی میں سے پہلا حصہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔

علوم و فنون پر بحث و گفتگو سے قبل کتاب پر ایک مفصل "مقدمہ" لکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی جس میں کشمیر میں عربی علوم اور اسلامی تمدن کے نشو و نما اور عروج و زوال کا جائزہ لیا گیا، اس سے علمائے کشمیر کی علمی خدمات کا صحیح اندازہ لگانے میں مدد مل سکتی ہے۔

خاکسار مؤلف نے اس کتاب میں شیعہ فرقہ سے تعلق رکھنے والے علماء اور اصحاب قلم کو بھی مناسب جگہ دی ہے جن کے ذکر سے کشمیر کی علمی تاریخیں تقریباً خالی ہیں۔ مولوی غلام حسن مرحوم (مورخ کشمیر) جو اپنی عالی ظرفی میں بڑی شہرت کے مالک تھے، کی مبسوط تاریخ کشمیر بھی شیعہ علماء کے حالات اور علمی کمالات سے خالی ہے جس کا پروفیسر صاحبزادہ حسن شاہ نے تاریخ حسن کے اپنے محققانہ انگریزی مقدمے میں شکوہ بھی کیا ہے زیر نظر کتاب میں ناچیز مؤلف نے اپنی رسائی کی حد تک اس کمی کو پہلی بار پورا کرنے کی کوشش کی۔

اس کتاب میں ان علماء کو بھی فخر سے جگہ دی گئی جنہوں نے کشمیر کی ذہنی اور تمدنی تاریخ سنوارنے میں کوئی حصہ ادا کیا ہے، چاہے ان کا جسمانی تعلق بیرونی ممالک ہی سے کیوں نہ رہا ہو۔ مثلاً حضرت میر سید علی ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ کا پیدائشی تعلق ہمدان سے تھا اور ختلان (موجودہ روسی وسط ایشیائی) میں سپرد خاک ہوئے مگر ان کی تبلیغی اور تعلیمی سرگرمیوں کا اہم ترین مرکز کشمیر رہا ہے۔ ظاہر ہے کشمیر سے ان کے اس تعلق کو نظر

نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے کہ وہ جسمانی لحاظ سے غیر کشمیری تھے۔ کشمیر کے باشندے فخر سے کہتے آئے ہیں۔ ؎

اہل کشمیر را پناہ است اُو رہبرِ خلق تا الہٰ است اُو (کامل)

علامہ سید سلیمان ندوی نے افغانستان کے ایک ممتاز عالم اور محقق مُلّا علی قاری کو ہندوستان کے محدثین میں شامل کیا ہے اور وجہ یہ لکھی ہے:

"مُلّا علی قاری گو رہنے والے ہرات کے تھے مگر اس زمانہ میں ہرات تیموری سلطنت ہی کا ایک جزء تھا۔ اور ان کا فضل و کمال بھی تمام تر اساتذۂ ہند کا ممنونِ احسان ہے اور ان کی تصانیف نے بھی یہیں زیادہ شہرت حاصل کی۔ اس لئے یہ محدثین ہند کی فہرست سے خارج نہیں ہو سکتے ہیں۔"

(ہندوستان میں علم حدیث: معارف، اکتوبر ۱۹۲۸ء)

غرض مؤلف اس راہ میں منفرد نہیں ہے بلکہ اس نے دورِ حاضر کے ممتاز علماء اور محققین ہی کی پیروی کی جن میں علامہ ندوی کے علاوہ مولانا عبدالحی حسنی، ڈاکٹر زبید احمد، ڈاکٹر محمد اسحاق (ڈھاکہ) اور ڈاکٹر محی الدین صوفی شامل ہیں۔

اسی طرح اس تالیف میں ان ممتاز ترین مہاجر علماءِ کشمیر کو بھی شامل کیا گیا جو خود یا جن کے اسلاف کشمیر کی انتظامی بد حالی، امن و سکون کے فقدان یا کسی دوسری وجہ سے وطن چھوڑنے پر مجبور ہوئے تھے اور برصغیر کے اطراف و مضافات میں آباد ہو گئے تھے کیونکہ ان کی ہجرت سے ان کی وطنی نسبت ختم نہیں ہو سکتی۔ یہ سارے علماء اور

ارباب فکر و قلم کشمیر کی علمی تاریخ کی آبرو ہیں۔ علامہ محمد انور شاہ محدث کی زندگی کا بیشتر حصہ کشمیر سے باہر گذرا تھا بایں ہمہ کشمیری ان کے نام کا جزو غیر منفک بن گیا۔ یہی حال علامہ اقبال کا تھا جنہیں آخری دم تک اپنے کشمیر الاصل ہونے پر فخر رہا۔ ؎

تنم گلے ز خیابان جنت کشمیر دل از حریم حجاز و نوازش از شیراز است

مطلع این اختران کشمیر ما است (پیام)

علمائے کشمیر نے علم کے مختلف شعبوں میں جو سرمایہ پیش کیا ہے، اس کا بیشتر حصہ سیاسی ہنگاموں اور نا اہل اخلاف کی بے قدری کی نذر ہو چکا ہے۔ جو کچھ بچ گیا تھا اس کا بھی ایک قیمتی حصہ انگریزوں نے اپنے دورِ حکومت و سیادت میں لوٹ کر یورپ پہنچا دیا۔ بالخصوص مسٹر بوہلر اس علمی لوٹ میں رسوائی کی حد تک بدنام ہوا تھا۔ دورِ حاضر میں کشمیری مسلمانوں کے بچے کھچے علمی ورثے کا سراغ لگانے اور اس کے حاصل کرنے میں پروفیسر صاحبزادہ حسن شاہ نے بڑی علمی خدمات انجام دی۔ یہ صرف انہی کی سعیِ پیہم کا نتیجہ ہے کہ ریاستِ جموں و کشمیر کے ادارہ تحقیقات و نشریات میں فارسی اور عربی کا قیمتی ذخیرہ جمع ہو سکا۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے نہ صرف کشمیر کے اجڑے ہوئے علمی گھرانوں سے مخطوطات حاصل کئے بلکہ مولانا آزاد لائبریری علیگڈھ، خدا بخش لائبریری پٹنہ، کتب خانہ آصفیہ، نیز حیدر آباد، لکھنو یہاں تک کہ انڈیا آفس اور برٹش میوزیم سے بھی رابطہ قائم کر کے کچھ اہم کتابوں کی نقل حاصل کرنے کی انتھک کوشش کی۔ خدا انہیں ہم سب کی طرف سے بہترین صلہ عطا فرمائے۔

اس کتاب کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں ایک طویل مدت صرف ہوئی۔ اس میدان میں خاکسار مؤلف کی مثال صحرا کے اُس درخت کے مانند رہی جس کی نگاہ صرف ابرِ کرم پر جمی رہتی ہے۔ دُعا ہے خدا اسے شرفِ قبولیت بخشے اور اس کے مطالعہ کرنے والوں کو اس سے فائدہ پہنچے۔ یہی بے بضاعت مؤلف کے لئے اُس کی محنت کا بہترین معاوضہ ہوگا۔

کتاب کے بعض اہم اجزاء مضامین کی شکل میں ملک کے مؤقر علمی رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ جن میں معارف (اعظم گڈھ) برہان (دہلی) اور دارالعلوم (دیوبند) خاص طور قابلِ ذکر ہیں۔ اس سے کتاب کی قدر و قیمت میں یقیناً اضافہ ہوا۔ اس کے لئے مؤلف ان علمی رسائل کے ذمہ دار ارکین کا شکر گذار ہے۔

محمد فاروق بخاری

۲۵ جولائی سنہ ۱۹۸۷ء
ذوالقعدہ سنہ ۱۴۰۷ھ

مقدّمہ

(کشمیر میں اسلامی ثقافت کی تاریخ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلام کی اشاعت سے پہلے کشمیر کا علمی مقام

کشمیر اس لحاظ سے نہایت خوش قسمت ہے کہ یہ قدیم ترین زمانے میں بھی علوم و فنون کا ایک ممتاز مرکز تھا۔ بدھ اور ہندو دورِ حکومت میں یہاں کے اہلِ علم نے عقلی علوم اور ادبی فنون میں اپنی گہری بصیرت اور صلاحیت کے ایسے نقوش آس پاس کے ممالک پر ثبت کئے تھے کہ علم کی دیوی سرسوتی کے بارے میں لوگوں کا یہ اعتقاد بن گیا تھا کہ وہ کشمیر ہی میں رہتی ہے۔[1] اس سلسلے میں ڈاکٹر ناگ راجن نے یہ دلچسپ واقعہ لکھا ہے کہ راجہ کنیا کبتا نے جب اپنے درباری شاعر ہرش کو سنسکرت میں کوئی غیر معمولی کتاب تیار کرنے کو کہا تو اس نے کافی محنت کے بعد اپنی اہم ترین منظوم کتاب "نے شدھ Naisadha" تیار کر کے راجہ کو پیش کی، مگر راجہ کنیا نے کہا کہ پہلے اسے کشمیر لے جاؤ، اسے وہاں کے پنڈتوں کو دکھاؤ، علم کی دیوی کے سامنے رکھو اور پھر مجھے اپنے تجربات سے آگاہ کرو۔[2] ابوریحان البیرونی (م۔ ۴۴۰ھ) جب سلطان محمود غزنوی کے ساتھ کشمیر کے حدود تک

---

١ : Contribution of Kashmir Sanaskrit Literature, By: Dr. S.K Nagarajan, Banglore P. IV

٢ : ایضاً ، P. IV

پہنچا اور یہاں کے بارے میں مختلف معلومات حاصل کئے تو اُسے یہاں کے بازارِ علم کی رونق پر بڑا تعجب ہوا اور اس نے بڑی دیانت سے اپنی مشہور کتاب تحقیق ما للہند[1] میں شرح و بسط سے کشمیر کے علمی حالات قلمبند کئے۔ اس نے لکھا کہ پورے ہندوستان میں صرف کشمیر اور وارانسی علم کے دو اہم ترین مرکز ہیں[2]۔ اُس نے یہ بھی انکشاف کیا کہ ویدوں کو سب سے پہلے کشمیری پنڈتوں نے ہی ضبطِ تحریر میں لایا ورنہ اس سے قبل ان کا وجود صرف ان کے یاد کرنے والوں کے حافظے تک محدود تھا جو ان کے اشلوکوں کو زبانی یاد کر کے نسل بہ نسل منتقل کرتے تھے[3]۔ البیرونی سے صدہا سال قبل ہندوستان اور چین کے جویائے علم کشمیر وارد ہو کر سیراب ہوتے تھے، ان میں مشہور چینی فاضل اور سیاح ہیون سانگ[4] Hwien Tsang.

---

[1] اس کتاب کا پورا نام یہ ہے "تحقیق ما للہند من مقولۃ مقبولۃ فی العقل او مرذولۃ"

[2] Al-Biruni's Knowledge of Indian Geography: By: B.C. Law, P. 5

[3] مولانا سید مناظر احسن گیلانی لکھتے ہیں: "عبداللہ یوسف علی (انگریزی زبان میں قرآن حکیم کے مشہور مفسر) نے ہندوستانی اکیڈمی میں "ہندوستان کے ازمنۂ وسطیٰ کی معاشرتی اور اقتصادی حالت" پر لیکچر دیا۔ سننے والوں میں ہندو مذہب کے مستند عالم اور مؤرخ بھی موجود تھے۔ جب انہوں نے البیرونی کے حوالہ سے مذکورہ بالا قول نقل کیا تو کسی نے کوئی اعتراض نہ کیا۔" تدوینِ حدیث، ص ۹۷، مجلس علمی کراچی ۱۹۵۶ء

[4] چین کا یہ مشہور و ممتاز سیاح آج Xuan Zhuang سے جانا جاتا ہے۔ سیان "Xi'an" میں اس کے نام پر ایک پگوڈا (Pagoda) بطور یادگار قائم ہے جو سات منزلوں پر مشتمل ہے اور ۶۴ میٹر لمبا ہے۔ وہ بارہمولہ کے راستے سے کشمیر داخل ہوا تھا اور پیر پنجال سے واپس لوٹا تھا۔ اس نے یہاں سے جو نوشتے اور کتبے اپنے ساتھ لئے اُن کا اُس نے چینی زبان میں ترجمہ کیا جس سے چین میں بدھ مت پھیلنے میں سرعت واقع ہوئی تھی۔

بھی شامل تھا۔ اس کے آنے پر معاصر کشمیری حکمران Darlabha Vardhana نے بذاتِ خود اس کا گرمجوشی سے استقبال کیا تھا ہیون سانگ یہاں دو سال ٹھہرا تھا اور اس دوران اُس نے بیس پنڈتوں کی مدد سے شاستروں کا مطالعہ کیا تھا۔[1] اس نے یہاں کے اہلِ علم پنڈتوں کی غیر معمولی علمی صلاحیتوں کی بڑی تعریف کی ہے۔

جس طرح یہاں اسلامی علوم کی اشاعت مذہب کے طفیل ممکن ہو سکی اسی طرح ہندو دورِ حکومت میں سنسکرت علوم کی ترقی بھی مذہب ہی کے راستے سے انتہا کو پہنچی تھی۔ قدیم ترین زمانے میں جب ہندوستان میں سانپ پوجا کا عقیدہ عروج پر تھا تو کشمیر بھی اس کا اہم مرکز بن گیا تھا۔[2] جب بدھ مت کی اشاعت ہوئی تو ہندوستان ہی نہیں بلکہ تبت، چین اور کچھ دوسرے وسط ایشیائی سے تعلق رکھنے والے تشنگانِ علم کشمیر وارد ہوتے تھے۔ مہاراجہ اشوک اور کنشک کے زبردست اثر و رسوخ اور ذاتی دلچسپی سے کشمیر بدھ فکر اور فلسفہ کا غیر معمولی مرکز بن گیا تھا یہاں تک کہ کنشک نے تیسری عالمی بدھسٹ کانفرنس کشمیر ہی میں منعقد کی تھی، اور یہ اس پیمانے کا آخری ہی اجتماع تھا۔[3] اشوک

---

(۱): ملاحظہ ہو، ڈاکٹر ناگ ارجن کی مذکورہ بالا انگریزی تصنیف، ص ۷۷

(۲): Early History & Culture of Kashmir, S.C. Ray, P. 140

(۳): بدھسٹ کانفرنس سب سے پہلے گوتم بدھ کے انتقال کے فوراً بعد منعقد ہوئی تھی۔ اس کے بعد دوسری صدی عیسوی میں یہ کانفرنس کنشک نے کشمیر میں منعقد کی۔ پھر تقریباً اٹھارہ سو سال تک اس قسم کا وسیع پیمانے پر اجتماع منانے کا سراغ نہیں ملتا ہے۔ اب ماضی قریب میں برما کے سربراہ مملکت یو نو U Nu نے ۱۹۵۶ء میں گوتم بدھ کے یوم ولادت کے موقع پر یہ شاندار اجتماع منعقد کیا۔ The Asian Century: Jain Romein, P. 33

نے یہاں جگہ جگہ وِہار اور بدھ عبادت گاہیں تعمیر کیں، جن میں چار وِہار ایسے تھے جن میں مقدس آثار رکھے گئے تھے۔ اشوک اور کنشک کے علاوہ راجہ جلوک، راجہ ہسکا اور راجہ جگکا نے بدھ مت کی سرپرستی میں غیر معمولی دلچسپی لے لی۔ انہوں نے اس کی اشاعت د ترویج کے لئے شاندار وِہار تعمیر کئے تھے۔

کافی مدت کے بعد کشمیر میں بدھ مت مغلوب ہوا اور اب ہندو فکر و فلسفہ پھیلنے لگا۔ اور شیو، وشنو اور سوریا کی پرستش چار سو پھیل گئی، اسے بھی بعض حکمرانوں کی کھلی سرپرستی حاصل ہوئی۔ بالخصوص کرکوٹ خاندان کے جملہ حکمرانوں اور اتپال خاندان کے راجہ اونتی ورمن (۸۵۵ء تا ۸۸۳ء) نے ہندو دھرم کی متعصبانہ سرپرستی کی۔ آخر پر بدھ مت اور ہندو دھرم کے درمیان بڑے پیمانے پر فکری تصادم اور ٹکراؤ پیدا ہوا جس سے یہاں کے علماء میں ایک بڑا ذہنی انقلاب رونما ہوا۔ انہوں نے اپنی ذہانت و بصیرت سے ایک دوسرا الٰہیاتی فلسفہ مرتب کیا، یہ فلسفہ علمی اصطلاح میں شیوازم کہلاتا ہے۔ اس طرح انہوں نے ذہنی کمالات کی تاریخ میں ایک اور روشن باب کا اضافہ کیا۔ یہ فلسفہ بہت جلد اتنا مقبول ہوا کہ اس پر سینکڑوں کتابیں وجود میں آئیں اور اس میدان میں کشمیر میں کئی ایسے ممتاز ترین فاضل پیدا ہوئے جو اس دور میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ ان میں اُتپال (Utpala)، ابی نواگپت (Abhinawagupta)، کلات (Kalata)، واسوگپت (Vasugupta)، سوم آنند (Somananda) دنیا کے

ممتاز ترین عقلمندوں کی فہرست میں شامل کئے جانے کا حق رکھتے ہیں۔

فلسفہ اور الٰہیات کے دوش بدوش کشمیر میں سنسکرت شعر و ادب کی وسیع پیمانے پر ترقی ہوئی اور اس کے سلسلے میں یہاں کے شعراء نے کمیت و کیفیت بالخصوص مضامین کے تنوع میں نمایاں حصہ ادا کیا۔ بینرجی لکھتے ہیں کہ اگر شعرائے کشمیر نے شعر کے دوسرے اصناف کی جانب کوئی توجہ نہ بھی کی ہوتی پھر بھی انہوں نے دو صنفوں یعنی تاریخ اور فحش نگاری Pornography میں جو مقام و مرتبہ حاصل کیا وہی انہیں اور ان کے وطن کو زندہ رکھنے کے لئے کافی تھا[1] کلہن پنڈت کی مشہور تاریخ راج ترنگنی بھی منظوم سنسکرت ہی میں ہے۔

مسلمانوں کی طرف اقتدار کی منتقلی: تیرھویں صدی عیسوی میں کشمیر کے سرحدی علاقوں میں کچھ مسلمان آباد ہو چکے تھے۔ اسی طرح بعض سرکردہ کشمیری حکمرانوں کی دلچسپی سے ترک مسلمانوں کی کشمیر میں آمد و رفت رہتی تھی یہاں تک کہ سری نگر میں بھی کہیں کہیں مسلمان آباد ہونے لگے تھے، تاہم ان کا وجود نمک میں نمک کے برابر تھا۔ دوسری طرف کشمیر تیرھویں صدی عیسوی سے اپنی ساری خوبیاں تیزی سے کھو رہا تھا اور چودھویں صدی عیسوی کی ابتدائی دہائیوں میں صورت حال یہ تھی کہ حکمران لوٹ کھسوٹ اور اہل حکم، راشی و لٹیرے، تاجر بے رحم اور مذہبی طبقہ علم و فکر میں کھوکھلا ہو چکا تھا۔ یک لخت طوائف الملوکی عام اور طبقہ جاریت کا بول بالا تھا۔ مثلاً

---

[1] Cultural Heritage of Kashmir S.C. Banerjy P. 98 —

اثنا میں ایک منگول حملہ آور نے کشمیر پر دھاوا بول دیا اور یہاں چھ ماہ تک ایک قیامت برپا کی۔ کشمیر کا حکمران سہہ دیو بھاگ گیا اور بکھرا انتظامیہ اُس کے سپہ سالار راجچندر نے سنبھالنے کی کوشش کی۔ اُس وقت فوج اور انتظامیہ میں کچھ طالع آزما داخل ہو چکے تھے جن میں تبت کا ایک بدھ ریچن اور "سوداگر" کا ایک سرحدی مسلمان شاہ مراز بڑی ہوشیاری سے مناسب وقت کا انتظار کر رہے تھے ریچن نے تبت کے کچھ تاجروں کے ذریعہ راجچندر کو قتل کروایا اور اسی کے ساتھ کسی کی مزاحمت کے بغیر ملک کا اقتدار سنبھالا۔ راجچندر کی ایک غیرتمند بیٹی تھی اس کا نام کوٹہ رانی تھا، ریچن نے انتقام یا فساد سے محفوظ رہنے کے لئے اس کے ساتھ شادی کی۔

ریچن اگرچہ موروثی طور پر بدھ مت کا پیرو تھا مگر وہ کسی دوسرے مذہب کی تلاش میں تھا۔ اس زمانے میں کشمیر میں بیرونی ممالک کے صوفیاء سیاحت اور تبلیغ کے لئے کشمیر بھی وارد ہوتے تھے۔ ریچن نے انہی میں سے ایک بزرگ حضرت شرف الدین عبدالرحمٰن صاحب رح کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا اور صدرالدین کا اسلامی نام اختیار کیا، اسی کے ساتھ کشمیر میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہوئی صدرالدین (سابق ریچن) نے چار سال سے زائد مدت تک کشمیر پر حکومت کی۔ جب اس کا انتقال ہوا تو اس کی بیوی کوٹہ رانی نے تخت و تاج سنبھالنے کی کوشش کی۔ اسی اثنا میں راجہ سہہ دیو (جو ریچن سے قبل کشمیر کا حکمران تھا مگر منگول حملے کو دیکھتے ہی کشتواڑ کی طرف بھاگ گیا تھا) کا بھائی اودن دیو (جو اپنے بھائی

کی طرح پکھلی کی طرف فرار ہوا تھا) دارالحکومت وارد ہوا۔ کوٹہ رانی نے ہندو حکومت کی ڈوبتی کشتی کو سہارا دینے کے لیئے نہ صرف اسی کو تخت و تاج سونپا بلکہ اس کے ساتھ شادی بھی کی۔ مگر اچانک ایک پہاڑی قبیلے نے کشمیر پہ دہشت گردی اور لوٹ مار شروع کیا۔ ادون دیو کمال بزدلی سے تبت کی جانب بھاگ گیا۔ لاچار کوٹہ رانی نے اپنے فوجی افسر شاہ مرزا کو کچھ اہم اختیارات دے کر شورش کچلنے پر مامور کیا۔ شاہ مرزا نے کامیابی سے شورش کا خاتمہ کیا مگر ساتھ ہی اپنے حق میں حکومت اور سیادت کا بھی اعلان کیا اور سلطان شمس الدین لقب اختیار کیا۔ وہ کوٹہ رانی کی جانب سے مزاحمت سے اچھی طرح آگاہ تھا۔ چنانچہ اس سے محفوظ رہنے کے لئے اس نے کوٹہ رانی کو شادی کا پیغام بھیجا، چونکہ کوٹہ رانی کے لئے یہ ایک جبری پیغام تھا اس لئے اس نے اس سے بچنے کے لئے خودکشی کی۔ اس طرح سلطان شمس الدین شاہ مرزا اپنے سب سے بڑے سیاسی حریف سے چھٹکارا پانے میں کامیاب ہوا۔ اگرچہ خود شمس الدین کو صرف تین سال حکومت کرنے کا موقعہ ملا مگر یہ حکومت اس کی اولاد میں تقریباً اڑھائی سو سال تک قائم رہی۔ یہ حکومت کشمیر کی تاریخ میں شاہمیری دورِ حکومت کہلاتی ہے۔ اس خاندان نے کئی بلند پایہ سلاطین پیدا کئے۔ بالخصوص شہاب الدین، قطب الدین، سکندر اور زین العابدین اپنی جلالت و شجاعت اور جہانداری و جہانبانی میں ایشیا کے عظیم حکمرانوں میں شامل کئے جا سکتے ہیں۔

حضرت میر سید علی ہمدانیؒ کا ثقافتی انقلاب

کشمیر میں اسلام کی منظم اشاعت کی طرف سب سے پہلے امیر کبیر حضرت میر سید علی بن الشہاب الہمدانی رحمۃ اللہ علیہ نے توجہ فرمائی۔ اگرچہ اُن سے قبل بھی دوسرے صوفی مبلغوں، مسلمان تاجروں اور سیاحوں نے کشمیر میں بہت پہلے اسلام متعارف کرایا تھا تاہم اسلام کی باضابطہ تبلیغ اور چپے چپے میں اس کی اشاعت کی ذمہ داری حضرت امیرؒ نے ہی قبول کی تھی۔ اُن کے ورود کشمیر کے زمانے میں جو مسلمان کشمیر میں موجود تھے وہ اسلامی معاشرت اور اسلامی فکر سے ناآشنا تھے۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ یہاں کی سرزمین بدھ مت اور ہندو دھرم کا گہوارہ تھی۔ اس ماحول میں اسلامی علوم و فنون کا نام لینا بھی مشکل تھا۔ یہاں جو صوفیائے مبلغین وارد ہوتے تھے اُن کی تبلیغی کاوش خالص خاموش دعوت و تربیت اور درویشانہ زندگی گزارنے تک محدود تھی بلکہ صوفیائے اسلام کی ایک جماعت یہاں مصلحتاً اور ماحول سے مجبور ہو کر خود بھی نیم ہندوانہ زندگی گزارتی تھی۔ یہی بزرگ بعد میں ریشیانِ کشمیر سے مشہور ہوئے۔ یہ صرف حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانیؒ کی خداداد بصیرت کا نتیجہ تھا جنہوں نے پہلے یہاں کے حالات کا مطالعہ کیا اور پھر غور و فکر کے بعد اسلامی انقلاب یقینی بنانے کے لئے انقلابی قدم اُٹھائے۔ انہوں نے نہ صرف یہاں کے باشندوں کو اسلام کی جانب کامیاب دعوت دی بلکہ ساتھ ساتھ یہاں کی ثقافت و معاشرت کا رُخ موڑنے کا بھی سامان کیا۔ انہوں نے اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے وسط ایشائی ممالک سے سینکڑوں علماء اور صوفیاء کو اپنے ساتھ لایا اور انہیں کشمیر

کے چپے چپے میں پھیلا کر اپنے مدعا کو کامیابی سے ہمکنار کیا۔ صاحبزادہ حسن شاہ درست لکھتے ہیں:

ویقوم التاریخ شاهداً علی انّ وصول الحضارة العجمیّة فی کشمیر وازدهار الفنون والآداب فی هذه الرّبوع یرجع فضله الی حضرة السیّد۔[1]

تاریخ اس پر گواہ ہے کہ کشمیر میں عجمی تمدّن کے ورود اور فنون و آداب کی رونق صرف حضرت میر سید علی ہمدانی رحمتہ اللہ علیہ کی کوششوں کا برکت ہے۔

ایرانی محقق، ڈاکٹر احسان اللہ رقمطراز ہیں:

شاہ ہمدان و ہمراہان علاوہ بر آنکہ کشمیریان را بہ اسلام رہبری کردند ہنر و صنعت و زبانِ شیرین و نظمِ نمکین پارسی را ہم با خود بارمغان بردند و بہ مردم کشمیر دادند از این روی است کہ اہالی خطۂ کشمیر ہمہ مظاہر حیات و مبانی سعادتِ خود را از حضرت شاہ ہمدان و برکات

شاہ ہمدان" اور ان کے رفقاء نے، علاوہ اس کے کہ اہلِ کشمیر کو اسلام کی طرف راہنمائی کی، صنعت و حرفت، فنِ پارسی اور عمدہ و شیرین شاعری اپنے ساتھ لے کر اہلِ کشمیر کو بطور ارمغان بخش دی۔ اسی وجہ سے کشمیر کے لوگ اپنے مظاہرِ حیات اور سعادت و سرخروئی جو انہیں نصیب

---

[1] مقالہ "الارتقاء الثقافی بکشمیر فی عهد السلاطین" شائع شدہ مجلہ ثقافة الهند (دہلی ۱۹۶۵ء) بابت جولائی، ص ۲۲۔

(فتوحاتِ دے می دانند)¹ ہوئی۔ اسے صرف میر سید علی ہمدانیؒ کے فیوض و برکات سمجھتے ہیں۔

اہلِ کشمیر کا اعتراف: کشمیر کے لوگوں بالخصوص مسلمانوں نے حضرت امیرؒ کے احسانات کبھی نہ بھلائے۔ ہر دَور کے علماء نے انہیں خراجِ عقیدت ادا کیا۔ گو عام لوگ تو مبالغہ آمیز حد تک ان کی شان میں اپنی عقیدت کا اظہار کرتے ہیں مگر اکابر علمائے کشمیر نے اس قسم کے عقیدتمندانہ اشعار نظم کرنے میں کوئی تردّد محسوس نہیں کیا۔ حضرت شیخ یعقوب صرفیؒ جیسے محدّث و مفسّر اور روحانی پیشوا اِن کی شان میں فرماتے ہیں:

گرچہ دو صد راہ سوئے مطلبست | راہِ امام ہمدان اقرب است
وہ چہ نکو راہی و خوش رہبری | رہبرِ ما در رہِ دیں حیدری
ہمچو علی دانشِ ربّانیش | زاں لقب آمد علیؒ ثانیش
سلسلۂ او کہ در آئینِ عشق | آمدہ زنجیرِ مجانینِ عشق
بستہ ایں سلسلہ آبای من | چوں دلِ دیوانہ و شیدای من
صرفیِ مسکین کہ ہوا خواہِ اوست | از دل و جاں بندۂ درگاہِ اوست

(ترجمہ): "اگرچہ حقیقی مقصد تک پہنچنے کے لئے بےشمار راہیں سالک کے سامنے موجود ہیں، مگر اُن میں امام ہمدان (حضرت امیر کبیرؒ) کا دکھایا ہوا راستہ ہی سب سے نزدیک ہے۔ کیا ہی اچھا راستہ اور کتنا ہی اچھا راہنما ہے! وہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے راستے کے رہبر ہیں۔ وہ ربّانی علم و دانش میں حضرت علی رضی کے مانند ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کا لقب

---

¹: اصولِ تصوّف، ڈاکٹر احسان الحق، مطبوعہ تہران، ص ۲۹۵۔

بھی علی ثانی پڑ گیا۔ عشق کے آئین میں عاشقوں کے لئے اُن کا سلسلۂ زنجیر کی حیثیت رکھتا ہے۔ میرے اسلاف اسی سلسلے سے وابستہ ہو گئے ہیں اس لئے میرا دیوانہ اور مستانہ دل بھی اسی سے جڑا ہوا ہے۔ مسکین مرزا بھی اس پیر رہبر کا عاشق ہے اور دل و جان سے اُن کی درگاہ کا غلام ہے۔"

ایک اور بزرگ مرزا اکمل الدین خاں بدخشی "اہلِ کشمیر پر حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانی رح کے احسانات کا اعتراف کرتے ہوئے اُن کے ساتھ اپنی وابستگی کو اپنی سب سے قیمتی پونجی قرار دیتے ہیں:

ایں علی غوث اہلِ دیں بودست	ہم بہر غوث جانشیں بودست
قطب الاقطاب مرشد و ہادی	دستگیری ہمہ بہر وادی
غوث ہر مستغاث در عالم	روحِ پاکش بنورِ حق محرم
اہلِ کشمیر را پناہ است او	رہبر خلق تا اِلٰہ است او
شکر للہ کہ از مریدانم	غیر از و دیگرے نمی دانم
ہر چہ در من ہمہ از ایشان است	وقف عشقش مرا دل و جان است
اندراں آستان غلام منست	مدح خوانش بصبح و شام منست
غیر ازیں شاہ کس نمی دانم	ذکر یا شاہ ہر زماں خوانم

(ترجمہ): "(حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانی رح) مسلمانوں کے فریاد رس ہیں۔ وہ ہر بلند سے بلند "غوث" کے جانشین تھے۔ وہ قطب الاقطاب، مرشد، راہنما اور ہر موڑ پر سالک کی دستگیری کرنے والے تھے۔ وہ ہر فریاد کرنے والے کے لئے

دنیا میں فریاد رسی کرنے والے تھے کیونکہ اُن کی روح نورِ حق سے آشنا اور روشن تھی۔ وہ کشمیر کے مسلمانوں کی پناہ ہیں اور خدا طلبی کی راہ میں انسانوں کی راہنمائی کرنے والے ہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ میں اُن کے مُریدوں میں سے ہوں، میں اُن کے بغیر کسی اور کو نہیں جانتا ہوں۔ جو کچھ بھی مجھ میں ہے وہ انہی کی برکت سے مجھے حاصل ہوا ہے۔ اس لیے میں دل و جان سے اُن پر فدا ہوں۔ میں انہی کی امیرگاہ کا غلام ہوں۔ اور صبح و شام ان کی محبت کے گیت گاتا ہوں اس سلطانِ عشق و ولایت کے سوا میں کسی دوسرے کو نہیں جانتا ہوں اور ہر وقت اُن کے نام کی یاد تازہ کرتا ہوں"۔

عصرِ حاضر کے علماء اور مفکرین میں علامہ محمد انور شاہ صاحب کشمیری (محدث) اور ڈاکٹر محمد اقبال کا حوالہ کافی ہے۔ اوّل الذکر فاضل انہیں "الھمدانی الکشمیریؒ"[1] سے یاد کرتے ہیں اور ڈاکٹر صاحب ان الفاظ میں ان کے احسانات کا اعتراف کرتے ہیں:

آفرید آں مرد ایرانِ صغیر — با ہنرہائے غریب و دلپذیر
خطہ را آں شاہِ دریا آستیں — داد علم و صنعت و تہذیب و دیں[2]

کشمیر میں امیر سید علی ہمدانیؒ کے علمی و ثقافتی انقلاب لانے کا سلسلہ سلطان قطب الدین (عہدِ حکومت ۱۳۷۳ء تا ۱۳۸۹ء) کے عہدِ حکومت میں شروع ہوا۔ جب حضرت شیخ ہمدانیؒ کی ملاقات

---

[1] عقیدۃ الاسلام فی حیٰوۃ عیسیٰ علیہ السلام، مطبوعہ دیوبند، ص ۲۱۸
[2] جاوید نامہ۔

سلطان سے ہوئی تو انہوں نے دیکھا کہ سلطان مسلمان ہونے کے باوجود اسلامی آداب و شعائر سے یکسر ناواقف تھا۔ اس کا لباس مہذبانہ نہ تھا اور اس سے زیادہ سخت یہ کہ نکاح میں ایک ساتھ دو سگی بہنیں رکھی تھیں۔ حضرت شیخؒ نے انہیں اُن میں سے ایک کو فوراً طلاق دینے کی ہدایت کی، چونکہ وہ دل و جان سے حضرت شیخؒ کا عقیدت مند ہو چکا تھا اس لئے فوراً اس ہدایت پر عمل کیا۔ تقریباً یہی حالت قطب الدین سے قبل چار حکمرانوں کی بھی تھی۔ شیخ عبدالوہابؒ لکھتے ہیں:

> سلاطینِ کشمیر اگرچہ نام اسلام داشتند لیکن اکثر رسومات کفریہ فعل می آوردند۔ [1]
>
> کشمیر کے حکمران اگرچہ اسلامی نام رکھتے تھے لیکن اکثر رسومات کفر پر عمل کرتے تھے۔

حضرت شیخؒ نے تبلیغِ اسلام کے ساتھ ساتھ عربی دینی و فکری علوم اور اسلامی ثقافت کی اشاعت کی طرف ممکن بھر توجہ کی۔ اوّل تو انہوں نے جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے۔۔۔ اپنے ساتھ سینکڑوں رفقاء، جن میں دس پندرہ (۱۵) بزرگ اُن کے قریبی اقارب و اعزہ تھے، وسطِ ایشیا سے بلا بلا اپنے ہمراہ لاکر انہیں کشمیر میں مستقل سکونت اختیار کروا کر اسلام کی تبلیغ و تعلیم پر مامور کیا اور دوسری طرف مختلف موضوعات پر بہت سی چھوٹی بڑی کتابیں [2] عربی اور فارسی میں لکھ کر اپنے رفقاء کے ذریعے پھیلائیں

---

[1]: منتخباتِ کبرویہ (قلمی) ریسرچ ڈیپارٹمنٹ سرینگر
[2]: مورخ حسن کے مطابق حضرت امیر کبیرؒ کی تصانیف کی تعداد ایک سو اسی (۱۸۰) ہے۔ (تاریخ حسن، ج ۲) جبکہ شیخ عبدالوہاب نوریؒ لکھتے ہیں، "مصنفات آنحضرت یکصد و پنجاہ است" [illegible]

تحریری سطح سے محدود فائدے اور اسکے اسباب

اگر تاریخ کشمیر کا بغائر مطالعہ کرنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امیر کبیرؒ اور ان کے صاحب قلم رفقاءؒ کی کتابوں میں پہلے پہلے لوگوں نے زیادہ دلچسپی ظاہر نہیں کی۔ گو حضرت امیرؒ نے لوگوں کی تسخیر میں معجزانہ کامیابی ضرور حاصل کی مگر اسلامی علوم کی ترویج میں زیادہ سرعت واقع نہیں ہوئی۔ حضرت

(بقیہ حاشیہ ص ۷۹) (فتحات کبرویہ، قلمی) یعنی حضرت شیخؒ کی تصانیف کی تعداد ایک سو ستر ہے۔ وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ ان میں سے پچاس کتابیں میری نظر سے گزری ہیں "پنجاہ از نظر ایں فقیر آمدہ" (فتحات کبرویہ) ڈاکٹر سیدہ اشرف ظفر نے حضرت امیرؒ کی کتابوں کا سراغ لگانے میں بڑی کوشش کی ہے۔ انکی تحقیق کے مطابق "حضرت امیرؒ" کے مجمل اور مفصل کتب و رسائل کی تعداد ۸۳ کے قریب ہے، جن میں ۶۳ فارسی اور ۲۰ عربی میں لکھی گئی ہیں" زیر نظر کتاب کی مناسبت سے ہم یہاں انکے کچھ عربی رسائل کے نام درج کرتے ہیں:

(۱) شرح اسماء الحسنیٰ (۹۰ اوراق)۔ (۲) المودۃ فی القربیٰ (۸ اوراق) (۳) القدسیہ فی اسرار النقط (مطبوعہ شیراز) (۴) السبعین (۵) روضۃ الفردوس (یہ رسالہ فردوس الدیلمی کی کتاب الفردوس سے ماخوذ ہے) (۶) منازل السالکین (۲ ورق) (۷) اربعین امیریہ (یہ ان کی ترتیب دی ہوئی مشہور چہل حدیث ہے) (۸) رسالۃ التوبۃ (۲ ورق) (۹) الرسالۃ الخواطریۃ (یہ رسالہ شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کی فتوحات مکیہ اور شیخ نجم الدین کبریٰ کی فوائح الجمال سے ماخوذ ہے) (۱۰) الاورادیتہ (۱۱) فضل الفقر (۱۲) الانسان الکامل۔ (۱۳) الناسخ والمنسوخ فی القرآن (۱۴) الخطبۃ الامیریۃ

تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: امیر کبیر سید علی ہمدانیؒ"؛ ندوۃ المصنفین سمن آباد لاہور ۱۹۷۲ء، اور الأعلام: علامہ خیر الدین الزرکلی ج ۵، ص ۱۵۱

امیر کبیرؒ کو خود بھی اس کا احساس تھا۔ چنانچہ شیخ عبدالوہاب نے لکھا ہے:

دقتی فرمودند کہ مرا درین زمان کسے نہ شناخت۔ اما بعد از وفات من بصد سال طالبان پیدا شوند و قدر من شناسند و از کتب و رسائل من فوائد گرفتہ بہرہ کمال یابند و از وجود موہوم منخلع شدہ بوجود حق متجلی گردند۔[۱]

ایک بار حضرت امیرؒ نے فرمایا کہ مجھے اس زمانے میں کسی نے نہیں پہچانا۔ لیکن میری وفات کے ایک سو سال بعد علم کے ایسے طالب و جویا پیدا ہونگے جو میری قدر و قیمت پہچانیں گے میرے کتب و رسائل سے فائدہ اٹھا کر کمال حاصل کریں گے اس طرح خیالی وجود کو چھوڑ کر کامل وجود سے روشن ہونگے۔

عربی و دینی علوم کی طرف اس بے توجہی اور اسلامی ثقافت کے پھیلنے میں سست رفتاری کے درج ذیل کچھ اہم وجوہ تھے۔

اوّلاً: کشمیر کے لوگ ہزار ہا سال سے بدھ مت اور ہندو دھرم کے پیرو چلے آئے تھے۔ اب جبکہ وہ حضرت امیر کبیرؒ کی مساعی سے ایک نئے مذہب اور نئی تہذیب میں داخل ہو رہے تھے تو صدق دلی سے اسلام قبول کرنے کے باوجود سابقی رسوم اور قدیم ثقافت سے ان کا انقطاع آہستہ آہستہ عمل میں آیا۔

ثانیاً: کشمیر دوسرے اسلامی ممالک سے اپنی خاص جغرافیائی ہیئت کی بنا پر الگ تھلگ تھا۔ ذرائع آمد و رفت مشکل اور محدود

---

(۱): فتوحات کبرویہ (قلمی)

تھے۔ پھر یہاں کی ہندو تہذیب، جس کے جڑ انتہائی گہرے تھے اسلامی ثقافت سے کوئی میل نہیں کھاتی تھی۔ حضرت امیرؒ کے لئے یہ اصلاح کا مسئلہ نہیں تھا بلکہ مکمل تخریب پر تعمیر کا مسئلہ تھا۔

ثالثاً: اہلِ کشمیر کی زبان سنسکرت تھی اسی میں تصنیف و تالیف کا کام بھی ہوتا تھا۔ اس زبان کو عربی کے ساتھ دور کا واسطہ بھی نہیں تھا۔ اس طرح یہاں تصنیف و تالیف کے قدردان تقریباً مفقود تھے۔

رابعاً: وسطِ ایشیاء سے جو اہلِ علم کشمیر تشریف لائے اور جنہیں یہاں حضرت امیر ہمدانیؒ نے تبلیغ و تعلیم پر مامور کیا انہوں نے اس مشن کو صرف تدریس تک ہی محدود رکھا۔ وہ جہاں ٹھہرے درس اور تربیت کی مجالس قائم کی۔ اس وقت کے طلباء کتابیں لکھنے سے ناواقف تھے اور نو مسلم کشمیریوں کے لئے ان کا فائدہ نہ ہونے کے برابر تھا۔

سلطان قطب الدین کے عہد کے ممتاز مدارس اور درس گاہیں۔

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا کہ حضرت امیر کبیرؒ سلطان قطب الدین ہی کے عہدِ حکومت میں اپنے رفقاء کی ایک بڑی جماعت کے ساتھ کشمیر تشریف لائے۔ یہ جماعت کم و بیش سات سو بزرگوں پر مشتمل تھی۔ یوں تو یہ سارے بزرگ علم و فضل اور زہد و تقویٰ سے آراستہ تھے تاہم ان میں کچھ بزرگوں نے درس و تدریس اور تعلیم و تربیت کے میدان میں بڑی عزت اور شہرت حاصل کی، جس طرح ان میں سے بعض اکابر اسلامی فنون و تعمیرات کو عام کرنے میں مشہور ہوئے۔

حضرت شیخ جمال الدین بخاریؒ بلند پایہ محدث اور مفسر تھے۔ یہ حضرت امیر کبیرؒ کے خال بھی تھے۔ انہیں حضرت امیر کبیرؒ نے بڑے اصرار کے بعد کشمیر بلا لایا۔ انہوں نے یہاں ایک درسگاہ قائم کی جس کا حال آگے آتا ہے۔ حضرت امیرؒ ہی کے رفقاء میں سید احمد اور سید محمد کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ لیکر یہاں وارد ہو رہے تھے مگر راستے میں ڈاکوؤں نے کتابوں کی بوریوں کو قیمتی مال و متاع سمجھ کر چرایا۔ ایک اور عالم سید محمد کاظم تھے، انہیں حضرت امیر کبیرؒ نے اپنے کتب خانے کا خازن (لائبریرین) مقرر کیا تھا۔ سید رکن الدین اور سید فخر الدین آداب دین اور قوانین شریعت کی تعلیم و تدریس میں ممتاز ہوئے۔ شیخ نور الدین بدخشیؒ، شیخ قوام الدین بدخشی اور محمد الشامی عربی دینی علوم کے ماہر اساتذہ اور مصنف تھے۔

یوں تو یہ سارے بزرگ مدرس اور ان کی اقامت گاہیں مدارس تھے۔ تاہم اس دور میں تین مدرسے خاص طور پر مشہور ہوئے اور مدت دراز تک طلباء ان سے فیض حاصل کرتے رہے۔

مدرسۂ سلطان قطب الدین | سلطان قطب الدینؒ نے اپنے بسائے ہوئے شہر قطب الدین پورہ (متصل موجودہ فتحکدل سرینگر) میں اپنی نگرانی میں ایک مدرسہ تعمیر کرایا۔ اس کے ساتھ ایک دارالاقامہ بھی ملحق کیا جس میں دور دراز کے طلباء اقامت کرتے تھے۔ ان کے لئے حکومت ہی کی جانب سے طعام و قیام اور مصارف تعلیم کا مفت انتظام تھا طلباء سے کوئی فیس وغیرہ نہیں لی جاتی تھی۔[1] اس مدرسہ کے پہلے صدر

[1] Kashir: A History of Kashmir; Dr. M.D. Sufi; Vol. 2 – P.346

مدرس حاجی محمد قاری تھے ۔ چکوں کے آخری دورِ حکومت میں اس منصب
جلیل پر مولانا رضی الدین کشمیری فائز تھے جن کے علم و فضل کا بیّن ثبوت
یہ ہے کہ علامہ داؤد خاکیؒ جیسے فقیہہ اور صوفی، اور مولانا شمس الدین
پال جیسے محدث ان کے شاگرد تھے۔ جہانگیر کے عہدِ حکومت میں اس
منصب پر مولانا جوہرنات کشمیری فائز ہوئے وہ حافظ ابن حجر ہیتمی
مکی کے شاگرد تھے اور کشمیر میں محدث جلیل کی حیثیت سے مشہور و
محترم تھے۔ اس علمی ادارے کے دوسرے ممتاز اساتذہ میں مُلّا محسن
فانی (اُستادِ شیخ طاہر غنی کشمیری) اور حاجی شیخ گنائی وغیرہ کے نام
قابلِ ذکر ہیں۔ فارغ التحصیل طلباء میں علامہ شیخ داؤد خاکی، مُلّا
طاہر غنی اشائی، محمد زماں انتعی، خواجہ قاسم ترمذی اور مولانا محمد
کاؤس کے نام سرِفہرست ہیں۔ یہ دارالعلوم صدیوں تک اہلِ کشمیر
کو علمی و دینی **فیضان** پہنچاتا رہا، یہاں تک سکھ کشمیر پر قابض ہوئے۔
انہوں نے اس کی آمدنی کے سارے ذرائع بند کرکے مدرسے کو مقفّل کیا
اگر یہ ادارہ ظالم و جاہل حکمرانوں کے تعصّب کا شکار نہ ہوا ہوتا
تو یہ آج دنیا کی قدیم ترین تاریخی یونیورسٹیوں میں شامل ہوتا۔ جیسا
کہ ہم آگے تفصیل سے بیان کریں گے اس چشمۂ صافی پر سکندر اور
زین العابدین کے دورِ حکومت میں عراق و خراسان کے تشنگانِ علم
جوق در جوق وارد ہو کر فیوض و فوائد حاصل کرتے تھے۔

مدرسۃ القرآن | سلطان قطب الدین ہی نے قرآنِ حکیم کی تعلیم
حاصل کرنے کے لئے حضرت امیرؒ کی ہدایت پر ایک مدرسہ تعمیر کرایا
اس مدرسے نے وسیع پیمانے پر قرآنِ حکیم کی تعلیم کشمیر میں علم کی،

حضرت امیرؒ کے ساتھ جو حضرات تجوید و قرأت کے ماہر تھے۔ انہوں نے یہاں کمالِ حزم و حذاقت سے قرآنِ حکیم کی تعلیم و تدریس شروع کی ان کے سربراہ ابو المشائخ شیخ سلیمان مقرّر ہوئے جنہیں حکومت کی جانب سے امام القرّاءؒ کا خطاب ملا تھا۔ [1]

مدرسۂ عروۃ الوثقیٰ | قطب شاہی دور کے مدارس میں حضرت شیخ جمال الدین محدّثؒ کی درسگاہ نے بھی بڑی شہرت اور مرجعیّت حاصل کی۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا حضرت شیخ متبحّر عالم تھے۔ علاوہ ازیں وہ حضرت امیرؒ کے قرابتدار بھی تھے اور حضرت امیرؒ نے انہیں ذاتی توجہ اور کوشش سے کشمیر لایا۔ مؤرخ سیّد علی ان کے علم و فضل اور اثر و رسوخ کے بارے میں رقمطراز ہے:

سید جمال الدین کہ عزیزی محدّث و مفسّر بود در علومِ دینی و در علم منطق و ہیئت کمال داشتہ...... سلطان قطب الدین بصد تفاخر او خدمت امیر کبیرؒ او را طلب داشتہ در ایں دیار گرفتہ اکثری از ساکنانِ ایں ممالک را مستفید شدند۔ [2]	سیّد جمال الدین بڑے پائے کے محدّث و مفسّر تھے۔ وہ دینی اور عقلی علوم میں کمال رکھتے تھے۔ سلطان قطب الدین نے انہیں حضرت امیرؒ کے حلقے سے بصد فخر طلب کر کے کشمیر میں ٹھہرایا۔ ان علاقوں کے اکثر رہنے والوں نے ان سے فائدہ حاصل کیا ہے۔

---

[1]: ڈاکٹر صوفی، ج ۲-

[2]: تاریخ سیّد علی (قلمی)-

کشمیر میں اُن کا مدرسہ "عُروۃ الوثقیٰ" کے نام سے مشہور تھا۔ گردشِ زمانہ کے ساتھ ساتھ یہ نام بگڑ کر "آروٹھ" بن گیا۔ اُن کا مدفن دریائے جہلم کے کنارے واقع ہے اور تین طرف سے گنجان آبادی میں گھرا ہوا ہے۔ مدرسے کا نام و نشان تک باقی نہیں ہے۔

سلطان سکندر اور عربی علوم اور اسلامی ثقافت کی اشاعت

سلطان قطب الدین نے سولہ[16] سال اور پانچ ماہ تک حکومت کی اس نے ۱۳۸۹ھ میں انتقال کیا اس وقت دس سال قبل حضرت امیرؒ دنیا سے رخصت ہو چکے تھے اور (موجودہ) کولاب میں آسودہ تھے۔ تاہم انہوں نے اپنے فرزند حضرت میر سید محمد ہمدانیؒ (جن کی عمر اپنے والدِ بزرگوار کے انتقال کے وقت صرف بارہ[12] سال کی تھی) کے لئے اپنے خاص مریدِ مخلص مولانا نورالدین جعفر بدخشی کے پاس تحریری وصیت نامہ رکھا تھا جس میں اپنا مقدس مشن جاری رکھنے اور آگے بڑھانے کی تاکید کی تھی۔ پھر بھی حضرت میر محمد ہمدانیؒ اس وقت کشمیر تشریف لائے، جب ان کے والد کے انتقال پر دس سال کی مدت گزر چکی تھی۔ اور وہ بائیس[22] سال کے باحوصلہ نوجوان ہو چکے تھے۔ اس وقت کشمیر کے تختِ سلطنت پر سلطان قطب الدین کا بیٹا سکندر بیٹھا تھا وہ اس وقت بہت نوجوان تھا۔ حضرت میر محمد ہمدانیؒ سے سلطان سکندر کی ملاقات اس کی زندگی کے لئے ایک اہم موڑ ثابت ہوئی، جس سے کشمیر کی سیاست اور ثقافت پر گہرے اثرات مرتب ہوئے اس کے نتیجے میں اس کی مذہبی شخصیت اور سیاست میں بعض مؤرخ شعوری اور بعض غیر شعوری طور پر غلط بیانی کے شکار ہوئے

حتیٰ کہ عصرِ حاضر کے بعض سرکردہ مؤرخ اس کے صحیح نام سے بھی ناواقف نظر آتے ہیں۔[1] یہاں تک کہ عبدالمجید صاحب سالک نے سلطان سکندر کشمیری کو مشہور سکندر لودھی سمجھتے ہیں۔[2]

حضرت سید میر محمد ہمدانی اکیلے ہی تنہا کشمیر وارد نہیں ہوئے بلکہ اُن کے ساتھ مختلف اسلامی ممالک سے تعلق رکھنے والے کم وبیش تین سو اکابر تھے۔ حضرت میر محمد ہمدانیؒ ان بزرگوں میں انفرادی شخصیت و وجاہت کے مالک تھے۔ کشمیر کا اس دور کا ہندو مؤرخ شری جون راج جس نے اپنی تاریخ میں حضرت میر سید علی ہمدانیؒ کا نام لینا بھی گوارا نہیں کیا، حضرت میر سید محمد ہمدانیؒ کے بارے میں لکھتا ہے: کہ "محمدؒ اپنے ساتھیوں میں ویسا ہی ہے جیسے تاروں میں چاند۔ سلطان قطب الدین، حضرت امیر کبیرؒ کا معتقد تھا اب اس کا حکمران بیٹا سلطان سکندر، حضرت امیرؒ کے فرزند حضرت میر محمد ہمدانیؒ کا دل وجان سے عقیدتمند ہوا، وہ اُن کے چشم و ابرو کا منتظر رہتا تھا۔ انہی کے ایما پر سلطان سکندر نے اصلاح و تجدید اور اسلامی فکر و ثقافت کی ترویج و اشاعت میں کھل کر دلچسپی لی۔ تربیتی اداروں اور خانقاہوں نیز مقابر کی تعمیر و توسیع عمل میں آئی۔ ان تبدیلیوں کو ہندو سوسائٹی کے اونچے طبقے نے اچھا نہیں مانا اور یہ کہتے ہوئے اپنی ناراضگی کا اظہار کیا کہ ملیچھوں نے اس

---

[1]: جیسے مولانا ذکاء اللہ صاحب تاریخ ہند میں یا مولانا معید ماہروی "امرائے ہنود" میں (مطبوعہ انجمن ترقی اردو علیگڑھ ۱۹۱۰ء، ص ۲۲)۔

[2]: "مسلم ثقافت ہندوستان میں"، ادارۂ ثقافتِ پاکستان، باب "کشمیر"

پوتر دھرتی کو ناپاک کیا۔ ان کا نزلہ سب سے پہلے سلطان سکندر اور اس کے نو مسلم وزیر اعظم ملک صدر الدین (سابق سہ بھٹ) پر گر گیا۔ انہوں نے ان پر مندر شکنی اور جبر و اکراہ کے الزامات عائد کئے مؤرخوں کو مدتِ دراز تک ان الزامات پر یقین رہا۔ خدا کا شکر ہے کہ عصرِ حاضر کے سرکردہ مؤرخوں نے تاریخی واقعات و حقائق کی روشنی میں ان کا بے بنیاد یا کم از کم مبالغہ آمیز ہونا ثابت کیا۔[1]

سکندر یقیناً پہلا کشمیری مسلمان تھا جس نے کشمیر میں اسلامی شریعت عملاً نافذ کرنے میں دلچسپی لی۔ اس نے مسلمانوں میں غیر اسلامی رسوم اور خلافِ شریعت حرکات پر پابندی لگائی۔ ان میں رنگ رلیوں کا خاتمہ کرنا شامل ہے۔ غیر مسلموں پر ذمیوں کی حیثیت سے ٹیکس عائد کیا۔ رفاہ عامہ کے لئے جس قدر ہو سکا مختلف تعمیری کام انجام دیئے ان میں ہسپتالوں کا قیام شامل ہے جہاں بیماروں کو ادویہ کے علاوہ مفت خوراک میسر تھی۔

شیخ الاسلام کے منصب کا قیام | سلطان سکندر نے شیخ الاسلامی کا ایک مستقل ادارہ قائم کیا۔ مولانا محمد افضل بخاری پہلے بزرگ اور عالم تھے جو اس منصب پر فائز ہوئے۔ سلطان اہم ملکی اور دینی معاملات

---

(۱) اس کے لئے ڈاکٹر محی الدین صوفی کی A History of Kashmir جلد دوم، پروفیسر محب الحسن صاحب کی Kashmir Under the Sultans اور ڈاکٹر پارزو کی A History of Muslim Rule in Kashmir، نیز راقم کی "کشمیر میں اسلام کی اشاعت" دیکھی جا سکتی ہے۔

میں اُن کی طرف رجوع کرتا تھا۔ وہ بخارا سے تعلق رکھنے والے عالم تھے۔ انہوں نے نوشہرہ (سرینگر) کے متصل اپنا ایک دینی مدرسہ بھی قائم کیا تھا، جس کا ذکر آگے آتا ہے۔ ملک حیدر چاڈورہ نے اس ادارے کے قیام کا سہرا سلطان زین العابدین کے سر باندھا ہے۔

منصب شیخ الاسلامی کہ تا	سلطان نے شیخ الاسلام کا منصب
آن وقت دریں دیار شائع	جو اُس وقت تک یہاں موجود
نبود براو تفویض نمود۔[۱]	نہیں تھا ان کو (ملا کبیر) تفویض کیا۔

مگر صاحب تحائف الابرار نے لکھا ہے۔

مولانا افضل بر عہدۂ شیخ	مولانا افضل شیخ الاسلام کے
الاسلامی نمود و بنائے مدرسہ	منصب پر بیٹھے اور ایک
کردہ۔[۲]	مدرسہ بنایا۔

علماء کی سرپرستی | سلطان سکندر علماء کی سرپرستی اور تعلیم کی اشاعت میں اس قدر دریا دل تھا کہ پورے مُلک کی قلب ماہیت ہوگئی۔ کشمیر وارد ہونے والے بیرونی ممالک کے علماء کو تقرب سلطانی کا سب سے آسان ذریعہ کوئی علمی کتاب لکھ کر سلطان کی خدمت میں پیش کرنا تھا۔ اس کے بعد سلطان سکندر اُن کی عزت افزائی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرتا تھا۔ شیخ احمد سامانی خراسان سے کشمیر وارد ہوئے۔ انہوں نے فرائض کی مشہور کتاب سراجی کی عربی میں فاضلانہ شرح لکھ کر سلطان کی

---

[۱]: تاریخ کشمیر، ملک حیدر (قلمی) نسخہ ریسرچ لائبریری سرینگر رقم ۳۹/ صفحہ ۷۴۔

[۲]: تحائف الابرار (قلمی)۔

خدمت میں پیش کی اور سلطان نے انہیں بڑی عزت کی۔ خوش قسمتی سے اس شرح، جس کا نام تنویر السراج ہے، کے نسخے آج بھی موجود ہیں۔ اس کی تمہید ہی میں شیخ احمد سامانی نے اپنی روئداد سنائی ہے وہ لکھتے ہیں:

وقد کان یختلج فی صدری
وخلدی تقبیل العتبة
الرفیعة والسدة السنیة
التی ھی مقصد ارباب
الحاجات معھد اصحاب
المراتب والدرجات
فمن اجل ذلک حل بروضة
ونال لاسباب الشھوات
سُلّماً وھو مولی المعظم
والشاہ الاعظم مالک
رقاب الامم جلال
الدنیا والدین غیاث
الاسلام والمسلمین،
سلطان سکندر شاہ
ابن سلطان قطب الدین
ابن سلطان علاء الدین
ادام اللہ اظلالہ، بین

شروع سے میرے دل اور سینے
میں یہ آرزو تھی کہ میں اس
بلند چوکھٹ اور روشن ممبر کو
چوموں، جو حاجتمندوں کی
قبلہ گاہ اور بڑے بڑے مراتب وعروج
رکھنے والوں کی منزل ہے۔ اسی
وجہ سے اس چوکھٹ نے
اپنی بنیاد ایک گلستان میں
ڈالی ہے اور آسمانوں کی تلاش
وجستجو کے لئے ایک سیڑھی
بالگی ہے۔ میری مراد اس عظیم
آقا، بادشاہ جلیل، قوموں
کے فرمانروا، دین و دنیا کے
لئے شان وشکوہ رکھنے والے
اور اسلام اور مسلمانوں کے
فریادرس سے ہے، جس کا
نام سلطان سکندر شاہ بن

کافۃ الانام و ضاعف
جلالہٗ الیٰ آخر الدھر
والایام۔ ولم اجد
وسیلۃ الی الاقدام بھذا
المرام حتی ظفرت
بتالیف ھذا المسطور و
تصنیف ھذا المزبور۔
فکتبتہٗ وجعلتہٗ
ذریعۃً الی وصول
جنابہ المنیر متوسلاً
علی الملک المیسر کل
العسیر والمعین فی امر
خطیر فھو نعم المولیٰ
ونعم النصیر۔ [1]

سلطان قطب الدین بن سلطان
علاء الدین ہے۔ خدا جملہ مخلوق
پر اس کا سایہ پھیلائے اور
زمانے کے آخری دن تک اس کے
جاہ و جلال میں افزونی کرے،
میں نے اس آرزو کو پورا کرنے
کے لئے کوئی ذریعہ نہ پایا یہاں
تک کہ میں یہ کتاب تالیف
کرنے میں کامیاب ہوا۔ چنانچہ
یہ کتاب میں نے لکھی اور اسے
سلطان کے حضور پہنچنے کے لئے
ایک ذریعہ بنایا۔ میں نے اللہ پر
بھروسہ کرتے ہوئے ایسا کیا جو ہر
مشکل کو آسان کرنیوالا ہے ہر مشکل
معاملے میں مددگار ہے۔ سو بہتر
آقا اور بہتر مددگار ہے۔

اس اقتباس سے عہد سکندر شاہی کی دو اہم خصوصیات واضح ہوتی ہیں۔

اول: سلطان سکندر کے زمانے میں کشمیر میں یقیناً اسلام کی اشاعت زوروں پر تھی اور سلطان سکندر مسلمانوں کا ملجا و ماویٰ بنا ہوا تھا۔

---

[1] تنویر السراج (قلمی)۔

دوم: سلطان کا منظورِ نظر بننے کے لیے علمی صلاحیتوں سے بہرہ مند ہونا ضروری ہوتا تھا۔ اس کا دربار مذہبی تعصب اور منافرت پھیلانے والوں یا چاپلوسوں اور ابن الوقتوں یا غیر مسلموں کو نیچا دکھانے والوں سے پاک تھا۔

دینی مدارس اور ایک جامع مسجد کی تعمیر: سلطان سکندر نے اپنے باپ سلطان قطب الدین کے قائم کیے ہوئے مدرسے کے طرز پر نوہٹہ (سرینگر) میں ایک اور مدرسے کی بنیاد ڈالی۔ بخارا کے ایک فاضل سید محمد علی کو اس کا صدر مدرس مقرر کیا۔ اس مدرسے کے مشہور اساتذہ میں مولانا سید حسین منطقی، مولانا محمد یوسف، مولانا صدرالدین کاشی اور مولانا محمد افضل کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں مولانا محمد یوسف کا تعلق کشمیر سے تھا باقی علمائے کرام وسط ایشیائی سے تعلق رکھتے تھے۔ یہاں قرآن و حدیث و فقہ کے ساتھ عقلی علوم بھی پڑھائے جاتے تھے۔ مولانا سید حسین منطقی فلسفہ اور مولانا صدرالدین ریاضی کے مدرس تھے۔ مولانا محمد افضل ملک کے شیخ الاسلام بھی مقرر ہوئے تھے۔

مولانا محمد افضل بخاری نے خود اپنی کوششوں سے نوشہرہ (سرینگر) میں ایک اور عظیم مدرسے کو قائم کیا تھا، وہ شیخ الاسلامی کے فرائض انجام دینے کے ساتھ ساتھ اس میں خود بھی درس دیتے آتے تھے حکومتِ وقت نے علاقۂ ناگام کے کچھ گاؤں کی آمدنی اس مدرسے کے مصارف پورا کرنے کے لیے جہیار رکھی تھی۔ مولانا محمد افضل کا جب انتقال ہوا تو اپنے اسی مدرسے کے متصل دفن کیے گئے۔

مولانا محمد افضل بر عہدۂ   مولانا محمد افضل شیخ الاسلام

شیخ الاسلامی تسلط نمود
و بنائے مدرسہ کردہ بتعلیم
و تدریس شاگرداں اشتغال
گرفت و چند قریہ از
پرگنہ ناگام مدد معاش
بنام وے جاگیر دار بودند
پس از رحلت در محلہ نوشہرہ
متصل مدرسہ خود آسودہ [۱]

کے منصب پر فائز ہوئے۔
انہوں نے ایک مدرسے کی
بنیاد بھی ڈالی جہاں اپنے
شاگردوں کی تدریس میں
مشغول ہوئے۔ پرگنہ ناگام کے
چند گاؤں روزگار کی فراہمی
کے لئے جاگیر کے طور پر حاصل
ہوئے تھے۔ انتقال کے بعد نوشہرہ
میں اپنے مدرسے کے متصل
آسودہ ہوئے۔

درحقیقت سلطان سکندر کے عہد میں کشمیر کی سرزمین مساجد و مدارس سے معمور ہوگئی کیونکہ اس کے دور میں ایران، افغانستان، خراسان، یہاں تک کہ عراق اور شام کے بے شمار علماء یہاں وارد ہوئے اور انہوں نے جہاں قیام کیا وہاں درس و افادہ کی مجلسیں گرم ہوئیں۔ ملا عبدالباقی نہاوندی لکھتے ہیں:

در زمان او علمائے از عراق
و خراسان بکشمیر آمدہ در سایۂ
رحمتش بر آسودند و دین
اسلام در کشمیر شائع گشت۔ [۲]

سکندر کے زمانے میں عراق اور خراسان
کے علماء کشمیر وارد ہو کر بادشاہ کے
سایۂ رحمت و شفقت میں مالا مال ہوئے تھے
اس طرح کشمیر میں اسلام کی اشاعت ہوئی

۱: تحائف الابرار (قلمی)
۲: مآثر رحیمی، رائل ایشیاٹک سوسائٹی، بنگال ۱۹۳۱ء، ج ۱، ص ۲۸۵

ابوالقاسم فرشتہ نے لکھا ہے کہ کشمیر سلطان سکندر کے زمانے میں علوم و فنون کی گرم بازاری میں مشہور علمی مراکز کے ہمسر بن گیا۔

سلطان سکندر بمرتبہ سخاوت داشت کہ از شنیدن آوازہ آں دانشمندان عراق و خراساں و ماوراء النہر ملازمتش آمدند و علم و فضل و اسلام در مملکت کشمیر رواجِ تمام پیدا کردہ نمونۂ عراق و خراساں گردید[1]

سکندر اس پائے کا فیاض تھا کہ اس کی فیاضی کی شہرت سنتے ہی عراق، خراساں اور ماوراء النہر سے علماء اور دانشمند اس کی ملازمت سے فائدہ اٹھانے کی غرض سے کشمیر وارد ہوئے جس سے کشمیر میں اسلام اور اسلامی علوم کی ایسی عظیم الشان ترویج ہوئی کہ یہ ملک عراق اور خراساں کا نمونہ بن گیا۔

سلطان سکندر ہی کے عہد میں امیر تیمور گورگانی اطراف و جوانب تہس نہس کرتا ہوا جموں پہنچا، قریب تھا کہ وہ کشمیر کو بھی اپنی بربریت کا نشانہ بنا دیتا کہ سلطان سکندر کی سیاسی بصیرت اس کے سامنے ناقابلِ عبور دیوار کی طرح حائل ہوئی۔ صرف ۷۵ سال پہلے ایک منگول حملہ مملکتِ کشمیر کے لئے طوفانِ بلاخیز ثابت ہوا تھا جس نے کشمیر کا سیاسی اور اقتصادی ڈھانچہ بکھیر دیا تھا اب سکندر نے اسے دہرانے کا موقع نہیں دیا۔ اس نے تیمور کو کشمیر کی جانب رُخ کرنے سے پہلے ہی اپنی جانب سے ایک نمائندے کو، جس کا نام تاریخوں میں مولانا نورالدین آیا ہے، تیمور کے

[1] تاریخ فرشتہ، ج ۲، ص ۳۴۱۔

پاس تحائف کے ساتھ بھیجدیا اور اپنی اطاعت و پیروی کا یقین دلایا[۱]
عملاً اطاعت کی نوبت کبھی نہیں آئی مگر بربر مزاج حکمران خوش ہوا
اور کشمیر آنے کا ارادہ منسوخ کیا۔ اس طرح ایک ابھرتی اسلامی مملکت
خاک میں ملنے سے محفوظ رہی۔

سلطان زین العابدین کی تخت نشینی | سلطان سکندر شاہ کے بعد
اس کا بیٹا علی شاہ تخت نشین ہوا اور سات سال (۱۴۱۳ء تا ۱۴۲۰ء)
حکومت کی۔ اس کے دور میں ہمیں کوئی قابلِ ذکر علمی کارنامہ تاریخوں
میں نہیں ملا۔ اس نے اپنی حکمرانی کے دوران ہی حج کا ارادہ کیا اور
اقتدار اپنے چھوٹے بھائی زین العابدین کو منتقل کیا۔ جب وہ جموں
پہنچا تو اس کے سوتیلے دادا راجہ بلادیو[۲] حکمران جموں نے اقتدار
بھائی کے حوالے کرنے پر سخت اظہارِ افسوس کیا اور عار دلایا۔ چنانچہ اس
کے زیرِ اثر علی شاہ نے حج کا ارادہ فسخ کیا اور بھائی سے نبرد آزما
ہونے کے ارادے باندھے۔ مگر جب زین العابدین کو اس کی اطلاع
ملی تو اس نے خوشی سے اقتدار بھائی کے حوالے کیا اور خون خرابہ پیدا
ہونے نہیں دیا۔ ڈاکٹر زتشی کی تحقیق کے مطابق زین العابدین نے

---

[۱]: تاریخ حبیب السیر فی اخبار افراد البشر، غیاث الدین حسینی (خواندامیر)
انتشارات کتاب خانۂ خیام، ج ۳، ص ۷۹ ۴؛ و تاریخ روضۃ الصفا،
میر خواند، ج ۶، ص ۳۱۸۔

[۲]: سلطان سکندر کی چہیتی بیوی ایک ہندو خاتون مُرّہ بیا دیوی تھی۔
وہ راجہ بلادیو کی لڑکی تھی۔ سکندر کے اپنے سسرال کے ساتھ آخر تک تعلقات
خوشگوار تھے اس رشتے میں کوئی جبر نہیں تھا۔

اس دوران تین ماہ (از جولائی ۱۴۱۹ء تا اکتوبر ۱۴۱۹ء) حکومت کی۔ ڈاکٹر زتشی کی یہ بھی تحقیق ہے کہ علی شاہ کے ارادۂ حج فسخ کرنے کے پیچھے صرف حکمرانِ جموں کا ذہن کارفرما تھا۔ اس نے ڈاکٹر پارمو کی یہ رائے رد کر دی ہے کہ اصل میں علی شاہ کی نیتِ حج ہی صاف نہیں تھی، اور یہ کہ اصل میں اس کا مقصد اپنے بھائی سے مکمل چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے ایک فوجی حکمت عملی Strategy اپنانا تھا۔ مگر ڈاکٹر زتشی نے علی شاہ کے ارادۂ حج کو منسوخ کرنے اور اپنے بھائی سے ٹکرانے کا ذمہ دار جموں کے حکمران کو قرار دیا ہے۔[1]

سلطان علی شاہ دوبارہ اقتدار سنبھالنے کے تھوڑے ہی ماہ بعد رحلت کر گیا اور اس کا چھوٹا بھائی سلطان زین العابدین بڈشاہ تخت نشین ہوا۔

غیر معمولی ہندو نوازی: شاہمیری مسلمان تھے جو اپنی سیاسی بالغ نظری اور فوجی مہارت کے بل پر کشمیر کے حکمران ہوئے تھے انہوں نے کشمیر کو امن و سکون اور خوشحالی و فارغ البالی سے ہمکنار کیا، جبکہ اس زمانے میں دوسرے اسلامی ممالک ایک سرے سے دوسرے سرے تک بے اطمینانی اور اتھل پتھل کے شکار تھے۔ کچھ لوگ اپنے ممالک سے ہجرت کر کے کشمیر وارد ہوئے اور کشمیر ہی کو اپنا مستقل وطن بنایا۔ شاہمیری حکمرانوں نے نسلی و ملکی تعصب سے بالاتر ہو کر ان سے حسن سلوک کیا اور ان کی صلاحیتوں

۱؎: Sultan Zainul-Abidin of Kashmir, P.33

سے فائدہ اٹھایا۔ اتفاق سے یہ مہاجرین سب کے سب مسلمان تھے اور انہوں نے کشمیر کو اسلامی سانچے میں ہی ڈھالا۔ اس تبدیلی کی ابتدا رینچن کے مذہب کی تبدیلی سے ہوئی، قطب الدین کے زمانے میں اس عمل میں تیزی آئی اور سکندر کے زمانے میں عروج پر پہنچی۔

ملک میں مذہب و ثقافت کی اس تیز رفتار تبدیلی کو یقینی بنانے کے باوجود شاہمیری سلاطین نے عمومی رعایا پروری کی اپنی منصبی ذمے داری سے غفلت نہیں برتی۔ کشمیر کے جو ہندو اپنے مذہب پر قائم تھے اُن کے ساتھ جبر و ظلم کا معاملہ روا نہیں رکھا گیا۔ ان سلاطین کی بیویاں ہندو عورتیں تھیں۔ شاہمیری سلطنت کے بانی سلطان شمس الدین نے کوٹہ رانی کو اپنے ساتھ شادی کرنے کا پیغام دیا مگر اس نے اُسے گوارا نہیں کیا۔ حالانکہ اس سے قبل کشمیر کے تین حکمرانوں سہدیو، صدرالدین (سابق رینچن) اور سہدیو کے بھائی ادون دیو کے ساتھ وہ تینوں شادیاں رچا چکی تھی۔ اسی طرح سلطان قطب الدین، جو حضرت امیر کبیرؒ کا جان و دل سے معتقد تھا، کی بیوی بھی ہندو تھی اس کے باپ سلطان شہاب الدین کی بیوی بھی ہندو ہی تھی۔ اس کا نام لکشمی تھا۔ خود سلطان سکندر کی چہیتی بیوی جموں کی ہندو خاتون شوبھا تھی۔ اس نے اپنے بیٹے زین العابدین کی تربیت پر ہندو اہلِ علم بھی مقرر کیے تھے۔ جس پر مغل دور کے نوربخشی مورخوں نے اُسے نیم ہندو ٹھہرایا۔ زین العابدین کے بھائی سلطان علی شاہ کے دربار کے مقرب ہندو اور مسلمان علمائے کے ساتھ ایک بدھ عالم

تلاک اچاریہ بھی بڑی عزت اور اونچے منصب کا مالک تھا۔[1] سلطان زین العابدین، جسے قدیم ہندو مؤرخوں نے اس کی زبردست عالی حوصلگی اور فراخدلی سے متاثر ہو کر وشنو اوتار اور نرائن اوتار قرار دیا ہے، اور جسے دورِ جدید کے غیر مسلم مؤرخ ہندو نواز ہی نہیں بلکہ نیم ہندو ٹھہراتے ہیں نیز کشمیر میں موجودہ ہندوؤں کا وجود اسی کا رہینِ منت و کرم سمجھتے ہیں، بایں ہمہ محققوں کو اس کے دربار میں صرف دو بدھ اہلِ علم ملے۔[2]

اسی طرح جملہ شاہمیری سلاطین مندروں اور وہاروں کی حفاظت میں بھی کوشاں تھے اگر موقعہ ملتا تو ان کی تعمیر بھی کرتے تھے۔ چونکہ اس زمانے میں کشمیر کے ہندو جوق در جوق صوفیائے اسلام کی دعوت پر اسلام قبول کرتے تھے اس لئے بجائے مندروں اور وہاروں کے مسجدیں اور حمام ہی زیادہ بنتے تھے۔ جہاں تک مندروں کے انہدام کا تعلق ہے، جسے معاصر مؤرخ جون راج نے بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے، تو تاریخی حقائق اسے خود بخود رد کرتے ہیں۔ بالخصوص مرزا حیدر دوغلات[3] (دورِ حکومت ۱۵۳۲ء) اور مشہور اسلام بیزار اور مسلم آزار اکبری دربار کا چاپلوس مؤرخ ابوالفضل[4] کی چشم دید

1: Rajtarangni, Jonaraja Tr. J.C. Dutt - Vol.3, P.83

2: Buddhism in Kashmir and Ladakh, J.K Ganhar.

3: Tarikh-Rashidi (Eng.Tr.) 426

4: Early History & Culture of Kashmir; S.C.Roy P.142

شہادتوں سے مؤرخ جون راج کے اس دعوے کی خود بخود تردید ہوتی ہے کہ سلطان سکندر شاہ اور اُس کے درباری نومسلم وزیرِ اعظم سہہ بھٹ[1] نے کشمیر میں ایک ایک مندر مورتی برباد کر کے رکھدیا۔ جون راج نے تمام انسانی کمزوریوں کو بروئے کار لاکر بھی صرف چھ مندروں یا مورتیوں کے نام گنے ہیں جو بقول اُس کے سکندر نے مسمار کیے۔

عقلِ عام بھی کہتی ہے کہ سکندر کو کشمیر کے تمام مندر برباد کرنے سے کوئی مدعا حاصل بھی ہو سکتا تھا۔ جس زمین کے جملہ ندی نالے، دریا اور جھیل، پہاڑ اور ٹیلے غرض ایک ایک چپہ کسی نہ کسی دیوی یا دیوتا سے منسوب ہو وہاں مندروں اور مورتیوں کے انہدام سے بھلا کیا حاصل ہو سکتا تھا! یہاں ۴۵ جگہیں مہادیو، ۶۴ جگہیں بشن اور ۲۲ جگہیں دُرگا کے نام پر وقف ہیں۔ اب جو مذہب ہزاروں دیویوں اور دیوتاؤں کا قائل ہو اس کے اقتدار کی کیفیت کیا رہی ہوگی، اور سکندر ان جگہوں کی مذہبی حیثیت صرف مندر مسمار کرنے سے کیا تبدیل کر سکتا تھا؟

اس میں شک نہیں ہے کہ کشمیر میں کچھ مندر وقتاً فوقتاً تباہ ہوئے ہیں اس میں جہاں سیلابوں، زلزلوں اور دوسری آسمانی آفتوں کا ہاتھ تھا وہاں یقیناً کچھ حکمرانوں کے حکم کا بھی دخل رہا ہے۔ ہندو دورِ حکومت میں جلاکا، کلاسا اور ہرشا تینوں حکمرانوں نے مندر منہدم کرنے میں بڑی دلچسپی لی تھی۔[2] اسی طرح سلاطین کے عہد میں یقیناً کچھ مندر تباہ ہوئے مگر ایسا مذہبی انتقام گیری کی بنا پر نہیں ہوا ہے، بلکہ اُس زمانے میں کچھ مندروں کا تقدس بری طرح مجروح

[1]: Rajtarangni of Jonaraja; Ed. Srikanth Koul, P.97

ہو چکا تھا۔ یہ رو حانی آسودگی کے بجائے بُرائیوں اور عجوبات کے مرکز بنے ہوئے تھے اس لئے سلاطین ان میں مداخلت کرنے پر مجبور ہوتے تھے۔ اور تو اور خود سلطان زین العابدین جیسے قدیم و جدید مندروں کی مؤرخ برائے نام مسلمان کی صورت میں پیش کرتے ہیں، کے حالات میں جون راج نے یہ واقعہ لکھا ہے کہ ایک بار سلطان سرادا مندر، جو کشمیر میں شمال و مغرب میں کشن گنگا اور مدھومتی کے سنگم کے متصل واقع تھا، دیکھنے گیا تو اس مندر میں ایک دیوی کی کرامت دیکھنے گیا تھا جو وہ دکھا نہ سکی۔ بادشاہ مایوس ہوا اور دیوی کی مورتی کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ اس طرح جون راج نے بڑے معصومانہ انداز میں مندروں کی حالت اور اپنے ہیرو حکمران کی کاروائی سے خود بخود پردہ اُٹھایا ہے۔

زین العابدین کی ذاتی زندگی اور اسلامی مزاج۔

زین العابدین کشمیر کا پہلا مسلمان حکمران ہے جس نے اسلامی ممالک بالخصوص وسطِ ایشیائی ممالک کے ساتھ ثقافتی اور علمی رابطے قائم کئے۔ اور مملکت میں اسلامی علوم کو ترقی دینے کے لئے اپنی سرپرستی میں مدارس کھولے اور علمائے اسلام کی عزت افزائی کی وہ اس علم دوستی اور علماء نوازی میں دنیا کے معدودے چند حکمرانوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ وہ خود بھی فارسی، تبتی، سنسکرت اور کشمیری زبانوں کا عالم تھا۔ فارسی کی راہ سے وہ عربی سے بھی واقفیت رکھتا تھا۔ مؤرخ حسن لکھتا ہے:

"کتب احادیث از حرمین   اس نے حدیث کی کتابیں

الشرفیہا بکمالِ ہوس طلب داشتہ در مطالعہ آں ہمیشہ مشغول مے بود۔[1]	حر یہ شرفیہ سے بڑے شوق و ذوق سے منگوائیں اور پھر پورے انہماک سے ان کا مطالعہ کرتا تھا۔

اُسے اطلاع ملی کہ مکہ مکرمہ میں علامہ جار اللہ زمخشری کے ہاتھ کا لکھا ہوا تفسیر کشاف کا نسخہ موجود ہے تو فوراً اُس کی نقل منگوانے کا انتظام کیا۔[2] اس نے ملک میں شیخ الاسلام کے منصب کو رونق بخشی اور بذاتِ خود مُلکی اور سیاسی معاملات میں شیخ الاسلام کے پاس آکر مشورہ حاصل کرتا تھا۔

"خود اکثر اوقات برائے استفادہ بخدمت ایشاں مے رفت۔"[3]

اسی طرح اس نے کشمیر میں بھی حاجب کا عہدہ وجود میں لایا۔ حاجب کی اجازت کے بغیر سلطان کے بیٹوں کو بھی باپ کے پاس جانے کی اجازت نہیں تھی۔[4] اس زمانے میں خلافت اور خلیفے کا وجود برائے نام ہو کر رہ گیا تھا، مگر سلطان نے ملک میں خلیفہ کا نائب بن کر رہنا پسند کیا۔[5] صوفیاء کا وہ حد سے زیادہ عقیدت مند اور قدر دان تھا۔ حضرت شیخ نور الدین ریشی کشمیری ؒ کی میت کو

---

[1]: تاریخِ حسن۔ [2]: تاریخ بدشاہی، ص ۳۶۲۔

[3]: تاریخ کشمیر، ملک حیدر چاڈورہ (قلمی)۔

[4]: Rajtarangni : Jonaraja, Tr. Mr. Dutt

[5]: خوارق السالکین (قلمی)۔

سلطان زین العابدین نے خود بھی کندھا دیا تھا[1] اور نماز جنازہ میں شریک ہوا تھا۔ اسی طرح صوم و صلوٰۃ کا پابند اور روحانی قدروں کا محافظ تھا وہ جن چند دوسرے جلیل القدر پیشواؤں سے معنوی فیوض و برکات حاصل کرتا تھا۔ ان میں حضرت سید ناصر بیہقیؒ، شیخ نور الدین کشمیریؒ، سید محمد رفاعی (عرف جانہار ولی) سید محمد برخوردار اور سید محمد عالی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ سلطان نے ان میں سے بعض بزرگوں کے لئے خانقاہیں بنوا کر ان کے اخراجات کے لئے جاگیریں مقرر کی تھیں۔ قدیم شاہمیری سلاطین ہندو عورتوں کے ساتھ (شاید ذمّی سمجھ کر) نکاح کیا کرتے تھے جبکہ خود سلطان زین العابدین کی اہلیہ مشہور بزرگ حضرت سید محمد کاندھامی بیہقیؒ کی دختر تھی۔ موصوف حضرت سید تاج الدین بیہقی کے فرزند اور حضرت امیر میر سید علی ہمدانیؒ کے قرابتدار تھے۔ سلطان کی یہ اہلیہ بڑی نیک سیرت خاتون تھی۔ اس نے اپنے زیورات سے ایک علیحدہ مقبرہ بنوایا تھا اور تمنّا یہ تھی کہ پہلے اس میں کوئی بزرگ آسودہ ہو جاتے۔ چنانچہ اس دور کے ایک دوسرے قابل احترام بزرگ اور روحانی پیشوا شیخ بہاؤ الدین گنج بخشؒ نے جب انتقال کیا تو انہیں اسی مقبرے میں سپردِ خاک کیا گیا۔ سلطان زین العابدین خود بھی ان کے جنازہ میں شریک تھا[2]

سلطان نہ صرف مہاجر بزرگوں کی صلاحیتوں سے استفادہ کرتا تھا بلکہ اس نے ان سے جسمانی رشتے بھی قائم کئے تھے۔ جہاں اس نے اپنے دو

۱: Kashmir : Its Cultural Heritage : Kaumadi, P.66

۲: خوارق السالکین (قلمی) ملا عبد الصبور۔

بیٹوں آدم خان اور حسن خان کو انہی مہاجر علماء کی اتالیقی میں رکھا، وہاں حسن خان کی شادی حضرت سید ناصر بیہقی رح کی پوتی سے کی تھی۔

سلطان زین العابدین صوفیاء اور علماء کے حلقۂ اثر میں تھا وہ بعض اوقات سلطان کو تنبیہہ بھی کرتے تھے۔ ایک مرتبہ مشہور شیخ طریقت حضرت سید محمد امین اویسی رح نے سلطان کی مجلس میں جو مشہور "ولر" جھیل کے قریب منعقد کی گئی تھی کوئی غیر شرعی حرکت مشاہدہ کی تو وہ مجلس سے اُٹھ گئے اور دریا میں چھلانگ لگا دی، اس سے سلطان کبیدہ خاطر ہوا اور اس نے مجلس ہی برخواست کی۔

مدرسۂ سلطان زین العابدین | زین العابدین نے نوشہرہ (سرینگر) میں، جو اس کا دارالحکومت تھا، ایک عظیم الشان دارالعلوم قائم کیا جس نے عرصۂ دراز تک کشمیر میں عربی دینی علوم اور اسلامی فکر و ثقافت کی تعلیم و ترویج میں گراں القدر خدمات انجام دے دی اس ادارے کے پہلے صدر مدرس شیخ کبیر نحوی تھے اُن کے علم و فضل کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ سلطان نے انہی کو شیخ الاسلام بھی مقرر کیا تھا اور خود اُن کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا۔ انہوں نے وسط ایشیاء کی اونچی اسلامی درسگاہوں سے فراغت علمی حاصل کی تھی۔ اس دارالعلوم کے ایک اور سرکردہ اُستاد مُلّا احمد تھے وہ عربی، فارسی اور سنسکرت کے ممتاز عالم تھے۔ ایک مرتبہ سلطان زین العابدین اُن سے کسی بات پر سخت ناراض ہوا۔ یہاں تک کہ انہیں کشمیر چھوڑنے کا حکم دیا۔ مُلّا احمد جب بھلی کے مقام پر پہنچے تو سلطان کو درج

ذیل دو عالمانہ شعر لکھ کر بھیجے جن میں کمالِ ادب اور ادبیت سے بھرپور انداز میں اپنی بے گناہی کا ذکر کیا۔

نے بہ نجوم زمُبتدا خبرے　　نہ بمنطق زجزو کل اثرے
برمن ایں کسرہ وجر جرا رانند　　احمد از غیرِ منصرف خوانند[۱]

سلطان نے اُنہیں واپس بلا لایا، اگر کوئی قصور تھا تو اُسے معاف کیا اور پہلی عزت افزائی بحال کی اس مدرسے کے دوسرے اساتذہ میں حافظ بغدادی، شیخ پارسا بخاری، شیخ جمال الدین خوارزمی (قاضی القضاۃ) میر علی بخاری اور شیخ یوسف رشیدی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ان علمائے کشمیر میں اقامت کی یہیں اپنی ساری علمی سرگرمی جاری رکھی۔ اور بالآخر اسی کی آغوش میں ہمیشہ کے لیے چھپ گئے۔

دارالترجمہ | مدرسۂ نوشہرہ کے ساتھ ہی سلطان زین العابدین نے ترجمے کا ایک مستقل ادارہ بھی قائم کیا اور اس کے مصارف پر کئی گاؤں کی آمدنی وقف رکھی تھی۔ سلطان نے عرب و عجم سے ہزاروں مخطوطات منگوا کر یہاں کے علمی اداروں میں جمع کر لیے وہ انہیں حاصل کرنے کے لئے کوئی بھی قیمت ادا کرنے سے گریز نہیں کرتا تھا۔ سلطان نے تفسیر کشاف کے مستند نسخے کی نقل حرمین سے منگوائی اور اس کے لئے کشمیر ہی سے ایک کاتب کو دو سال کے لئے بھیج دیا اس کی تفصیل تفسیر کے باب میں موجود ہے۔ عربی اور فارسی زبان کے ساتھ ساتھ اُس نے کشمیری اور سنسکرت کی ترقی میں بھی اپنی بھرپور دلچسپی ظاہر کی تھی۔

---

[۱] تاریخ کشمیر، ملک حیدر چاڈورہ (قلمی)، ص ۷۴۔

بسیاری از کتب عربی و فارسی	اس کے حکم سے بہت سی عربی
را در زبان اُو بفرمودہ اُو	و فارسی کتابوں کا ہندی (سنسکرت)
بزبان ہندی ترجمہ نمود [1]	زبان میں ترجمہ کیا گیا۔

اس کے دربار میں کئی مسلمان علماء سنسکرت سے اور کئی ہندو فارسی و عربی سے بدرجۂ اتم واقف تھے۔ شری ور نے اسی دارالترجمہ میں یوسف زلیخا کا سنسکرت میں ترجمہ کیا اور مُلا احمد نے سنسکرت کی مشہور تاریخ "راجترنگنی" کو بحرالاسمار کے نام سے فارسی میں منتقل کیا۔ یہ عظیم ادارہ سلطان فتح شاہ (۸۹۵ھ) کے عہد حکومت تک موجود تھا پھر بے قدری کا شکار ہو کر مٹ گیا۔

سلطان زین العابدین خود بھی شاعر اور مصنف تھا۔ اس نے بارود اور دوسرے آتشین اسلحہ کے متعلق حبیب نامی ایک عالم کو ایک کتاب املا کرائی یہ کتاب مقالے کی صورت میں تھی[2] اسی طرح دُنیا کی بے ثباتی پر شکایت کے نام سے بھی ایک کتاب لکھی وہ فارسی میں شعر بھی کہتا تھا۔ پروفیسر محب الحسن صاحب لکھتے ہیں کہ شاعری میں سلطان اپنا تخلص قطب رکھتا تھا[3] جبکہ ڈاکٹر محی الدین صوفی کی تحقیق یہ ہے کہ قطب اس کے دادا سلطان قطب الدین کا تخلص تھا[4] قرینہ صوفی صاحب ہی کا مؤید ہے۔

---

[1]: مآثر رحیمی، ج ۱، ص ۲۱۱ -

[2]: Kings of Kashmir : Tr. Mr. Dell, Chap IV, P. 135

[3]: Kashmir Under the Sultans P.

[4]: Kashmir : A History of Kashmir, Vol II.

مدرسۂ اسلام آباد: سلطان زین العابدین کے عہد کے مشہور مدارس میں اسلام آباد کا ایک مدرسہ بھی قابلِ ذکر ہے اس مدرسہ کا ناظم غازی خان تھا۔

سیالکوٹ کے ایک مدرسے کی امداد: اس طرح سلطان کے عہدِ حکومت میں سیالکوٹ کے ایک دینی مدرسے کو بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ سلطان اس مدرسے کی گرانقدر رقم کی صورت میں مدد کرتا تھا۔ بلکہ ایک مرتبہ سلطان کی بیوی نے اس کے لئے اپنے گلے کا ہار بھی دے دیا تھا۔[1]

مدرسۂ گُل خاتون: گُل خاتون، زین العابدین کی بہو یعنی حیدر شاہ کی بیوی تھی۔ اگرچہ زین العابدین کے بعد حیدر شاہ کو بھی دو سال حکومت کرنے کا موقعہ ملا مگر اس نے بطور خود کوئی علمی یادگار نہیں چھوڑی تھی۔ اس نے اپنا دورِ حکومت بدمستی میں ضائع کیا۔ تاہم اس کی بیوی گُل خاتون نے ایک عظیم الشان مدرسہ جھیل ڈل کے کنارے پکھری بل کے مقام پر قائم کیا۔[2] اس کی عمارت بڑی وسیع و عریض تھی جو ۳۶۰ کمروں پر مشتمل تھی۔ مولانا اسماعیل شامی کبروی اس کے پہلے صدر مدرس مقرر ہوئے تھے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مدرسے کی جگہ پورے غور و خوض کے بعد ہی منتخب کی گئی تھی۔ یہ جگہ نہایت خوبصورت ہے اور درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کے لئے انتہائی مناسب اور موافق ہے۔ ڈیڑھ سو سال بعد

---

[1]: A History of Kashmir : Dr. Sofi, Vol-2

[2]: ..... Do...... (ایضاً)

دارا شکوہ نے جھیل ڈل ہی کے دوسرے کنارے، ایک پہاڑی کی چوٹی پر اہلِ علم بالخصوص وحدت ادیان کے علمبرداروں اور فلسفۂ تصوف کے ممتاز ماہرین کے غور و فکر کے لئے ایک پُر وقار نشست گاہ تعمیر کی جو اس کی بیوی نادرہ بیگم معروف بہ پری بیگم کے نام پر پری محل سے مشہور ہوئی۔ یہ عمارت آج بھی موجود ہے اور تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔ علامہ شبلی نعمانی جب کشمیر تشریف لائے تھے تو جھیل ڈل اور اس کے ماحول سے بے حد متاثر ہوئے تھے۔ اپنے مشہور قصیدۂ کشمیریہ میں یہ فرماتے ہیں:

آبگیرے کہ بشہرست و بود نامش ڈل
گوئیا آئینۂ روضۂ عروسِ زیباست
سینہ صاف دلاں ست ہمانا کز لطف
ہر چہ در ہست بود، از صفحۂ رویش پیداست
گردِ بر گردِ ڈل آں صف زدن لالۂ گل
چوں طرازیست کہ بر دامنِ شوخی رعناست[1]

مثالی کشمیری حکومت کا زوال! سلطان زین العابدین پچاس سال تک کشمیر کے تختِ سلطنت پر پورے وقار و احترام کے ساتھ متمکن رہا۔ اس کی حکومت رعایا کی فلاح و بہبود، علمی و فکری ترقی، تمدن کی گرم بازاری اور مشترکہ ثقافت کی مخلصانہ سوجھ بوجھ کے لحاظ سے پہلی اور آخری حکومت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ لوگوں کا ہر طبقہ اس سے خوش رہا اور اس کے کارناموں کی تعریف و تمجید میں

[1] : کلیاتِ شبلی، معارف پریس اعظم گڑھ، ص ۲۶۔

رطب اللسان رہا ۔

مگر زین العابدین کے انتقال کے ساتھ ہی زوال کے آثار نمودار ہونے لگے۔ خود وہ اپنے بیٹوں سے اپنی زندگی ہی میں مایوس ہوا تھا۔ چنانچہ جب اس کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا حیدر شاہ (۱۴۷۰ء تا ۱۴۷۲ء) تخت نشین ہوا تو اس نے اپنی بد مستی اور غفلت شعاری سے اپنے عظیم باپ کی شاندار روایات پامال کرنے شروع کئے۔ سب سے پہلے اس نے ایک نائی "Pikktara" کو مملکت کے سیاہ و سپید کا مالک و مختار بنایا[1] اور خود عیش و عشرت میں غرق ہوا۔ مورخ غلام حسن کھویہامی لکھتے ہیں :

سلطان شب و روز در لہو	حیدر شاہ دن رات لہو و
لعب مخمور و مسرور ماندہ	لعب اور عیش کوشی میں
او ضایع اجداد خود درہم	ڈوبا رہتا تھا یہاں تک کہ
برہم ساخت[2]	اس نے اپنے اسلاف کی روایات
	درہم برہم کیں۔

اور پیکتا جارا نائی کے بارے میں بھی مورخ آگے لکھتے ہیں :

ہر چہ او مے گفت سلطان بدان	وہ جو بھی مشورہ بادشاہ کو
عمل مے کرد و او از مردماں	دیتا تھا وہ اس پر عمل کرتا
رشوت مے گرفت و بہر کس بدے	تھا وہ لوگوں سے رشوت
شد سلطان را باو منحرف	لیتا تھا اور جس سے نفرت کرتا اس

1: Rajtarangni : Shrivara, Tr. Mr. Dutt, P. 186

2: تاریخ حسن، ج ۲، ص ۲۰۷ ۔

سے ساخت یہ[1] کے خلاف سلطان کو بھڑکانا تھا۔

آگے بھی سلسلہ دوسرے حکمرانوں کے دور میں بھی جاری رہا۔ وہ اس حد تک نااہل ثابت ہوئے کہ اپنے وزیروں اور با اثر لوگوں کے ہاتھوں میں کھلونے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے تھے۔ انہوں نے محمد شاہ کو چار مرتبہ اور فتح شاہ کو تین مرتبہ جب چاہا تخت پر بٹھایا اور جب چاہا تخت سے اتارا۔ ان کی نااہلی اور بدمستی دیکھتے ہوئے شاہمیری حکومت کا فوری خاتمہ یقینی تھا۔ مگر چونکہ زین العابدین اور دوسرے متقدم حکمرانوں نے اسے مضبوط بنیادوں پر استوار کیا تھا اس لئے اس کے خاتمے میں بھی دوسرے اقتدار کوش سیاست دانوں کو نصف صدی تک جدوجہد کرنا پڑی۔

معاشرے کا بگاڑ | سلاطین کی نااہلی اور سیاسی طالع آزماؤں کی آوارہ گردی سے کشمیر جیسی چھوٹی سی مملکت کا نظم و نسق منتشر ہونے میں دیر نہیں لگی۔ مختلف با اثر قبیلوں نے سیاست کے اکھاڑے میں کود کر بدترین انتشار اور پراگندگی کا ماحول پیدا کیا۔ پھر بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ زین العابدین نے اپنی طویل مدتِ حکومت کے دوران کئی بار اہم ملکی اور سیاسی مسائل میں بے جا توسع اور عالی ظرفی کا مظاہرہ کیا تھا اس سے کشمیر کے اسلامی مزاج پر گہرے منفی اثرات پڑنے لگے تھے خاص طور پر اس سے بعض بیرونی ممالک سے تعلق رکھنے والے عناصر نے ناجائز فائدہ اٹھا کر یہاں اخلاقی انارکی پھیلائی۔ اگرچہ اس کا مقابلہ کرنے کے لئے اس

۱؎: تاریخ حسن، ج ۲، ص ۲۰۷ —

وقت کے کچھ سربرآوردہ صوفیائے کرام اور خانقاہ نشین بزرگوں نے اصلاح و تربیت کی ذمہ داری وسیع پیمانے پر سنبھال لی تھی (یہاں تک کہ سیاست اور امارت میں عملاً مداخلت بھی کی بلکہ انہی کی کوششوں سے مرزا حیدر کاشغری کے لئے کشمیر آنا اور یہاں سیاسی کھلاڑیوں، سماج کے اوباشوں اور مذہبی بہروپیوں کو دس سال تک پوری طرح دبائے رکھنا ممکن بن گیا) مگر منفی قوتوں کا سیلاب اتنا زوردار تھا کہ ان کا مکمل استیصال اب ناممکن بن گیا۔ اس دور کے ایک ممتاز روحانی پیشوا اور سیاست آشنا بزرگ حضرت میر سید محمد امین اویسیؒ نے درجِ ذیل اشعار میں اپنے ماحول کا نقشہ بڑی خوبصورتی سے کھینچا ہے۔

آزمودم جہان و اہلِ جہاں   آنچہ ہستند آشکار و نہاں
ہمہ در بندِ خویشتن مشغول   ہمہ در کار خویشتن حیراں
نے ترحم بحالِ غم زدہ   نے تکلف بہ لطف و احساں
جملہ در قصدِ خونِ یکدگرند   اوفتادہ چو موش در انباں
کارِ شاں نے بغیرِ کذّابی   بارِ شاں نے بخلاق جز بہتاں
در میانِ شاں ہر آنکہ کمتر تر   سرورِ عصر و اعظمِ دوراں
گر بود کارِ سامری اورا   مے بداند موسئ عمراں
کس نہ گوید کہ ایں خراں تا کے   جاں دہند از برائے یک لبِ ناں

ترجمہ:- (۱) میں نے دنیا اور دنیا والوں کو آزمایا اور ہر کھلی اور چھپی چیز کو دیکھا اور پرکھا۔ (۲)۔ ان میں ہر ایک اپنے نفس کا غلام اور اپنے کام میں سرگرداں ہے۔ (۳) نہ انہیں

کسی کی حالتِ زار پر رحم ہے اور نہ کسی کے لطف و احسان کا احساس ہے (۴) سب ایک دوسرے کے قتل کے درپے ہیں جیسے چوہا چوہے پنجے میں پھنسا ہو۔ (۵) ان کا کام جھوٹ بولنے کے سوا کچھ بھی نہیں ہے یہ لوگوں پر بہتان کی بارش برساتے ہیں۔ (۶) ان میں جو شخص نکما اور نالائق ہوتا ہے وہی اپنے آپ کو نادرۂ روزگار سمجھتا ہے۔ (۷) اگر یہ لوگ سامری کا جادو دیکھتے ہیں تو اس پر حضرت موسیٰؑ کی کرامت سمجھ کر یقین کرتے ہیں۔ (۸) میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ گدھے کب تک ایک روٹی کے لئے جان دیں گے۔")

ان اشعار سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس دور میں کشمیر کے مسلمان بام ترقی سے گر کر ذلت کی کتنی گہری پستی میں گرے تھے۔ حضرت میرؒ نے ان اشعار میں اُن کی توہم پرستی، بے غیرتی، دنیا طلبی، مکر و فریب، بے مائگی، بعض بے مایہ لوگوں کی تعلّی و جاہ طلبی اور ارباب سیاست کی خون خرابی و دہشت گردی سے کھل کر پردہ اٹھایا ہے۔

چک قبیلے کا عروج | شاہمیری حکومت زوال کی طرف بڑھ رہی تھی، تو مختلف خاندان اور قبیلے اقتدار حاصل کرنے میں سرگرم ہوئے اور ایک دوسرے کو گرانے اور پچھاڑنے کے درپے ہوئے۔ ان قبیلوں میں رینہ، چک، بٹ، ماگرے اور بیہقی سادات جیسے قبیلے اور خاندان سیاست و امارت پر چھا گئے۔ اگرچہ اثر و رسوخ اور طاقت و صولت میں یہ ایک اور دوسرے کے ہم سر تھے، تاہم چک قبیلہ اقتدار کو شی

میں دوسرے سارے حریف خاندانوں پر غالب آگیا اور اس کو مملکت کشمیر کا تخت و تاج بھی حاصل ہوا۔

چک قبیلے کے کچھ لوگ آخری ہندو حکمران سہ دیو کے زمانے میں کشمیر داخل ہوئے تھے، اپنی جنگجویانہ صلاحیت سے وہ پہلے شاہمیری حکمران سلطان شمس الدین شاہمیر کے دربار تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انھوں نے کشمیر کی سیاست اور مملکت کے نظم و نسق میں دخل دینا شروع کیا۔ اس دوران انھوں نے کچھ اہم خاندانوں سے رشتے بھی قائم کئے جن میں شاہمیری اور رینہ خاندان خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ دل میں بڑے بڑے عزائم رکھنے کے باوجود سلطان محمد شاہ کی حکومت تک انہیں کشمیر کی سیاست میں کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں ہو سکی، مگر جونہی حکمران ٹولے کی نااہلی منظرِ عام پر آنے لگی اور حکومت و سیاست پر اس کی گرفت پوری طرح ڈھیلی پڑ گئی تو اس قبیلے کے لوگ کھل کر سیاست کے اکھاڑے میں کود گئے اور آناً فاناً سیاست اور انتظامیہ پر چھا گئے یہاں تک کہ سلاطین کو تخت پر بٹھانا اور تخت سے ذلت سے اتارنا ان کی سیاست کا معمولی سا کھیل بن گیا۔ ان کی "بادشاہ گری" کا سلسلہ پچیس ۲۵ سال تک جاری رہا جب اس سے بھی مطمئن نہیں ہوئے تو خود مستقل حکمران بن بیٹھے اور مزید بتیس ۳۲ سال تک مملکتِ کشمیر پر حکومت کی۔

میر شمس الدین عراقی اور کشمیر میں خالص ایرانی ثقافت کا طلوع

شاہمیری سلاطین کی نااہلی اور بد ذوقی کی شہرت پھیل گئی تو بیرونی ممالک سے

تعلق رکھنے والے کئی سیاسی طالع آزما اور مذہبی مشنری کشمیر وارد ہونے لگے۔ وہ یہاں کی مٹی کی "زرخیزی" سے واقف تھے اور انہیں یہاں اپنی کامیابیوں کا پورا یقین تھا۔

کشمیر مخصوص جغرافیائی ہیئت کے لحاظ سے برصغیر کے اہم علمی اور تمدنی مراکز سے دور رہنے کی وجہ سے اُن بہت سے داعیوں کی پناہ گاہ رہا ہے جو اپنی تحریکیں خفیہ اور در پردہ چلاتے تھے اور علمی و فکری اصطلاح میں باطنی اور زندیق کہلاتے ہیں۔ خواند امیر کے مطابق جب ایران کے حکمران شاپور بن اردشیر پر مشہور ایرانی زندیق مانی کا مکروفریب ظاہر ہوا اور اس نے مانی کو قتل کرنے کا حکم دیا تو مانی جن جن ملکوں میں روپوش رہا ان میں کشمیر بھی شامل تھا[۱]۔ پروفیسر آرنلڈ کی تحقیق کے مطابق اسلامی دور میں خوفناک اسماعیلی تحریک کے داعی کشمیر بھی آتے تھے اور یہاں فقیروں اور درویشوں کی صورت بنا کر اپنی باطل تحریک کی اشاعت کرتے تھے[۲]۔ عباسی حکومت کی جڑ کاٹنے والے، مسلمانوں کا مزاج وسیع پیمانے پر بگاڑنے والے اور اسلامی ثقافت کے منہل صافی کو مکدر کرنے والے برمکی وزراء کے اسلاف کشمیر کے تربیت یافتہ تھے بلکہ بعض محققوں

۱: تاریخ حبیب السیر فی اخبار افراد البشر، غیاث الدین حسینی معروف بہ خواند امیر، ج ۱، ص ۲۲۷۔

۲: دعوت اسلام (اردو ترجمہ از مولوی غیاث الدین صاحب مرحوم) ص ۲۳۴ تا ۲۳۵، کراچی ۱۹۶۲ء۔

کے نزدیک یہ بھی کشمیر الاصل تھے[۱]۔ یہ سلسلہ آج تک برابر چلا آرہا ہے۔ بیسویں صدی کی ابتدا ہی میں پنجاب میں (ریاست جموں وکشمیر کے دروازے پر) قادیانیت نمودار ہوئی جو اپنی جملہ خصوصیات میں بالوہیت اور مزدکیت کی صدائے بازگشت کے سوا کچھ بھی نہیں ہے اور شروع ہی میں اس کا اہم ترین مرکز کشمیر بن گیا۔ اس تحریک کے داعی بھی اپنے اسلاف کی طرح تقیہ سے بھرپور فائدہ حاصل کرکے کشمیر کی سیاست، تعلیم اور تبلیغ کے میدانوں میں اپنے قدم جماکر قادیانیت پھیلانے میں مصروف ہوئے۔ ان کی مکاری سے بڑے بڑے مخلص لوگوں کو دھوکا ہوا تھا۔ جب ایک مدت کے بعد ان کی ریشہ دوانیاں طشت ازبام ہوئیں، تب یہ لوگ متنبہ ہوئے اور اب اس کی مخالفت پر کمر بستہ ہوئے۔ شیخ محمد عبداللہ نے اعتراف کیا ہے کہ وہ خود اور ان کے رفقا بھی ایک عرصہ کے بعد قادیانیوں کے خفیہ عزائم سے آگاہ ہو گئے تھے[۲]۔ کسی زمانے میں قادیانی مبلغ کشمیر میں اسقدر متحرک ہو گئے تھے کہ اگر علمائے اسلام خاص طور پر محدث العصر حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ وقت پر ان کا مقابلہ نہ کرتے تو یقیناً اس اندھے فتنے نے سارے کشمیر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہوتا۔ آج بھی ضلع اسلام آباد کے کئی دیہات قادیانیت کے اہم مرکز ہیں اور حسن بن صباح کے الموت کی یاد تازہ کرتے ہیں۔

---

[۱]: تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو۔ راقم کی کتاب "کشمیر میں اسلام کی اشاعت" ص ۳۶۔ [۲]: اس کے لئے شیخ صاحب مرحوم کی املا کرائی ہوئی خود نوشت سوانح حیات "آتش چنار" دیکھی جاسکتی ہے۔

دسویں صدی ہجری میں ایران کے صفوی طالع آزما خالص ایرانی ثقافت کی ترویج و اشاعت کا زبردست عزم لے کر نمودار ہوئے تھے اور اس مقصد کے لئے عظیم عثمانی سلطنت سے بھی ٹکر لینے کے لئے پوری تیاری کر رہے تھے۔ ان کا ایک داعی کشمیر بھی وارد ہوا اس کا نام میر شمس الدین صاحب عراقی تھا۔ کشمیر کی تاریخوں کے مطابق وہ یہاں سفیر کی حیثیت سے وارد ہوئے مگر وہ در پردہ پوری رازداری کے ساتھ مذہبی انتشار پھیلانے میں مصروف ہوئے۔ وہ جہاندیدہ اور ہوشیار شخص تھے اس لئے علانیہ اپنے مشن کا اظہار نہیں کیا۔ وہ پہلے شیخ الاسلام بابا اسماعیل کبرویؒ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے۔ اس طرح ایک معزز ترین شخصیت کی پناہ ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ اس کے ساتھ ہی میر صاحب نے مفلوج و بے اثر شاہمیری سلاطین کے بجائے وزراء اور روشن مستقبل کے مالک سیاسی اشخاص سے روابط قائم کئے اور انہیں اپنا عقیدتمند بنانے میں کامیابی حاصل کی۔ ان میں ملک موسیٰ رینہ، ملک عیدی رینہ، ملک محمد ناجی، تاجی چک وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں جو بہت جلد میر شمس الدین عراقی کے جوشیلے حامی بن گئے۔ یہی وہ لوگ تھے جو اُس وقت کشمیر کی وزارت و امارت پر چھائے ہوئے تھے اور نام نہاد سلاطین کوئی حقیقت اور اہمیت نہیں رکھتے تھے۔

میر شمس الدین صاحب نے وزراء اور سیاسی طالع آزماؤں کی پشت پناہی پر اپنی دعوت کا آغاز کیا۔ انہوں نے اس پر نور بخشیت اور محبت اہل بیت کا لیبل چسپاں کیا اور حضرت امیر کبیر

سید علی ہمدانیؒ کے تئیں حسنِ ظن کا اظہار کیا۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے اہلِ بیت کی تعظیم و تمجید اور صحابۂ کرامؓ کی شان میں مداہنت شروع کی۔ انہوں نے کشمیر کے تمام سُنّی مسلمانوں کو باطل پرست قرار دے کر وسیع پیمانے پر ان کی "اصلاح" کا بیڑا اٹھایا کشمیر وارد ہونے کے وقت "حضرت خضرؑ" نے انہیں یہ نصیحت کی تھی، کہ:

مردم مخالف جاہل وارباب مذاہب باطل وجماعتِ متعصبان کوردل را بمذہب ائمہ معصومین ہدایت نمود[1]	جاہل لوگوں، جھوٹے مذاہب کے ماننے والوں اور اندھے دل متعصّب جماعتوں کو ائمہ معصومین کے مذہب کی طرف رہنمائی کرنی چاہیئے۔

حضرت خضرؑ نے انہیں یہ بھی نصیحت کی تھی کہ وہ کشمیر کے جملہ مسلمانوں کو، چاہے وہ حنفی ہوں یا شافعی اپنا مذہب چھوڑنے اور "ائمہ" کا مذہب اختیار کرنے کی طرف مائل کریں[2]

میر شمس الدین صاحب عراقی نے اپنے آپ کو "مامور و مبعوث" کی صورت میں پیش کیا۔ انہوں نے اپنی تصنیف "احوط" کے پیش لفظ میں ہی دعویٰ کیا کہ خدا نے انہیں پہلے اُمتِ محمدیہؐ کے اختلافات دور کرنے پر مامور کیا ہے۔ اور اس کے بعد دوسرے مذاہب کے نزاعات

---

۱ : خلاصۃ المناقب (قلمی) نسخہ شعبۂ تحقیقات و نشریات، ریاست جموں و کشمیر سرینگر۔

۲ : ایضاً۔

ختم کرنے کے لئے بھیجا ہے۔[1] انہوں نے سب سے پہلے کشمیر کے تمام مسلمانوں کو گمراہ، فاسق و فاجر، سنگ دل، کور دل، جھوٹے مذاہب کے پرستار قرار دے کر تبلیغ کا کام شروع کیا، پھر اس کے ساتھ ہی تمام سُنّی علماء اور مشائخ کی کردار کشی اور ان سے انتقام گیری کی مہم شروع کی۔ جس کا واحد مقصد یہ تھا کہ عوام کی عقیدت اُن سے اُٹھ جائے اور وہ سرگرداں ہو کر ایک "نئے مرکز" کی طرف رجوع کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ انہوں نے خانقاہوں کا انہدام بھی شروع کیا جو اُس وقت سینکڑوں سال سے کشمیر میں ملّتِ بیضا کیلئے مضبوط قلعوں کی حیثیت رکھتی تھیں۔ اگرچہ وہ اس مہم میں زیادہ کامیاب نہیں ہوئے تاہم خانقاہ معلّٰی منہدم کرنے میں ضرور کامیاب ہوئے۔ اُدھر اس تاریخی خانقاہ اور بقعۂ مبارک کا انہدام شروع ہوا اور اِدھر جڈی بل میں ایک دوسری "خانقاہ" کی تعمیر تیزی سے شروع کی گئی۔ جہاں میر شمس الدین صاحب اپنے معتقدین کی تربیت اور راہنمائی کرتے تھے۔ انہوں نے اس خانقاہ کو کعبۃ اللہ کے ہم مرتبہ ہونے کا فتویٰ دیا اور اپنے مُریدوں سے اس کا "حج" و طواف کروانے لگے۔

میر شمس الدین صاحب کی جابرانہ تبلیغ سُنّی مسلمانوں تک ہی

---

[1]: سراج الاسلام، مطبوعہ مطبع اعجازی مصر ۱۳۳۲ھ، پروفیسر مولوی محمد شفیع صاحب لاہوری مرحوم کی تحقیق کے مطابق سراج الاسلام ہی میر شمس الدین عراقی کی "فقہ احوط" ہے جو عرصہ دراز تک معدوم تھی۔ یہ کتاب ۱۵ ابواب ۶۲۰ صفحات پر مشتمل ہے۔

محدود نہیں رہی بلکہ اس کی زد میں کچھ غیر مسلم بھی آ گئے۔ چونکہ اُن کی مہم اشاعت اسلام کے نام پر تھی۔ اس لئے اسے صحیح ثابت کرنے کے لئے کچھ مندروں پر بھی ہاتھ اُٹھانا ضروری بن گیا تھا۔ اُن کے عقیدت مند سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ مندروں پر ہاتھ اُٹھانے کی وجہ یہ تھی کہ ان لوگوں نے سلطان زین العابدین کی ہندو نوازی سے ناجائز فائدہ اُٹھایا تھا۔ وہ مسلمانوں کے شعائر کی تضحیک کرتے یہاں تک کہ قرآنِ حکیم کی بے حرمتی کرنے میں بھی بے باک ہو گئے تھے۔

در وقتِ عبادتِ اصنام و	یہ لوگ یعنی کشمیر کے ہندو
بُت پرستیہا قرآنِ مجید و	بتوں کی پرستش کے وقت
فرقانِ حمید را سی کرسی ساختہ	قرآن پاک سرہون کے نیچے رکھا
زیرِ سرین گرفتہ[1]	کرتے تھے۔

مگر کسی بھی مستند تاریخ سے اس کی تائید نہیں ہوتی ہے۔ اس کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ ان بخشی مورخوں نے اپنے میرزں کی جبر واکراہ کی روش جائز قرار دینے کے لئے صرف ایک بہتان تراشنے کی کوشش کی ہے۔ اگر میر صاحب عراقی کی مندر شکنی کی صورت وہی ہوتی جس کا ان کے معتقدین نے ذکر کیا ہے تو اس وقت کے ہندو مورخوں نے اس کا ضرور اپنی تاریخوں میں شکوہ کیا ہوتا۔ مگر وہ بالکل خاموش ہیں، اور صرف مسلمانوں کے باہمی سر پھٹول اور فرقہ واریت پر پھٹتے نظر آتے ہیں[2]۔

---

[1] بہارستانِ شاہی: (قلمی)

[2]: Rajtarangini, Sirkar; Tr. Dutt. P. 403

مرزا حیدر دوغلات اور نوربخشیوں کا استیصال

میر شمس الدین صاحب عراقی چکوں کے کے دورِ وزارت ہی میں انتقال کر گئے انہوں نے اپنی زندگی ہی میں اپنے بیٹے میر دانیال کو جانشین بنایا تھا۔ اب ان کا مشن ان کے عقیدت مند مبلغ آگے بڑھانے میں مصروف ہوئے۔ اُنہیں اُن وزیروں کی بے پناہ پشت پناہی حاصل تھی، جنہوں نے دِل و جان سے نوربخشیت اختیار کی تھی جن میں سرفہرست موسیٰ رینہ تھا جو مملکتِ کشمیر کا وزیراعظم بھی بن گیا تھا۔

میر شمس الدین صاحب عراقی کی مخالفت شروع ہوئی اور ان کے خلاف پورے کشمیر میں نفرت اور عداوت کی آگ پھیل گئی، چونکہ نوربخشی وزراء ہی ملک کے اصلی حکمران تھے اس لئے عوام کی مخالفت سودمند ثابت نہیں ہوئی۔ اتنے میں سیاسی اور انتظامی سطح پر نوربخشی وزراء کی مخالفت، جو پہلے سے موجود تھی، تیز ہوئی اور اقتدار کوش سیاستدانوں نے مذہب کی آڑ میں نوربخشی وزراء کی ٹانگیں کھینچنا شروع کیں۔ ان میں سب سے آگے بیہقی سادات تھے جن کا شروع سے ہی کشمیر کی سیاست اور امارت میں بڑا دخل تھا، مگر پورے ملک پر چند نوربخشیوں کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ بیہقی سیاستدانوں کی مخالفت مکمل طور پر رائیگاں گئی۔ جب میر سید محمد بیہقی نے مفلوج سلطان محمد شاہ سے مل کر نوربخشیوں کی سرگرمیوں پر روک لگانے کی کوشش کی تو ایک ہی نوربخشی کھلنڈر موسیٰ رینہ نے دونوں کے خلاف ایک کامیاب منصوبہ بنایا، چند

دنوں میں ہی سلطان محمد شاہ اپنی برائے نام سلطنت اور میر سید محمد بیہقی اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

کشمیر میں عام نوربخشیوں بالخصوص چک وزراء کا مذہبی جبر و قہر اور عوام کا اُن کے تئیں بغض و نفرت کے جذبات عروج پر تھے کہ کاشغر کا مرزا حیدر دوغلات کچھ مغل سپاہیوں کے ساتھ کشمیر وارد ہوا۔ اُس نے حالات اپنے موافق دیکھے اور واپس جاکر کچھ ہزار سپاہی اپنے ساتھ لاکر آناً فاناً کشمیر پر قبضہ جمایا۔ گو اس نے مفلوج شاہمیری حکمران کی اقتدارِ اعلیٰ کی حیثیت برقرار رکھی مگر عملاً وہی کشمیر کی سیاست اور انتظامیہ پر چھا گیا۔ نوربخشی سیاستدان روپوش ہو گئے۔ اُس نے اپنے مخصوص مزاج کے مطابق نوربخشیوں کا قتلِ عام شروع کر دیا۔ اُن میں جو مر گئے تھے کاشغری ترکوں نے ان کی قبریں اکھاڑ دیں، بہت سے لوگوں کو جسمانی اذیتیں پہنچائیں۔ اس انتقام گیری سے نوربخشی سہم کر رہ گئے۔ سرکردہ نوربخشی روپوش ہوئے اور باقی نوربخشیوں نے نوربخشیت سے تائب ہونے کی نمائش کی۔ مرزا حیدر نے ابدال ماگرے اور ریگی چک دو سرکردہ آدمیوں کے ہاتھ میر شمس الدین عراقی کی کتاب "فقہ الاحوط" ہمایوں کے درباری علماء کے پاس ارسال کی اور ان سے مؤلف اور اس کے عقائد کے بارے میں فتویٰ طلب کیا۔[1] اس فتویٰ پر مرزا حیدر نے اس سختی سے عمل کیا کہ نہ صرف بربریت

---

[1] مرزا حیدر نے خود اس کی تفصیل اپنی علمی اور تاریخی تصنیف "تاریخ رشیدی" میں درج کی ہے۔

کی ایک دوسری روایت قائم ہوئی بلکہ خود مرزا حیدر کی زندگی اور اس کی حکومت کے خاتمے پر منتج ہو گئی۔ کئی سرکردہ سُنّی مورخوں نے جہاں مرزا حیدر کی بہت سی تعمیری خدمات کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے وہاں اس کی انتقامی کارکردگی پر بھی اظہار افسوس کیا ہے۔

مرزا حیدر کاشغری کا زوال مرزا حیدر کاشغری دس سال سے زیادہ مدّت تک کشمیر کا عملی حکمران (Defacto Ruler) رہا۔ اس دوران اس نے بہت سے تعمیری کام انجام دیئے۔ وہ صاحبِ علم اور کسی حد تک باعمل حکمران تھا۔ وہ کٹر سُنّی اور فقہ حنفی کا پیرو مسلمان تھا اور اس نے کشمیر میں بھی طاقت کے زور سے اس کی آبیاری کی، اس کے لئے اس نے اُن تمام عناصر کو کچل دیا جو مسلک اہلِ سُنّت والجماعت کی مخالفت کرتے تھے تاہم اس نے یہاں طاقت کا بے جا استعمال بھی کیا۔ اسی طرح اُسے اہلِ کشمیر کی فطرت بھی سمجھنے میں غلطی ہوئی اور یہ چیز مل کر اس کے زوال کا باعث بن گئیں۔ مزید برآں اس کے ساتھ جو کاشغری مغل کشمیر وارد ہوئے تھے وہ کشمیر کے مسلمانوں کے لئے بڑی مصیبتوں کا باعث بن گئے تھے۔ یہاں کی عورتوں اور بوڑھوں پر ان کی دست درازیاں عام ہو گئیں تھیں۔ یہ لوگ یہاں دندناتے پھرتے تھے اور مرزا حیدر انہیں لگام دینے میں کامیاب نہیں ہوا بلکہ بعض اوقات وہ ان ترکوں کا ہی پاس و لحاظ کرتا تھا۔ اس سے مملکت کے نظم و نسق پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑنے لگی۔

مرزا سعد اللہ نے اپنی منظوم تاریخ میں اس افسوسناک صورتِ حال کا ان اشعار میں ذکر کیا ہے:

نیز بہ عورت دگر ضعفاء | ورثۂ ترکاں بعنف گشت ادا
بہ تطاول دراز دست شدند | زاں رعایا ستودہ دست شدند
خواستند داد اگرچہ مردم زار | حاکم اصلا نگشت گوش گزار
پاسِ ترکانِ خود نمود بسی | در رعایا نخورد ہیچ غمی
کثرتِ مردمانِ کاشغری | کرد در دیدہ اش چو جلوہ گری[1]

اس قسم کی ساری غلط کاریوں سے اس کے چھپے دشمنوں کو دوبارہ منظرِ عام پر آنے کا موقع مل گیا۔ خود مرزا حیدر کا سپہ سالار ایک عیدی رینہ بھی انہی سے مل گیا۔ ان لوگوں نے پہلے آتش زنی اور غارتگری سے مملکت کا نظم و نسق درہم برہم کیا، پھر مرزا حیدر کی فوج پر شبخون مارنے لگے۔ ایسے ہی ایک شبخون میں وہ مرزا حیدر پر تیر پھینکنے میں کامیاب ہوئے، مرزا حیدر اس سے فوت ہوا۔ دشمنوں کی یلغار اتنی سخت تھی کہ وہ اس کی لاش کا مثلہ کرنے کے درپے ہوئے مگر مرزا حیدر کے حامی کچھ سرکردہ سیاسی اور مذہبی شخصیتوں نے اس کی لاش اپنے قبضہ میں لے کر اسے مثلہ کرانے سے بچا لیا۔

مرزا حیدر کے انتقال کے ساتھ ہی اقتدار کوشوں کی دوڑ دھوپ شروع ہوئی۔ چک اور رینہ خاندان سے تعلق رکھنے والے سرکردہ لوگ میدان میں آئے اور ایک دوسرے کو پچھاڑنے میں مصروف

---

[1] : باغِ سلیمان (قلمی)۔

ہوئے مگر ان سب میں چک خاندان سے تعلق رکھنے والے طالع
آزما ساری مزاحمتوں کو روندتے ہوئے اقتدار حاصل کرنے میں
کامیاب ہوئے۔ اس وقت سلطان حبیب شاہ کشمیر کا مفلوج و مجبور
سلطان تھا۔ چکوں نے بڑی ذلت سے اس کے سر سے تاج سلطنت
اُتارا اور اپنے ایک سرکردہ اور بہادر سیاستداں غازی خاں
کے سر پر رکھا۔ اس کے ساتھ ہی شاہمیریوں کی برائے نام سلطنت
کا بھی خاتمہ ہوا اور چک کشمیر کے مستقل حکمراں ہوئے۔

چک سلطنت کا قیام اور امامیہ مذہب کی ترویج و اشاعت

چکوں کو کشمیر پر مستقل سلاطین کی حیثیت سے ۳۲ سال حکومت
کرنے کا موقعہ ملا۔ یہ تقریباً سب کے سب میر شمس الدین صاحب عراقی
کے معتقد تھے۔ اتفاق سے میر صاحب اور ان کی دعوت کے داعی
تقریباً سب کے سب کسی خاص علمی صلاحیت کے مالک نہیں تھے وہ
قدیم باطنی داعیوں کی طرح طاقت و قوت حاصل ہونے پر جبر و اکراہ
سے اپنا مشن عام کرتے تھے اور جہاں طاقت ملنے کی صورت نظر
نہیں آتی تھی تو سینہ بسینہ اور چھپ کر اسے پھیلاتے تھے۔ میر صاحب
اور ان کے رفقاء نے بھی کشمیر میں یہی طریقہ اپنایا۔ انہوں نے یہاں
کسی ٹھوس بنیاد پر اپنے مشن کی بنیاد نہیں رکھی۔ جب میر صاحب
عراقی کے انتقال کے فوراً بعد مرزا حیدر کاشغری نوربخشیوں پر قہر الٰہی
بن کر نازل ہوا تو ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ کشمیر کی سرزمین سے
نوربخشیت کا نام تک مٹ جائے گا مگر جب مرزا حیدر کے انتقال کے
بعد حکومت پر چک غالب آئے تو نوربخشیت کی نشأت و نہضت

اس طرح ہوئی کہ آج تک کوئی طاقت اسے ختم نہیں کر سکی۔

میر شمس الدین عراقی کا جو مشن تھا وہ اگرچہ مختلف عناصر کا ملغوبہ تھا، تاہم اس میں شیعیت کا عنصر سب پر غالب تھا جس کا جزوِ اعظم محبت اہل بیت اور تبرائے صحابہ تھا۔ چک حکمرانوں نے اسی ایک عنصر کو آگے بڑھایا۔ اس طرح میر صاحب عراقی کی تحریک امامی تحریک میں ضم ہو گئی اور اس کی انفرادیت ختم ہو گئی۔ صرف لداخ اور بلتستان میں کچھ لوگ ابھی نوربخشی کہلاتے ہیں۔ انہیں کئی مسائل میں امامیہ شیعوں سے اختلاف بھی ہے۔ غرض کشمیر کے نوربخشی اب اثنا عشری بن گئے۔ فقہی مسائل میں انہوں نے کبھی کشمیر کے کسی عالم کو لائقِ اعتنا نہیں سمجھا بلکہ وہ ایران، عراق اور ہندوستان کے سرکردہ شیعہ علماء کی طرف رجوع کرتے تھے۔ اور انہی پر اعتماد کرتے تھے یہ سلسلہ برابر آج تک جاری ہے۔ آج کشمیر کے شیعہ حضرات کے مرجع دو ہیں۔ ایران کے روح اللہ خمینی اور عراق کے آیت اللہ خوئی ـــــ

غازی خان چک سلطنت کا پہلا حکمران ہوا۔ وہ بڑا بہادر اور غیور حکمران تھا۔ اس نے کشمیر میں منظم طریقے سے رفض، تشیع کی اشاعت کا بیڑا اُٹھایا۔ مؤرخ حسن لکھتے ہیں:

مذہب شیعہ را رواج کلی بخشید و فرقہ اہل سُنت را تکلیف ترک مذہب نمود" (تاریخ حسن)	اس نے شیعہ مذہب کو رواج دینے میں پورا زور صرف کیا۔ ہندوؤں اور سُنی مسلمانوں کو اپنا مذہب چھوڑنے پر مجبور کیا۔

اس نے فارسی کی ترویج میں بے حد دلچسپی لی یہاں تک کہ سکوں پر بھی فارسی عبارت ہی کندہ کرانے کا حکم دیا۔

..... جمیع درویشان و صوفیانِ آں سلسلہ در رسوم قواعدِ ہمدانیہ و شرائطِ آدابِ طریقۂ نوربخشیہ باز زندہ ساخت [1]	اس نے ہمدانی سلسلہ کے تمام درویشوں اور صوفیوں، اس کے قواعد و شرائط اور نوربخشی طریقہ کے آداب و رسوم کو از سرِ نو زندگی بخشی۔

اس دور میں اُن علماء کو چن چن کر قتل کیا گیا۔ جو مذہب اہلِ سُنت والجماعت کے دفاع میں کوئی کوشش کرتے تھے یا جنہوں نے مرزا حیدر کے زمانے میں نوربخشیوں کے خلاف مرزا کی مدد کی تھی۔ علامہ مفتی فیروز ستر سال کی عمر میں حسین شاہ چک کے عہدِ حکومت میں شہید کیے گئے [2]۔ سید حمید کو غازی چک نے بانجی دیرہ میں قتل کرایا ان کی نعش سر کے بغیر دفنائی گئی۔ سید منصور صاحب کو موسیٰ رینہ اپنی مدار المہامی کے زمانے میں ہی قتل کر چکا تھا۔ مولانا سید کمال، سید حسین خوارزمی اور محدث شمس الدین الماس (تلمیذِ رشید مفتی فیروز) بے دردی سے قتل کئے گئے [3]۔ خواجہ فاضل شاہو کو غازی خان کے حکم سے زہر دے کر مار اگیا

آخر از حکم شاہ غازی خان گشت مسموم آں رفیع الشان [4]

---

[1]: تاریخ بہارستانِ شاہی (قلمی) [2]: تاریخ اعظمی۔ [3]: ایضاً
[4]: باغ سلیمان (قلمی) سعد اللہ شاہ آبادی۔

جن کا "جرم" ہلکا ثابت ہوتا تھا، انہیں صرف جسمانی اذیتوں کی سزا دی جاتی تھی۔ یہ سزائیں، ہاتھ پیر کاٹ ڈالنے، آنکھوں کا حلقوں سے نکالنے یا آنکھوں میں گرم سلائیاں پھیلا کر نابینا کر دینے کی قسم کی ہوتی تھیں۔ شیخ یعقوب صیرفی کو اُن کے جسم سے دائیں ٹانگ اور بایاں بازو جدا کیے گئے۔ انہوں نے بقیہ عمر کتابت اور عبادت میں گزاری[1]

قدیم شاہمیری سلاطین نے بہت سارے علماء کو مدارس اور خانقاہوں کے مصارف پورا کرنے کے لئے بڑی بڑی جاگیریں دی تھیں۔ اب چک حکمرانوں نے انہیں ان سے محروم کیا۔ اس کا مقصد علماء کو تلاشِ معاش میں پریشان رکھ کر ان کی علمی مجلسوں اور تربیتی اداروں کو مفلوج کرنا تھا۔ ان کا یہ مقصد سچ مچ پورا بھی ہوا۔ چنانچہ بہت جلد مدرسے اور خانقاہیں بے رونق ہونے لگیں اور علمائے کشمیر نے جوق در جوق وطن کو خیرباد کہنا شروع کیا۔

چوں بعد از وفات حضرت	حضرت بابا اسماعیلؒ کے
بابا اسماعیل فتنہ مذہب	انتقال کے ساتھ ہی جب مذہبی
قوی گشت۔ حکام ایں دیار	فتنہ پوری قوت کے ساتھ
از راہِ حق عنان برگرداندہ	ابھر گیا تو یہاں کے حکمران
در ایذائے بزرگاں سعی	حق و صداقت سے ہاتھ دھو
کمر دن گرفتند ازاں جہت	کر بزرگان دین کو تکلیف

[1] اعظمی

اکثر بزرگاں رختِ اقامت
از بیں دیار برکشیدند در
اطراف و اکناف ساکن
شدند ۱؎

پہنچانے کی کوشش میں لگ گئے
اس کے نتیجے میں اکثر بزرگوں نے
کشمیر سے ہجرت کی اور وہ ہندوستان
کے مختلف علاقوں میں سکونت
پذیر ہونے لگے ۔

اس منتقمانہ ذہنیت کا سب سے زیادہ افسوسناک پہلو یہ تھا کہ نوربخشی عوام چک حکمرانوں کی پشت پناہی حاصل ہوتے پر مشائخ اور صوفیائے وقت کے حق میں بڑے گستاخ اور بے باک ہو گئے وہ جہاں اور جس طرح چاہتے ان کی تذلیل کرتے تھے۔ اس دور کے ایک قابلِ اعتماد بزرگ اور عالم علامہ شیخ داؤد خاکی" (مرید ارشد حضرت سلطان العارفین شیخ حمزہ کشمیری رح) "اہل مداہنت" کی حیا سوز بے باکی و گستاخی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

چوں اہلِ مداہنہ حاکم شدند
اظہار مداہنت خود کردند و
آں شیخانِ بے فراست
را ایذائے بسیار مے رسانیدند
و در بعضے اوقات کہ ضیافت
کردہ بودند آنرا رشوت نام
کردند اضعافاً مضاعفۃً

جب اہلِ مداہنہ کشمیر کے حکمران
ہوئے اور کھل کر اپنے باطن
کا اظہار کرنے لگے تو انہوں نے
سادہ لوح علماء کو سخت تکلیفیں
پہنچائیں۔ اگر کسی وقت انہیں
کھانے پر بلایا ہوتا تھا تو
اب اس کا نام رشوت کر دیا اور

۱؎ خوارق السالکین ۔

باز طلبیدند، بمقابلہ آں چاپلوسیہا دشنام دنا سزا روبرو گفتند [1]

اس طرح اس کا دوچند ادا کرنے کی مانگ کی۔ اگر کبھی انکی تعریف و خوشامد کی تھی تو اب روبرو گالیاں سُنا کر ان کا معاوضہ چکایا۔

تذلیل و استہزاء کی یہ گرم بازاری دیکھ کر بہت سے علماء اور مشائخ پہاڑوں اور ویرانوں کی پناہ لینے لگے۔ کچھ بزرگوں نے ویران خانقاہیں آباد کیں، اور ہجرت کا سلسلہ بھی برابر جاری تھا اس طرح جو ملک دو سو سال تک بیرونی ممالک کے علماء اور صوفیاء کا مرکز ثقل بنا ہوا تھا، اب خود ویرانی کا منظر پیش کرنے لگا۔ حضرت شیخ یعقوب صرفیؒ نے، جو اسی دور کی یادگار تھے، اپنی مایہ ناز عربی تفسیر کے مختصر سے پیشِ لفظ میں اس دور کے حالات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے:

وساءُ حالی تفرّق بالی بحوادثِ الأعصار و الأزمان وتباعدِ البلدان وبنو الأوطان عنّی حتّی أحرّر صفحةً منه بالکشمیر وصفحاً آخر بالهند۔ [2]

زمانے کے حادثات اور وطن اور اہلِ وطن سے دُور رہنے کے باعث میری حالت خراب ہو گئی۔ دل پراگندہ ہوا یہاں تک کہ میں اس تفسیر کا ایک صفحہ کشمیر میں اور دوسرا صفحہ ہندوستان میں لکھ رہا ہوں۔

۱: دستور السالکین ص ۲۱۸ ۲: مطلب الطالبین فی تفسیر کلامِ ربّ العالمین (قلمی)

ارباب سیاست و حکومت اور رسمی علماء کی خامیاں

میر شمس الدین صاحب عراقی کی تحریک کو مختلف طبقوں سے مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ مگر یہ تحریک نور بخشی داعیوں کی چالاکی اور حکمرانوں کی ننگی پشت پناہی سے پھیلتی گئی۔ سیاسی سطح پر مرزا حیدر، دو غلات اور بیہقی سادات نیز کچھ دوسرے سُنّی وُزراء نے اس کا خاتمہ کرنے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں اُن کی اپنی جانیں تو تلف ہوئیں مگر وہ اس تحریک کا مکمّل استیصال نہیں کر سکے۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ان سیاستدانوں کا بنیادی مقصد اقتدار حاصل کرنا تھا اس میں شک نہیں ہے کہ مرزا حیدر راسخ العقیدہ سُنّی حنفی مسلمان تھا بایں ہمہ وہ ان کمزوریوں سے محفوظ بھی نہیں تھا، جو اقتدار کوش سیاستدانوں میں ہوتی ہیں۔ اس نے قتل و غارت گری اور آباد بستیوں کو نذر آتش کر کے کشمیر کی فضا مسموم کی۔ اس کی بربریت سے پورا کشمیر سہم گیا۔ وہ اگر چاہتا تو "حکمت و موعظت" پر عمل کر کے دعوت و تبلیغ کا سلسلہ شروع کرتا۔ وہ سلطان محی الدین اورنگ زیب جیسا سخت باعمل بھی نہیں تھا۔ وہ معتدل اور مصالحانہ طریقۂ کار اپنا کر سادہ لوح نور بخشیوں کو راہِ راست پر لا سکتا تھا، وہ ہمایوں کا رشتہ دار اور مقرب مشیر تھا اور ہمایوں نے ہی شاہ طہماسپ جیسے شیعہ حکمران کی پناہ حاصل کی تھی۔ مگر بد قسمتی سے یہاں مرزا حیدر کا مقصد احیاءِ سُنّیت کے ساتھ ساتھ حصول اقتدار اور سیاسی حریفوں کا استیصال بھی تھا، اس لئے فائدے پہنچانے کے ساتھ ساتھ نقصانات کا بھی باعث بن گیا۔ تقریباً یہی حال بیہقی

سادات کا بھی تھا۔ انہوں نے بھی بلا شبہ نوربخشیوں کا مقابلہ کیا مگر نوربخشی وزراء اور اہلِ سیاست کے آگے بُری طرح مغلوب ہوئے ان میں میر سید محمد بیہقی، میر شمس الدین صاحب عراقی کی دختر سے شادی کرنا چاہتے تھے جب اس کے لئے انہیں پیغام دیا تو میر صاحب عراقی نے اسے نامنظور کیا تھا۔ اس سے بھی صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اہلِ سیاست مذہب کی آڑ میں مختلف مقاصد حاصل کرنا چاہتے تھے مگر قانونِ قدرت کے مطابق کسی بھی مقصد میں پوری طرح کامیاب نہیں ہوئے۔ جہاں تک علمائے وقت کا تعلق ہے تو ان میں جو لوگ رسمی اہلِ علم تھے وہ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر حالات کا نظارہ کرتے تھے۔ بالخصوص وہ لوگ جو جاہ و حشم اور نمود و نمائش نیز دوسرے دنیوی منافع کے قیدی تھے انہوں نے سکوت اختیار کیا تھا جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس زمانے میں کشمیر اس قسم کے اہلِ علم سے خالی تھا وہ غلطی پر ہیں۔ اس عہد کے ممتاز فاضل حضرت بابا داؤد خاکی رح نے بڑی خوبی کے ساتھ دراصل اپنے ہی دور سے تعلق رکھنے والے اس قسم کے علماء کی پردہ دری کی ہے۔

فتویٰ و درس و قضا فی انفسہٖ خوبست لیک
فتنہ گردد چوں بدستِ مردِ بدگوہر فتادست
چارہٴ دفعِ ربا حرفی نہ معمولِ فقیہہ
حیلہٴ اخذِ ربا صد باب چوں فرفر شداست
نیست عالم آنکہ بہر رشوت و الزامِ خلق
حیلہ ہائے نادرش محفوظ و مستحضر شداست

لہ: تحفۃ الاحباب (قلمی)

نیست عالم آنکہ غافل گشتہ از روزِ حساب
طالب و طامع باوقاف و زر و زیور شد است[۱]

ترجمہ: ۔ "فتویٰ دینا، تعلیم پڑھانا اور قاضی بن کر فیصلہ دینا بذاتِ خود ٹھیک ہے۔ مگر جب یہ چیزیں فتنوں کا باعث بن جائیں تو یہ ان لوگوں کے بدگوہر ہونے کا ثبوت ہے کیا اُسے بھی فقیہہ کہہ سکتے ہیں جسے ریاکاری کے عواقب کا کچھ بھی علم نہ ہو اور جب سود کھانے کا موقعہ ہاتھ آئے تو تو اس کے حق میں بڑی بڑی کتابیں زبانی سنائے۔ اُسے ہم عالم نہیں کہہ سکتے جسے رشوت لینے اور بندگانِ خدا کو ملزم ٹھہرانے کے لئے عجیب و غریب بہانے زبانی یاد ہوں وہ شخص بھی صحیح معنوں میں عالم کہلانے کا مستحق نہیں ہے جسے روزِ حساب کی کوئی فکر نہ ہو اور اسی بے فکری کے عالم میں زر و زیور اور وقف کی چیزیں کھانے پر حریص ہو"۔

دراصل حضرت خاکی رحہ نے یہ خامیاں اپنے ہمعصر علمائے میں دیکھی تھیں۔ وہ حضرت شیخ حمزہ رحمتہ اللہ علیہ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہونے سے پہلے خود بڑے دنیاوی جاہ و حشمت کے مالک تھے، اس لئے دنیا پرست علمائ کی خامیاں آسانی سے مشاہدہ کر چکے تھے۔

علمائ کا ایک دوسرا طبقہ مصالحت کا قائل تھا۔ وہ شیعہ اور سُنی فرقہ پرستوں میں بے اعتدالی پاتے تھے، اور دو فرقوں کو

---

[۱] خود دالمید ۱۰۲

قریب لانے کے متمنی تھے۔ چنانچہ ان میں سے کچھ اہلِ علم تفضیل کی طرف مائل ہوئے۔ مشہور مدرس حافظ مُلا بصیر کے بارے میں ایک معتمد نوربخشی اہلِ قلم نے لکھا ہے کہ وہ میر شمس الدین عراقی کے عقیدت مند اور اُن کے مقلد ہو گئے تھے۔ سُنی مؤرخوں نے اگرچہ اس کی تردید کی ہے مگر انہی سُنی مؤرخوں کی تاریخوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کے چند ممتاز ترین شاگرد ان سے بدظن ہو گئے تھے یہاں تک کہ انہوں نے ان کی درسگاہ میں آنا ہی چھوڑ دیا۔ اسی طرح ایک اور عالمؒ جو مولوی حاجی کے عرف سے مشہور تھے اور جو اپنے وقت کے بے نظیر خطیب تھے وہ بھی تشیع سے متہم تھے۔ مرزا حیدر نے انہیں قتل کیا تھا اور اکثر سُنیوں کو یہ ناگوار گزرا تھا۔

جب اُس وقت کے حالات کا ٹھنڈے دل و دماغ سے جائزہ لیا جاتا ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب میر شمس الدین عراقی اور اُن کے مشن کے داعیوں نے مداہنت اور تبرائے صحابہ کی بدعتِ سیئہ کشمیر میں رائج کی تو اہلِ سُنت والجماعت کی طرف سے بھی خطرناک ردِ عمل ظہور پذیر ہوا تھا۔ بہت سے سُنی بھی اپنے مخالفوں کے عقائد کی تذلیل و تضحیک سے اپنے مشتعل جذبات کو تسکین دیتے تھے۔ اس کی جو مہیب صورت نمودار ہوئی تھی، وہ میر صاحب عراقی کی لائی ہوئی بدعت سے کچھ کم نہیں تھی۔ اس دور کے مشہور مدرس اور مصنف مولانا سلیمان کشمیری ــــــ جو مولانا ابوالفتح کلو مؤلفِ "سیف التابلین" کے نامور فرزند تھے ــــــ نے خلفائے راشدین، صحابہ کرام اور اہلِ بیتِ اطہار کے مناقب میں

عربی زبان میں ایک نہایت ہی مختصر رسالہ لکھا ہے۔ ان سے قبل اُن کے نامور والد اہل مداہنت کی تردید میں سیف السابلین کے نام سے ایک مستقل کتاب لکھ چکے تھے۔ مولانا سلیمان نے اپنے رسالے کے پیش لفظ میں صاف الفاظ میں لکھا ہے۔ کہ "اگر ایک طرف اہل مداہنت سبِّ صحابہ جیسی بدعت کا ارتکاب کر رہے ہیں، تو دوسری طرف کچھ سُنّی بھی اہل بیتِ اطہار کی شان میں بدذہنی پر اتر آتے ہیں۔" لکھتے ہیں:

لما کثرُ فی زماننا هذا اهل البدع والاهواء ناقصوا الآراء والافکار فاضلوا کثیرا وضلوا عن سواء السبیل بعضهم مفرطون فی حُبِّ علی کرم اللهُ وجهه حتیٰ انکروا خلافتہ غیرہٖ و بعضهم مفرطون فی بغضہٖ حتیٰ انکروا فضائل سائر اهل البیت والعیاذ باللہِ اساٗ صلهم الله بقهرہٖ۔[۱]	ہمارے زمانے میں اہلِ بدعت کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے اور اس سے افکار و خیالات متنزلزل ہونے لگے۔ یہ لوگ خود بھی راہِ ہدایت سے دور ہوئے اور بہت سارے لوگوں کو بھی گمراہ کر دیا۔ ان میں کچھ لوگ حضرت علی کرّم اللہُ وجہہ کی غیر معتدل محبت میں مبتلا ہو کر دوسرے خلفاء کی خلافت سے انکار کر بیٹھے اور کچھ لوگ اس کے نتیجے میں تمام اہل بیت کے فضائل سے ہی انکار کرنے لگے خدا کی پناہ خدا ان لوگوں کو اپنے قہر سے نابود کرے۔

[۱] : مناقب الصحابة (قلمی)۔

مؤلف مرحوم نے اس رسالے میں اس بات کا التزام کیا ہے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے مناقب میں صرف وہ روایات پیش کی ہیں جو اہل بیت سے مروی ہیں۔ اسی طرح اہل بیت رضی اللہ عنہم کی شان میں وہ وارد شدہ حدیثیں نقل کی ہیں جو صرف خلفائے راشدین اور دوسرے اجلۂ صحابہ کی سندوں سے ہم تک پہنچی ہیں۔ اس طرح انہوں نے حقیقی احیائے سُنیّت کا حق ادا کرنے کی کوشش کی۔

غرضیکہ یہی وہ افراط و تفریط کی خوفناک فضا تھی جس نے متعدد سُنی علماء کو "تفضیل" کی طرف بھی مائل کیا تھا مگر ان کی کوششوں کا بھی کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا تھا۔ اہل مداہنت نے اقتدار کے نشے میں آکر اسے اپنی کامیابی اور علمائے اہل سُنت کی کمزوری پر محمول کیا تھا اور وہ اپنے عقائد و افکار کی اشاعت میں زیادہ بے باک ہو گئے تھے۔ انہی مصالحت پسند علماء کو علامہ داؤد خاکی رحمۃ اللہ علیہ نے "شیخانِ بے فراست" سے یاد کیا ہے۔[1]

مشائخ اور صوفیائے کرام کی کامیاب مدافعت

اہل سیاست اور رسمی علماء کے علاوہ ایک اور طبقہ بھی تھا جس نے سیاسی محضوں سے دامن بچا کر اور مناظرہ بازی سے ہٹ کر ان کوششوں کی خوفناک یلغار کا مقابلہ کیا۔ یہ اولوالعزم صوفیاء اور مشائخ کا طبقہ تھا جو اگرچہ علم میں کسی سے کم پایہ نہیں تھا مگر علم کو پیشہ بنانے سے اجتناب کیا تھا۔ انہوں نے خاموش وعظ و تبلیغ اور ارشاد و تربیت کے ذریعہ اس سیلاب کے خلاف مضبوط بند باندھا۔ انہوں نے

---

[1] دستور السالکین، ص ۲۱۸، مطبوعہ لاہور۔

شہروں اور دیہاتوں میں جاکر سادہ لوح مسلمانوں کا ایمان و یقین سنبھالا۔ ان میں سرِ فہرست شیخ الاسلام بابا اسماعیل کبرویؒ تھے۔ جنہوں نے سب سے پہلے میر شمس الدین عراقی کے عقائد کی قلعی کھول دی۔ اور اس طرح ان کے حریفِ اوّل ٹھہرے۔ وہ اگرچہ بلند پایہ عالم اور علماء کے سرپرست تھے مگر ہمیشہ خانقاہی زندگی آخری دم تک اپنائی۔ ان کے کچھ حالات آگے ان کی عظیم الشان خانقاہوں کے ذکر میں آتے ہیں۔

شیخ الاسلام بابا اسماعیلؒ کے بعد جس دوسری عظیم روحانی شخصیت نے اہلِ مداہنت کے عقائد کے تار و پود بکھیر دیئے وہ سلطان العارفین شیخ حمزہ مخدوم کشمیریؒ کی شخصیت تھی۔ خدا نے انہیں عظیم روحانی بصیرت سے نوازا تھا اس لئے ہر قسم کی باطنیت اور شعبدہ بازی ان کے آگے بے کار ثابت ہوئی۔ وہ تجر سوپور کے رہنے والے تھے مگر سرینگر میں مستقل قیام کیا تھا۔ یہاں انہوں نے مختلف مسجدوں اور خانقاہوں میں سالہا سال قیام کرکے بے شمار بندگانِ خدا کا ایمان ضائع ہونے سے بچایا۔ یہ انہی کا مقام و مرتبہ تھا کہ اس وقت کے جلیل القدر ریشیوں نے، جن کا تاریخِ تصوف کشمیر میں علٰحدہ مقام تھا اور کشمیر کی معاشرت پہ ایک گہرا اثر تھا، ان کے دستِ حق پرست پر بیعت کی، اور ان کے کہنے پر ریشیت سے غیر اسلامی آمیزش دور کرنے کی کوشش کی۔ علاوہ ازیں حضرت مخدومؒ نے اپنے صاحبِ علم مریدوں کو لوگوں میں تبلیغِ اسلام پر مامور کیا۔ ان کی مساعی جمیلہ سے ہی تبرا اور مداہنت کا خاتمہ ہوکر

اصحابِ رسول اللہ صلعم کا احترام و تقدس مسلمانوں میں بحال ہوا۔ اس طرح تحریکِ نوربخشیت فوراً رک گئی اور سُنیت کا احیاء ہوا۔

حضرت شیخ حمزہ رح کی اصلاحی و تربیتی تحریک کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی تھی کہ انہوں نے اس اصل مرض کی نشاندہی کی جس سے عقائد میں تنزلزل اور اعمال میں پستی واقع ہوتی ہے۔ یہ مرض "بے قید تصوّف" ہے۔ حضرت شیخ حمزہ مخدوم نے اپنے دَور کے بے لگام صوفیوں اور ریشیوں کی اصلاح کی۔ چونکہ ان کی اصلاح کے پیچھے صرف اخلاص کارفرما تھا اس لئے وقت کے سربرآوردہ ریشیانِ کرام نے یہ اصلاح قبول کرنے میں پس و پیش نہیں کیا۔

اِنتباہ: حضرت شیخ حمزہ مخدوم کے غیر مستند تذکرہ نگار۔

آگے بڑھنے سے پہلے یہاں اُن کتابوں کا تذکرہ کرنا بہت ضروری ہے جو حضرت شیخ حمزہ مخدوم رح کے حالاتِ زندگی سے تعلق رکھتی ہیں، اور قطعاً غیر مستند ہیں۔

حضرت مخدوم رح کی حیات اور کارنامے سمجھنے کے لئے اُن کے جلیل القدر مُرید و مسترشد علامہ داؤد خاکی رح کی تصانیف مستند ترین ماخذ و مرجع کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اُن کے انتقال کے بعد اُن پر جو دوسری کتابیں لکھی گئی ہیں اُنہیں حضرت خاکی رح ہی کی کتابوں کی راہنمائی میں پڑھنا چاہئے۔ ایسا اس لئے ضروری ہے کہ حضرتِ مخدوم رح کے انتقال کے بعد کچھ لوگوں نے "خاص اور خطرناک مقاصد" کے تحت اُن سے عقیدت مند بن کر مستقل کتابیں لکھی تھیں جنہیں حضرت مخدوم رح اور ان کے احباب و رفقاء جیسی مقدس شخصیتوں کے ساتھ کوئی مناسبت

ہی نہیں ہیں۔ ان کتابوں میں تذکرۃ العارفین، ہدایت المخلصین اور رموز الطالبین وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

تذکرۃ العارفین کے بارے میں مؤلف نے اپنا نام بابا علی رینہ ظاہر کر کے پیش لفظ ہی میں یہ تأثر دیا ہے کہ وہ حضرت مخدوم" کا حقیقی بھائی اور علامہ خاکی" کا ذو رست ہے۔ مگر کسی بھی مورخ یا مؤلف (بشمول علامہ خاکی") نے بابا علی رینہ نام کے حضرت مخدوم" کے کسی بھائی یا اس کی کسی تالیف کا ذکر نہیں کیا ہے حالانکہ حضرت خاکی" نے ان کے اکثر رفقاء اور متوسلین یہاں تک کہ سرکردہ اسلاف کا ذکر کیا ہے۔ مؤلف نے خود اپنے آپ کے متعلق جہاندیدہ سیّاح، برگزیدہ عالم اور سربرآوردہ صوفی ہونے کا الٹی سیدھی عبارت میں دعویٰ کیا ہے۔ مگر کشمیر کے تمام مستند مورخ اس کے نام سے بھی ناواقف نظر آتے تھے۔

تذکرۃ العارفین بڑی تقطیع کی تقریباً چھ سو صفحات پر پھیلی ہوئی کتاب ہے مگر بسیط وعریض کتاب میں چند سطریں بھی ایسی نہیں ہیں جن سے حضرت مخدوم" کی عبقریت، تجدید و اصلاح اور کردار و عمل پر روشنی پڑتی۔ مؤلف نے اس میں جان بوجھ کر ایسی کرامتوں کے ڈھیر لگا دیے ہیں جن سے نہ صرف عقل و فکر کو ہی شرم لاحق ہوتی ہے بلکہ حضرت مخدوم" کے متعلق انتہائی پست تصور قائم ہونے لگتا ہے (العیاذ باللہ) مؤلف کہیں عالم، کہیں صوفی اور کہیں مجذوب کا روپ دھارتا ہے مگر وہ بنیادی طور پر حضرت مخدوم" اور ان کے رفقاء کا معاند سیاسی دشمن ہے۔ وہ کرامات کے لباس

میں صوفیائے کرام کی طرف چرند و پرند، بھوت پریت اور جمادات و نباتات کی داستانیں منسوب کرتا ہے اور اُن کی خانقاہوں اور تربیت گاہوں کو چڑیا گھروں اور بھول بھلیاں کی شکل میں پیش کرتا ہے۔ وہ مسلمانوں سے، اُن کے زود اعتقاد ہونے کی حس کا مکاری سے استحصال کرتے ہوئے درخواست کرتا ہے کہ وہ اِن کرامتوں پر اعتبار کریں۔

"امید از کمالِ الطاف و اشفاقِ محبان آنست کہ چوں در کلام بزرگان دین مطالعہ نمایند و ہر کدام از بزرگاں حاظر و ناظر انگاشتہ با اعتقادِ تمام و بارادتِ تمام رضا باید داد و در یکے از خوارقات تخلف و انکار نباید آورد" (نعوذ باللہ من ذالک)

جب اُسے یہ بات ستاتی ہے کہ مسلمان سادہ لوح ہونے کے باوجود بہر صورت شریعت کے حدود کا بھی کسی نہ کسی حد تک احترام کرنے والے ہوتے ہیں۔ اس لئے ممکن ہے کہ وہ اُس کے گھناونے اور قطعاً غیر شرعی کرامتوں کا انکار کر بیٹھیں تو وہ انہیں دھمکانے کی بھی کوشش کرتا ہے۔

"جنابِ ایشاں را بسا کرامات است کہ اظہارِ آں بحسبِ شرع درست نیست کہ بسا اصحابِ انکار از آں مخذول العاقبت گردند لہذا دریں رسالہ آں را مرقوم نساختم۔"

مسلمانوں سے اپنی خانہ زاد کرامتوں پر اعتبار کرانے کی درخواست کرنے کی مؤلف کو اس لئے بھی ضرورت محسوس ہوئی کہ حضرت خاکیؒ جو حضرت شیخ حمزہ مخدومؒ کے خلوت و جلوت کے محرم اور رفیق تھے۔ پہلے ہی اپنے مرشد کے پُر اوصاف اُن کے عقیدتمندوں تک پہنچا چکے تھے۔

اُو شریعت راست ناصر در طریقت مجتہد

بہرِ اسرارِ حقیقت صدرِ اُو مصدر فرا است

یا از سماعِ چنگ و نے کارِ زِ روئے منعِ شرع

گرچہ ذکر اللہ شنواز تار و از مزمر شد است

یا سخت و تلخ از بہر اہلِ کبر و عُجب و بدعقت

اہلِ درد و شوق را شیریں تر از شکر شد است

یا سالہا شد رخصتِ ارشاد و بیعت یافت لیک

محترز از شیخی و بابائی و لنگر شد است

مؤلف نے ایک بزرگ کے حالات میں نقل کیا ہے کہ ان کی ولادت کے وقت یہ غیبی آواز آئی تھی:

"مَن ذکر اسم رکن الدین	جو گنہگار مسلمان عمر میں ایک
مرۃً فی تمامِ العمر من المؤمنین	ہی بار رکن الدین کا نام لے،
عاصیاً کان مذنباً غفر اللہ	خدا اُس کا گناہ معاف کرے
تعالیٰ ذنبہٗ ولو کان کبیراً۔	گا چاہے وہ کتنا ہی بڑا
	کیوں نہ ہو۔

مزہ یہی "غیبی آواز" پکار پکار کر کہتی ہے کہ آواز دینے والے جھوٹا ہے۔ حضرت خاکی "ایسے جھوٹ بولنے والوں کے سر پر پہلے ہی یہ خنجر آویزاں کر چکے ہیں:

نیست معبودے بحق موجود غیر اللہ ہیچ

معنی ایں قولِ مذکور ایں چنیں احمد رشد است

مؤلف نے بڑی چالاکی سے بزرگانِ دین اور اکابر صوفیاء کی کردار کشی

اور آبرو ریزی کی ہے۔ اس کے لیے اس کا خاص طریقہ یہ ہے کہ پہلے کئی کئی صفحات میں پھیلے ہوئے القاب و آداب کے ساتھ اُن کا نام لیتا ہے (اور اُن القاب کا حقدار از روئے شریعت صرف اللہ کی ذاتِ پاک ہے) اور اس کے بعد کرامتوں کے پردے میں انتہائی گھناونے، فاحش اور ناقابل برداشت واقعات سُناتا ہے اس کے القاب و آداب اس قسم کے ہوتے ہیں:

" اے آنکہ عرش بریں فرش پائے مبارکِ تست...... اے آنکہ ستارگاں داخلِ عساکر مریدانِ عامۂ تو اند۔ وہفت طبقۂ آسمان و نہ کرسی زمین و دوازدہ انجم مع دوازدہ ماہ و سی یوم ہر شہر با ساعات و احیان صرف از ارادت و اخلاصِ تو دارند و مُتر ابر شدی ہر لحظہ ہمی شمارند...... و تسبیح و ثنائے تو مُور و ملخ و ملک و فلک و جن و انس و وحوش و طیور و درندہ و پرندہ و اشجار و احجار و انبات و اجماد و حیوانات بزبان دارند۔"

اس قسم کی تعریفوں کے بعد وہ برائے نام بھی کام کی چیز پیش نہیں کرتا ہے جو تذکرۃ العارفین نام کے شایانِ شان ہو سکتی ہے۔ صبر و شکر، اخلاص و ایثار، قناعت و توکّل، زہد و استغنا، تجرد و تفرد یا تبلیغ دین، تربیت اخلاق، خدمتِ خلق، ایثار و مروّت وغیرہ جو اسلامی تصوف کے روشن ابواب اور صوفیائے اسلام بالخصوص ریشیان کشمیر کی قبائے عظمت و احترام کے تکمۂ زرین رہے ہیں مؤلف نے انہیں چھوا تک نہیں ہے اس کے برعکس مؤلف شرکیہ تعریفوں کے

بلکہ باندھکر انہیں پاگل قسم کے مجذوب، عیاش، بکھاری کتوں اور وحشی جانوروں کے ساتھ زندگی گزارنے والے، یہاں تک کہ امرد پرست بھی صورت میں پیش کرتا ہے۔

حضرت بابا ہردی ریشی کے حالات بیان کرتے ہیں شاطر مؤلف نے بیسوں بیحیثیت صفحات سیاہ کیے ہیں۔ خوش قسمتی ہے ان کے عقیدت مندوں میں حضرت علامہ خاکیؒ بھی تھے، یہاں تک کہ حضرت شیخ حمزہ مخدومؒ بھی ان کا احترام کرتے اور ان کی ملاقات کو جاتے تھے علامہ خاکیؒ نے حضرت ریشی صاحب کے کمالات میں ایک منظوم رسالہ "قصیدۂ لامیہ" کے نام سے لکھا ہے اور یہ کمالات یقیناً سچے بزرگ ہی کے شایانِ شاں ہو سکتے ہیں۔ مثلاً

مومنِ اہلِ صلاح و عارف باللہ بود
دوستدارِ مصطفیٰ و اہلِ بیت و صحب و آل

با امامان و مشائخ معتقد بودہ بصدق
ذکر گفتے و ورد مے خواندے ہمیشہ ماہ و سال

ہر صباحے سالہا اورادِ فتحیہ بخواند
ایں یکے بر راستیِ اعتقادِ او درست دال

با جماعت فرضہا کردے ادا در پنج وقت
ترک ایں سنت نہ کردی بے ضرورت ہیچ حال

کرد مسجد را بنا و نیز مہمان خانہا
مقبرے ہم خویش مرتب کردہ بہر مآل

دادہ مصحف ہا بوقف و نہر جاری دوست داشت
اولاً خود حفر کردے پس شدہ بر خرچ مال

کردنِ کشتِ زراعت بود اکثر کارِ او
احتیاطِ او بسے بود است در اکلِ حلال

باز دار ایں نفس را جملہ شہوات و حظوظ
کردہ قانع بر حقوقش بہر دہ باری تعال

زاہد مرتاض بود و از ریاضتہائے اوست
صوم دہر و ترکِ لحم و ہم دوامِ اغتسال

حضرت خاکیؒ نے ریشی صاحبؒ کی بابرکت شخصیت کے جو خد و خال پیش کیے ہیں وہ جہانگیر کے ان چشم دید مشاہدات کے عین مطابق ہیں جو اس

نے کشمیر کے عام مسلمان ریشیانِ کرام کے متعلق اپنی تزک میں قلمبند کیے ہیں:

اس کے برعکس تذکرۃ العارفین کے مؤلف نے انہوں حضرت بابا ہردی ریشی ؒ کے بارے میں جو تاثر دینے کی کوشش کی ہے وہ اتنا پست ہے جس کے بعد کسی پستی کا تصور بھی ناممکن ہے۔ وہ ایک کرتب ساز مداری، کتوں کے "مرشد" اور بدنام عاشق نظر آتے ہیں (خدا کی پناہ)۔ وہ ایک لڑکے پر ایسے لٹو ہو گئے تھے کہ لوگ بھی ان کی لعنت ملامت کرتے تھے۔

"دراں مدت حضرت ریشی ؒ بر پسرے عاشق شد، مفتون مجنونِ او گشت۔ خلقی دراں واقف گشتند ملامت کردند۔"

کشمیر کے پہلے مبلغ اسلام حضرت سید شرف الدین عبد الرحمان (بلبل شاہ ؒ) کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ ایک حسینہ پر عاشق ہو گئے تھے۔ پھر اس حسینہ کا سراپا اِن الفاظ میں کھینچا:

"حضرت شاہ علیہ الرحمۃ روزے سر بازار نشستہ بود۔ عورتے خوش رُو و عنبر مُو شیریں سخن نازک بدنا در مِن چہار دہ کہ ماہِ دو ہفتہ بگردِ آفتابش عرقاب چاہ زنخدانش بود، دل ربائے کہ صد ہزار دل بیک تارِ مُو در عقدِ محبت اُو گرفتار شدندی و رعنائے کہ از دلِ یک رنگ و یک بو عالمے از رفتار ماندے۔۔۔"

یہ وہی مبلغ ہیں جن کی صرف ایک نماز دیکھ کر بودھ حکمران کی تقدیر کا پہاڑ ہل گیا تھا اور وہ صدر الدین کے اسلامی نام سے تاریخ کشمیر کا پہلا مسلمان حکمران ٹھہرا۔ ایسی عظیم اور مقدس شخصیت سے ایسے واقعات منسوب کرنے کی جرأت کرنا کسی خطرناک شخص ہی کا کام ہو سکتا ہے۔

خدا کی قدرت ! کشمیر جتنا خوبصورت ہے اُتنے ہی یہاں کے اولیاءؒ اور ریشی صاحبان بعض نقّادوں کی اصطلاح میں "زاہد خشک" تھے۔ یہاں کے کسی بزرگ کی طرف ایسا کوئی واقعہ منسوب نہیں ہے، جس سے ان کی حُسن پرستی کی بو آسکتی ہو اور جسے کچھ لوگ حُسنِ حقیقی تک پہنچنے کے لئے ضروری سمجھتے ہیں۔ قدرت نے کشمیر کے تمام بزرگوں کو اس کی طلب سے بے فکر رکھا تھا۔

غرض اس کتاب کے مؤلف نے صوفیائے اسلام بالخصوص حضرت مخدومؒ کے متبعین میں گھس کر کشمیری مسلمانوں کے عقائد مسخ کر کے ان کے ایمان و یقین کی تعمیر زمین بوس کرنے کی حتیٰ بھر کوشش کی ہے وہ کہیں کہیں شاطرانہ طریقے پر سیاسی مسائل کی طرف اشارہ بھی کرتا ہے۔ ایک مقام پر اس نے بے بنیاد بات لکھی ہے کہ حضرت مخدومؒ اہلِ کشمیر کو حکومت کے اہل نہیں سمجھتے تھے، وہ اسے غیر کشمیریوں کی طرف منتقل کرنے کے خواہشمند تھے اور اس کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے باطنی طور پر درخواست بھی کی تھی۔ اس طرح موصوف نے کشمیر کو وسیع سلطنتِ مغلیہ میں ضم کرانے کا ذمہ دار حضرت مخدومؒ کو ٹھہرایا ہے:

"حکومت ایں دیار در دست دیگرے کہ نہ از ہیں شہر و دیار بوذ انسب و الیقؔ داحق است۔"

وہ یہ بھی کہنا چاہتا ہے کہ کشمیر کے مسلمانوں میں ایمانی کمزوری ہے شیعہ حکمران انہیں ضرور شیعہ بنانے میں کامیاب ہوتے مگر صرف حضرت مخدومؒ اس کی راہ میں رکاوٹ بن گیا۔ شیعہ حکمران غازی خان کی زبان سے کہتا ہے۔

"اگر مخدوم محبوب العالم را از کشمیر بیروں آریم یقین کہ بروایت الناس علیٰ دین ملوکہم جمیع رعایائے ایں دیار پیروی مذہب ما خواہند نمود۔ و بے محل مذہب توانیم بود۔"

یہ ساری باتیں تاریخی اور واقعاتی اعتبار سے بے بنیاد ہیں۔ مؤلف صرف اپنا عندیہ ظاہر کرتا ہے۔ وہ بڑی ہوشیاری سے افسانے گڑھ کر یہاں کی تاریخ مسخ کرتا ہے۔ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت (جو مستند تاریخوں اور تذکروں کے مطابق خود کبھی کشمیر تشریف نہیں لائے تھے) کے حالات میں لکھتے ہیں کہ ان کے کشمیر آنے کے وقت یہاں چار مردم آزار بھائی رہتے تھے، جن کے نام شلو، ہلو، ملو اور بلو تھا۔ آگے ایسی ہذیاں سرائی کو قابل یقین بنانے کے لیے ان کی جائے سکونت بھی درج کی ہے کہ پہلا بیر پنجال، دوسرا بارہمولہ، تیسرا ہفت چنار اور چوتھا برتھنہ میں رہتا تھا۔

ہدایت المخلصین بھی اسی نوع کی کتاب ہے جو حضرت مخدوم کے مشہور ارادتمند حضرت شیخ حیدر (تولہ مولی) کی طرف منسوب ہے ان کا ذکر خیر حضرت خاکی، محدث مشکواتی اور محمد اعظم نے بھی کیا ہے۔ انہوں نے ان کی صرف پرہیزگاری اور ریاضات و مجاہدات کا ذکر کیا ہے۔ اُن کے علم و فضل یا تصنیف و تالیف کے باب میں یہ سب لوگ خاموش ہیں، بالخصوص مذکورہ رسالے کا کہیں ان کا نام تک موجود نہیں ہے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اُدھر تذکرۃ العارفین کے مؤلف نے حضرت شیخ حیدر کے احوال پر بھی اپنے موقلم کے جوہر دکھلائے ہیں اور انہیں ایسے القاب و آداب سے یاد کیا ہے، اور ان کی طرف

ایسی کرامتیں منسوب کی ہیں جنہیں ایک تحقیق پسند شخص پڑھنا بھی مشکل سے گوارا کرتا ہے، اور ادھر ہدایت المخلصین میں مؤلفِ تذکرۃ العارفین یعنی ملاّ علی رینہ (جس کے نام تک سے بھی ہمارے مستند مؤرخ، مصنف اور تذکرہ نگار بالکل ناواقف ہیں) کا ایسی شان اور آن بان سے تذکرہ کیا ہے جو شیخ حیدر کے تذکرے میں دکھائی گئی ہے۔

بھوت اور پریوں کی کہانیوں سے لبریز ہدایت المخلصین کے متعلق مؤرخ غلام حسن کھویہامی (م ۱۸۸۶ء) کی تحقیق یہ ہے،

"بعض مؤرخ کہتے ہیں کہ مذکورہ کتاب اُن کی (شیخ حیدر تولہ مولیؒ) تصنیف نہیں ہے بلکہ پرگنہ زینہ گیر کے گاؤں تجرؒ کے مجاوروں نے اپنی وراثت کے دعوٹی میں بابا علی رینہ کا حضرت مخدومؒ کا بھائی قرار دینے کے لئے ہدایت المخلصین لکھوا کر حضرت شیخ حیدر کی طرف منسوب کی ہے۔"

مذکورہ تحقیق کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت مخدومؒ نے تجردؒ کی زندگی پسند کر کے کوئی نکاح نہیں کیا تھا مگر ان کے انتقال کے بعد اللہ تبارک و تعالیٰ نے ایسے بہت سے لوگوں کو پیدا کیا جنہوں نے اُن کے نام پر روزی روٹی کمانے کے لئے اُن کے ساتھ کوئی نہ کوئی تعلق اور نسبت ڈھونڈ نکالنے کی کوشش کی۔ "کلُّ شیءٍ ھالکٌ اِلاّ وجھہٗ"۔

تاہم راقم حقیر کی رائے یہ ہے کہ یہ رسائل یا تو ایک ہی شخص کے قلم سے ہیں یا کوئی اخوان الصفا قسم کی زیر زمین ٹولی رہی ہے جس نے کشمیر میں سنیّت برباد کرنے کے خاطر خرافات نویسی کو بہترین حربے

کے طور پر استعمال کیا ہے۔ ہو نہ ہو اس فرد یا اس ٹولی کا تعلق بھی اسی جماعت سے رہا ہو جس نے منصوبہ بند طریقے پر اُمّت اسلامیہ کی تمام جلیل القدر شخصیتوں کی کتابیں ملیں وسیع پیمانے پر جعل و تصرّف اور الحاق و انتحال کر کے اپنے خطرناک عزائم پورا کرنے کی کوشش کی تھی اور جسے ایران کے صفوی حکمرانوں کی مکمل سرپرستی حاصل تھی۔ اس سازش میں سنائی، عطّار، حافظ اور خیام سے لیکر شیخ نجم الدین کبریٰؒ اور میر سید علی ہمدانیؒ جیسے تمام بلند پایہ شعراء کی شاعری اور جلیل القدر مصنفین کی تالیفات بھی نہ بچی تھیں، اور ہماری یہ زیر زمین ٹولی بھی اسی دور سے تعلق رکھتی ہے۔

رموز الطالبین کے نام سے میر جعفر نامی ایک اور شخص نے ایسا ہی دوسرا رسالہ لکھا تھا اور اپنے آپ کو حضرت مخدومؒ کا ارادتمند ظاہر کیا تھا اس میں اس نے عشق مجازی کی آڑ میں انتہائی فاحش اور حیاسوز کرامتیں حضرت مخدومؒ کی طرف منسوب کی تھیں۔ مگر مسلمانوں نے اپنی سادہ لوحی اور ضعیف الاعتقادی کے باوجود اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کی تھی۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا یہ خطرناک ٹولی اپنے عزائم میں کامیاب ہوئی؟ اس کا مفصّل جواب مستقبل کا مؤرخ ہی دے گا۔ ناچیز مؤلف صرف اتنا عرض کرنے کی جرأت کرتا ہے کہ ان کتابوں نے کشمیر کے مسلمانوں کا اسلامی مزاج بگاڑنے میں بڑا حصہ ادا کیا ہے۔ آج جو ہم کشمیری شاعر احد زرگر (م ۱۹۸۴ء) کی قبر کے سرہانے چرسیوں کی

تھے علم جرس نوشی اور پیروں کے جانب بالکل آمنے سامنے سادہ لوح عورتوں کا روایتی انداز میں استمداد و توسّل کا منظر کھلی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں، یہ حرف زیرِ تبصرہ کتابوں کے زیرِ زمین مدفون کے امنگوں کی تکمیل ہے۔

مرزا حیدر دوغلات کی تعمیری خدمات مرزا حیدر دوغلات کی دس سالہ (۹۴۷ھ تا ۹۵۷ھ) مدتِ امارت اس اعتبار سے قابلِ تحسین ہے کہ اس نے علم و فن و ادب کی آبیاری کی اور رفاہِ عامہ میں بھی دلچسپی لی، وہ اگر مذہب میں انتہا پسند اور متعصب واقع نہ ہوا ہوتا تو وہ یہاں کی تاریخ پر گہرے تعمیری نقوش چھوڑ دیتا پھر بھی اس کی علم دوستی، علماء اور اہلِ فن کی حوصلہ افزائی اور معاشی سدھار نے یہاں کے لوگوں سے خراجِ تحسین وصول کیا، مشہور عالم اور بزرگ حضرت شیخ حبیب اللہ نوشہریؒ کی زبان سے یہ تعریف و تحمید مرزا حیدر کے اہلِ کشمیر پر غیر معمولی احسانات کے حق میں معتبر ثبوت کی حیثیت رکھتی ہے:

من شنیدم کہ میرزا حیدر — بود در آں زماں شہِ صفدر
کز فراست کسے نبود چناں — گو کسی بود بودش اُو سلطان
در شجاعت چو اُو نہ رستم بود — در سخاوت چو اُو نہ حاتم بود
در طبابت حکیم حاذق بود — در عبادت عبدِ خالق بود
بود درویش دوست ہم درویش — چہ صفا کیش بود و نیک اندیش

وہ آگے اعتماد کے ساتھ کہتے ہیں:-

طرحِ کشمیر اگر نکو ست نکو — ایں ہمہ آمدہ از دوست از و

اسی طرح مُلّا سعد اللہ شاہ آبادی اپنی منظوم تاریخ کشیر میں لکھتے ہیں:

فضلا را بسی رعایت کرد — بر رعایا بجان حمایت کرد
صحبت اہلِ حال کرد ہوس — گشت ہمدم بصاحبان نفس
داشت اہلِ کمال بیش عزیز — یافت نزد اہلِ حرفہ نیز تمیز
خواست ارباب صنع از ہر جا — مُلک را کرد راست برگ و نوا
کرد موسیقی از نوازش ساز — با دف و چنگ و نے بلند آواز
ہم عمارات مرتفع تعمیر — کرد و زو شد دریچہ کاغذ گیر
در شتا نیز خشک کرد شالی — با ظروف پُر آتش و شالی
اختراعاتِ او بدیع انواع — یافت در مُلک بیشتر ابداع
تا بدہ سال ملک رانی کرد — عدل و انصاف و مہربانی کرد

چک دَورِ حکومت میں سرکردہ خانقاہیں اور دینی مدارس

جس طرح نوربخشی تحریک قدیم شیونی تحریک کی بازگشت تھی اسی طرح چکوں کی حکومت ایران کی صفوی حکومت کی تقلید تھی۔ اتفاق سے میر شمس الدین عراقی اور اُن کے رفقا جو اپنی تحریک پھیلانے کی غرض سے کشیر وارد ہوئے تھے، کوئی خاص فکری اور علمی صلاحیت نہیں رکھتے تھے اس لئے اپنی تحریک کو کسی ٹھوس بنیاد پر استوار نہیں کر سکے۔ اس کے برعکس علمائے اہلسنت والجماعت اس دَور کے ناساعد حالات میں گھرے رہنے کے باوجود تدریس و تصنیف سے کبھی غافل نہیں رہے۔ یوں تو زین العابدین کے بعد حکومتوں کی جانب سے تعلیم اور تعلیمی اداروں کو کوئی سرپرستی حاصل نہیں ہوئی مگر پھر بھی علمائے اسلام اپنی تعلیم و تبلیغ کی منصبی ذمہ داریوں سے پوری طرح عہدہ برآ ہوتے تھے۔ سلطان زین العابدین کے بعد

کسی بھی حکمران نے کسی اعلیٰ پائے کی درسگاہ نہیں بنائی مگر علماء کی اقامت گاہیں اور صوفیائے کرام کی خانقاہیں مستقل تعلیمی اور تربیتی ادارے بن گئے۔ ہم یہاں اس قسم کے کچھ اہم اداروں کا مختصر حال بیان کرتے ہیں۔

خانقاہ شیخ اسماعیل کبرویؒ | حضرت شیخ اسماعیل کبرویؒ آخری شاہمیری دور اور ابتدائی چک عہد کے بلند پایہ عالم دین اور ولی کامل تھے۔ کشمیر میں انہوں نے اپنے وقت میں مذہب اہل سنت والجماعت کی مدافعت میں کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ عظیم حوصلے اور خداداد بصیرت کو بروئے کار لا کر تدریس، تبلیغ اور دعوت و ارشاد قسم کے مختلف محاذوں پر وقت کی خوفناک یلغار کا مقابلہ کیا۔ وہ وقت کے شیخ الاسلام اور مدرسہ رنگلؒ خاتون کے صدر مدرس تھے۔ بڑے بڑے اصحابِ مناصب تک اُن کی رسائی تھی باایں ہمہ تقویٰ اور بے نفسی کا یہ عالم تھا کہ مرض الموت کے وقت کسی شخص نے کہا: یہ کیا ضروری تھا کہ سارا مال فقیروں میں بانٹ دیا اور اپنے فرزندوں کو بے نوا چھوڑ دیا؟ تو جواب دیا:

"مال درویشاں با فقراء مشترک است۔ ازاں جہت بر فقراء تقسیم نمودیم۔ پسر را برائے ایں بے نوا گذاشتیم کہ اگر نیک کردار باشد برائے او نفقہ گذاشتن بر ما لازم نیست۔"[1]

درویشوں (یعنی خانقاہ نشینوں) کا مال اُن کے اور فقراء کے درمیان مشترک ہوتا ہے میں نے اپنے بیٹے کیلئے اس لئے کچھ نہیں چھوڑا ہے کہ اگر اُس کا کردار و عمل ٹھیک ہے تو مجھ پر اس کے مصارف کا پورا کرنا لازم ...

---

(۱) : خوارق السالکین۔ (قلمی)

اُن کی گوناگوں خدمات اور کارناموں، جو انہوں نے کشمیر میں اسلام کی بقا اور مسلمانوں کی اصلاح کے لئے انجام دیں سب سے ممتاز کارنامہ دو عظیم الشان خانقاہوں کی تعمیر و سرپرستی تھی جو بیک وقت شاندار درسگاہیں، عراق و خراسان کے طلبائے علم کی اقامت گاہیں، محققین کے لئے قابل قدر کتابخانے اور صوفیاء اور سالکوں کے لئے سب سے ممتاز تربیت گاہیں تھیں۔ محمد اعظم لکھتے ہیں کہ ان میں فقراء اور صوفیاء کے علاوہ دُور و دراز سے آنے والے طالبعلموں کے لئے مفت کھانا میسر تھا۔

"سوائے آں مسافرین از فقراء و طالبانِ علم بکثرت و ہجوم آمد و رفت داشتند۔ اکثرے از ولایت ماوراء النہر و ہرات باییں شہر مے آمدند و نان از مطبخ خانقاہ اُو مے خوردند۔"[۱]

مسافروں کے علاوہ فقراء اور طلبائے علم یہاں کثیر تعداد میں آتے جاتے تھے ماوراء النہر اور ہرات جیسے ممالک سے تعلق رکھنے والے لوگ یہاں آتے تھے اور اُن کی خانقاہ کے لنگر میں کھانا کھاتے تھے۔

اسی طرح حضرت شیخ رحؒ نے محققین اہل علم کے لئے یہاں کتابوں کا عظیم ذخیرہ مہیا رکھنے کا بھی انتظام کیا تھا تاکہ علم و تحقیق کرنے والے اہلِ قلم کو بھی کتابوں کی سہولت میسر ہو سکے۔

"و کتبِ بسیار با لوازمِ دیگر وقفِ خانقاہ کردہ۔"[۲]

بہت سی کتابیں دیگر لوازم کے ساتھ خانقاہ میں وقف رکھیں۔

۱؎ تاریخ اعظمی، ص ۸۷ ۲؎ ایضاً

اس دور میں حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانی رح کے نقوش مٹانے کی کوششیں جاری تھیں۔ ان کی کوششوں کو اس دور کے صوفیائے مبلغین "اہل مداہنت کی یلغار" سے تعبیر کرتے تھے۔ اس لئے ضرورت اس بات کی تھی کہ حضرت امیر کبیر رح کے ایک ایک نقش پا کو مستقل مشعل راہ بنادیا جائے اس سلسلے میں حضرت امیر کبیر رح نے خود ہی اپنے ورد کے وقت اہل کشمیر کو بطور خاص اوراد فتحیہ کے نام سے ایک مجموعۂ اذکار بمنزلہ ارمغان عطا کیا تھا۔ انہوں نے ہر نماز کے بعد اسے بجہر اور اجتماعی صورت میں پڑھانے کا اہتمام بھی فرمایا تھا۔ یہ مجموعۂ اوراد و اذکار باطنی فیوض و فضائل رکھنے کے ساتھ بے شمار ظاہری فوائد کا حامل رہا ہے۔ اس کے بجہر اور غنائیت سے بھرپور لہجے میں پڑھنے سے اسلام کے عناصر ترکیبی جیسے توحید و رسالت پر ایمان و یقین، ذات اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام، آپ کے آل و اصحاب کے فضائل و محامد کا اعتراف، اولیائے کاملین کی محبت اور ان کے حق میں دعائے مغفرت وغیرہ کا علی الاعلان اور بکمال جذب و وجد اظہار ہوتا ہے، اور آگے مجموعی طور پر مسلمانوں کی اجتماعی قوت کا صحیح منظر پیش کرتا ہے۔ کشمیر میں حضرت امیر کبیر رح کے بعد آپ کے جملہ رفقاء اور منتسبین نے ہر دور میں اس پر بڑی شدت سے مداومت کی، یہاں تک کہ آج بھی یہ اوراد مومن کشمیر کے ہزار ہا ہزار لوگوں کو برلوک زبان ہے اور وہ اسے روزانہ انفرادی اور اجتماعی صورت میں پڑھتے ہیں۔ حضرت شیخ اسماعیل کبروی رح نے اپنی خانقاہ میں اس پر آشوب زمانے میں اوراد فتحیہ ورد کرنے کا وسیع پیمانے پر

انتظام کیا تھا۔ محمد اعظم لکھتے ہیں:

"چہار صد (۴۰۰) صوفی اوراد خوان ہر روز در خانقاہ حاضر بودے روزینہ از ایشان می یافتند۔"[1]

ہر روز چار سو اوراد پڑھنے والے صوفی منش بزرگ یہاں حاضر ہوتے تھے اور حضرت شیخ ہی سے روزینہ بھی پاتے تھے۔

حضرت شیخ اسماعیل کی ان دو خانقاہوں میں ایک خانقاہ موجودہ جامع مسجد کے متصل تھی یہیں اُن کے اسلاف بھی محو خواب ابدی تھے۔ اور دوسری خانقاہ کوہ ماران کے دامن میں واقع تھی اور حضرت شیخ خود یہیں دفن کئے گئے تھے حضرت شیخ کی یہ دو خانقاہیں اپنے زمانے میں کشمیر کی دوسری تمام خانقاہوں میں ممتاز و مشہور تھیں۔ یہ دونوں خانقاہیں بشمول مطبخ و کتبخانہ ۱۰۹۰ھ تک موجود تھیں۔ بالآخر آگ لگنے کی واردات میں تباہ ہوگیا ان کے شرف و امتیاز کا اندازہ لگانے کے لئے صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ دور و دراز کے دیہات سے زمیندار اپنی زمین کا عشر حضرت شیخ ہی کی خانقاہ میں لاتے تاکہ اس کے مصارف پورا ہو سکیں۔ حضرت شیخ حمزہ مخدوم کشمیری کے اسلاف بھی اپنے آبائی گاؤں تجر (متصل سوپور) سے اپنا عشر اور زکوٰۃ وغیرہ اسی خانقاہ میں پہنچاتے تھے۔ حضرت علامہ داؤد خاکی (م ۱۵۸۵ء) اپنے مرشد حضرت شیخ حمزہ کے اسلاف کی دینداری اور خداترسی کے بارے میں لکھتے ہیں:

"یکی از علامت دینداری و اخلاص پدران ایشان این

حضرت شیخ حمزہ کے بزرگوں کی دینداری اور نیک نیتی کی ایک

[1] تاریخ اعظمی، ص ۹۷۔

بوده که شنیدم هر سال باسم زکوٰة و عُشر حبوب و مواشی و سایر اموال خود بے ملاحظۂ نصاب و گاہے بے ملاحظۂ مقدار وجوب که در بعضی کم از عُشر بوده ادا مے کردند و اکثر آں را بخانقاہ مولانا شیخ اسماعیل شامی مرحوم که در شیخ سُنیاں آں وقت بودے رسانیدند و نسبت با و اخلاص مے کردند۔ ؎

کھلی نشانی یہ بھی تھی کہ وہ ہر سال زکوٰۃ اور عُشر کے نام سے میوہ، مویشی اور دوسرے اقسام کے مال و جائیداد کا اکثر حصہ حضرت شیخ اسماعیل شامی کی خانقاہ میں بھیجتے تھے جو اس وقت کشمیر میں سُنیوں کے شیخ و مُرشد تھے۔ اس میں وہ نصاب اور مقدار کی حدود نصاب سے گزر کر اپنے بھرپور خلوص و محبت کا اظہار کرتے تھے۔

غرض حضرت شیخ رح کی خانقاہیں مذہب اہل سُنّت والجماعت کی تبلیغ و ترویج کے سب سے اہم مرکز کی حیثیت اختیار کر گئی تھیں یہ مرکزیت پہلے حضرت امیر کبیر رح کی خانقاہ معلیٰ کو حاصل تھی مگر میر شمس الدین صاحب عراقی نے نوربخشی وزراء کی اعانت سے تعمیر اور تطہیر کے نام پر اسے منہدم کروایا تھا۔ جب دو سال تک اس کی تعمیر نو کی طرف کوئی توجہ نہ کی گئی تو سلطان محمد شاہ (جو بذات خود غیرت و حمیت سے محروم تھا) کی بیوی صالحہ خاتون نے خانقاہ حضرت امیر کبیر رح کی تعمیر نو پر کمر ہمت باندھی۔ اس نے اپنے جہیز کے زیورات بیچ ڈالے اور ساری قیمت اس پر صرف کی۔ صالحہ خاتون اپنی

؎ : دستور السالکین، ص ۱۳۹، مطبوعہ البکرک پریس لاہور، ۱۳۵۶ھ

حضرت شیخ اسماعیل کبرویؒ کی ارادت مند تھی۔

غرض اس دور میں قدرت نے اپنے لطفِ خاص سے حضرت اسماعیل کو اہلِ کشمیر کا ایمان و یقین اور صالح اقدار و آثار سنبھالنے کے لئے چُنا تھا۔ انہوں نے ہر محاذ پر ان کی مدافعت کا حق ادا کیا، انہوں نے شمس چک سے جس کا سیاسی مستقبل روشن تھا اور جو حضرت شیخؒ کا عقیدت مند تھا، وعدہ لیا تھا کہ وہ امارت و سلطنت ملنے پر اپنے دینی فرائض انجام دینے میں معمولی کوتاہی بھی نہ برتے گا بالخصوص شرعِ مبین کی ترویج اور شرک و کفر کے خاتمے میں اپنا پورا اثر و رسوخ استعمال کرے گا۔ چنانچہ وزیر ہونے پر شمس چک موصوف نے ممکنہ حد تک اپنے وعدے کو پورا کیا۔ اس نے حضرت شیخؒ کی یاد میں ایک دو طبقہ خانقاہ بنوائی جو صلحا و سے معمور رہتی تھی۔

مدرسۂ ملّا رضی: ملّا رضی الدین چکوں کے دورِ وزارت کے جلیل القدر عالم تھے۔ آخری شاہمیری دور میں وہ سلطان قطب الدین کے مشہور دارالعلوم کے اُستاد تھے۔ نامور کشمیری فضلا اُن سے مستفید ہوئے تھے جن میں حضرت شیخ یعقوب صرفیؒ، محدث شمس الدین پالؒ اور علّامہ داؤد خاکیؒ کے اسمائے گرامی خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ مولانا مفتی فیروز گنائی اُن کے داماد تھے جو علّامہ ابن حجر ہیتمی مکی کے شاگرد تھے۔ سیاسی بدامنی کے زمانے میں انہوں نے اپنے گھر پر ہی درس دینا شروع کیا اور بے شمار طلبا کو فیض پہنچایا تھا۔ خود ان کے علم و فضل کے بارے میں اعظمی لکھتے ہیں:

"از فضلائے وقت و نحاریرِ   وقت کے متبحر عالم تھے۔ عقلی

روزگار بود جامع علوم عقلیہ ونقلیہ ...... در اکثر علوم تالیفات مے کرد[۱]۔

اور نقلی علوم کے جامع ..... اکثر فنون میں کتابیں لکھی ہیں۔

گو آج ان کی ایک تالیف بھی موجود نہیں ہے تاہم ان کے کئی فیض یافتگاں جیسے شیخ صرفیؒ اور علامہ خاکیؒ کی قابلِ قدر کتابیں ہمارے سامنے موجود ہیں جو یقیناً باعثِ مسرت اور قابلِ فخر ہیں۔

مدرسۂ ملا حافظ بصیر ملا محمد بصیرؒ بھی اس دور کے سربرآوردہ عالم اور مدرس تھے۔ وہ مادر زاد نابینا تھے مگر بصیرت ایسی پائی تھی، کہ فضلائے وقت کے مرجع بن گئے۔ محدث شمس الدین پالؒ، علامہ خاکیؒ اور شیخ صرفیؒ نے ان سے بھی علمی فیوض حاصل کئے تھے۔ وہ تشیع سے متہم تھے۔ مگر مورخ اعظمیؒ نے اس کی تردید کی ہے:

"دامنِ ہمتش از آلایشِ قیاساتِ مردم مبرا بود[۲]"۔

ان کا دامن لوگوں کی افواہوں سے پاک و صاف تھا۔

حضرت شیخ یعقوب صرفیؒ نے ان کے انتقال پر ایک پُر درد مرثیہ لکھا تھا اس کے علاوہ مغازی النبی[۳] میں بھی ان کے علم و فضل اور تقویٰ و طہارت کا وقیع الفاظ میں ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

۱: اعظمی۔ ۲: ایضاً

۳: "مغازی النبی" مطبع محمدی لاہور ۱۳۱۷ھ میں الحاج شوکت حسین صاحب کینگ (خندہ بون سرینگر) کا شکر گزار ہوں۔ جنہوں نے مجھے ان تاریخی اہمیت کے حامل اشعار کی طرف توجہ دلائی اور کتاب میں ان کی نشاندہی بھی کی۔

- چہ گویم ز حافظ بصیری کہ بود   خبر داد اسرارِ کشف و شہود

(میں حافظ بصیر کے بارے میں کیا کہوں کہ وہ کیسے تھے۔ وہ ایسے ربّانی عالم تھے جو کشف و شہود کے اسرار و رموز کی خبر دیتے تھے)

- رضی و بہ از او ہزاراں ہزار   بشاگردیش داشتند افتخار

(مُلّا رضی الدین اور ان سے ہزاروں طالبعلموں نے فیض حاصل کیا اور وہ اُن سے اپنی نسبت شاگردی پر فخر کرتے ہیں۔)

- اگرچہ نبود ست بینا بچشم   ز خود ظاہرا بود اعمی بچشم

(اگرچہ وہ ظاہری طور پر نابینا اور آنکھوں کی بصارت سے محروم تھے۔)

- ولی از کمالِ حضورِ خدا   دلش بود بینا بنورِ خُدا

(مگر کمال خداشناسی کی برکت سے اُن کا دل نورِ خُدا سے روشن تھا۔)

- از ایشاں علمِ صوفیہ آموختم   دقیقاتِ عقلیہ اندوختم

(میں نے انہی کی خدمت میں باطنی علوم سیکھے اور عقلی علوم کی جزئیات حاصل کیے۔)

- فنونِ منطق و اصطلاحِ کلام   بدیع و بیان و معانی تمام

(اسی طرح منطق، علم کلام، بدیع و بیان اور علم معانی غرض سارے علوم انہی سے حاصل کیے۔)

اس میں شک نہیں ہے کہ حضرت شیخ صرفی ؒ کے مذکورہ اشعار ملّا حافظ بصیر ؒ کے علم اور اخلاص سے بہرہ ور ہونے میں سند کی حیثیت رکھتے ہیں تاہم کچھ علمی مسائل میں وہ کچھ ایسی رائے ظاہر کرتے تھے جو اُن کے بعض

معاصر علماء احوال کے قطعاً ناموافق بلکہ مذہب اہلِ سُنّت والجماعت کے لئے صریح ضرر رساں سمجھتے تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے درس کے دوران اپنے شاگردوں کے سامنے کسی علمی مسئلے کے بارے میں یہ الفاظ کہے:

"شیعہ ہم سخنے دارند"[1] اس میں شیعہ بھی دلیل رکھتے ہیں۔

تو ابھی یہ الفاظ اُن کی زبان سے پوری طرح ادا بھی نہ ہوئے تھے کہ ان کے کئی شاگرد جن میں علامہ داؤد خاکیؒ اور شمس الدین پال بھی شامل تھے، فوراً مجلسِ درس سے اٹھ کر چلے گئے اور مدرسہ مُلّا رضی الدین میں تعلیم کی تکمیل کی۔

دار العلوم حسین شاہ چک: چک حکمرانوں میں غازی خان کے بیٹے حسین خاں نے ایک شاندار دار العلوم بنایا تھا اس کے ساتھ ایک ہوسٹل بھی تھا اور کئی دیہات کی آمدنی اس پر وقف رکھی تھی۔ اس دار العلوم کے صدر مدرس حضرت شیخ فتح اللہ حقانیؒ بنائے گئے تھے اور اخوند شیخ درویش اُن کے معاونِ خصوصی مقرر ہوئے تھے شیخ فتح اللہ زبردست حنفی المذہب سُنّی اور متبحر عالم تھے۔ میر شمس اللہ صاحب عراقی نے اپنی زندگی ہی میں انہیں قتل کرانے کی کوشش کی تھی بلکہ وزیر اعظم موسیٰ رینہ نے اُن کے ایک عقیدتمند کو قتل کر ڈالا تھا، مگر شیخ حقانیؒ کو جان سے مارنے میں کامیاب نہیں ہوئے تھے۔ انہوں نے بالآخر صرف دار العلوم سے ترکِ تعلق کیا بلکہ کشمیر سے ہی ہجرت کی۔ وہ سیالکوٹ آئے اور یہاں درس و تدریس کا مشغلہ جاری کیا۔ اُن کے بعد اُن کے دو دامادوں ملّا کمال الدین

---

[1] اعظمی: ص ۸۴-

ارشاد مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ اور مولانا عبدالحکیم سیالکوٹیؒ اور ملا جمال الدین نے یہ فیض علم مدت مدید تک جاری رکھا۔ خود شیخ فتح اللہ حقانیؒ کے ممتاز شاگردوں میں حضرت شیخ حمزہ مخدومؒ بھی تھے۔ حسین خاں نے قاضی حبیب اللہ خوارزمی حنفی کو شیخ الاسلام مقرر کیا۔ وہ بڑے جرأت مند عالم تھے اور بے باکی سے ہی سُنی عقائد پر ایک کتاب عقائد کے نام سے لکھی تھی جس میں خلافت اور امامت پر مفصل بحث کر کے اہلسنت کا موقف مؤید کیا تھا۔[۱]

چک حکومت کا خاتمہ اور کشمیر پر مغلوں کا تسلط

جس زمانے میں چک حکمرانوں اور نوربخشی امراء اور مبلغین کشمیر میں ایرانی امامت و ثقافت کی ترویج و اشاعت میں مصروف تھے اس وقت کشمیر کے چاروں طرف مسلمانوں کی ایک نئی عظیم الشان سلطنت وجود میں آرہی تھی۔ جلال الدین اکبر اپنی توسیع پسندی سے چھوٹی چھوٹی خود مختار مملکتوں کو مرعوب کر رہا تھا۔ اس نے اپنے ایجنٹ کشمیر بھی بھیج دیے جو یہاں فضا ساز گار کر کے بیرونی مداخلت کے لئے راہ ہموار کر رہے تھے اسی اثنا میں غازی شاہ چک مر گیا اور اس کا بیٹا حسین شاہ تخت پر بیٹھ گیا۔ اس نے بدلتے ہوئے حالات کا صحیح اندازہ لگاتے ہوئے اپنی سیاسی حکمت عملی بدل دی۔ اس نے سُنی عوام کو خوش کرنے کے لئے اُن مصیبتوں کا ازالہ کرنے کی جانب توجہ کی جنہیں اس کے اسلاف اور دوسرے نوربخشی اُمرائے نے مدت دراز سے ان سے روا رکھے آئے تھے۔ شیخ حبیب اللہ خوارزمی کو شیخ الاسلام مقرر کرنا،

---

[۱] اعظمی، ص ۱۰۳۔

ایک شاندار مدرسے کی تعمیر، صوفیاء اور علماء سے حسن سلوک، مختلف طبقوں کے مسائل جاننے اور ان کو حل کرنے کے لئے مخصوص اوقات کا تعین وغیرہ اس گروہ مثبت کوششیں تھیں جن کا مقصد کشمیر یا امن وسکون قائم کرکے ملک سے بیرونی خطرے کو ٹالنا تھا۔ مگر چونکہ حسین شاہ ٹھیٹھ نور بخشی، اور نوربخشی مبلغوں کی گرفت میں تھا اس لئے اس کی اصلاحی کوششیں بارآور ثابت نہیں ہوئیں۔ یہ مبلغ مذہبی فتنوں کو جگانے اور سُنّی علماء اور مشائخ کی تذلیل کرنے میں ہر وقت مشغول رہتے تھے۔ چنانچہ ایک دن انہوں نے شیخ الاسلام مولانا حبیب اللہ خوارزمی پر چھپ کر حملہ کیا۔ وہ شدید زخمی ہوئے یہاں تک کہ تلوار کی کاٹ سے ان کی انگلیاں بھی گر گئی تھیں۔ شیخ الاسلام پر اس بزدلانہ حملہ سے مولانا مفتی فیروز اور خواجہ شمس الدین الیاس سے فتویٰ طلب کیا گیا انہوں نے گستاخ قاتل کو مباح الدم ہونے کا فتویٰ دیا۔ چنانچہ قاتل کو قتل کیا گیا۔ حسین شاہ نے ملک میں فرقہ واریت کی آگ پھیلنے کے خوف سے اوّل اوّل اپنے مذہبی تعصب کو ظاہر نہیں ہونے دیا مگر کچھ دنوں کے اندر اندر نوربخشی درباریوں کے اثر میں آکر وہ ان دونوں علماء سے بدلہ لینے پر آمادہ ہوا۔ مولانا مفتی فیروز اور مولانا الیاس شہید کیے گئے۔ اس سے پورے کشمیر میں نفرت کی آگ پھیل گئی۔ حسین شاہ نے حالات سدھارنے کی پھر کوشش کی مگر ناکام ہوا۔ اکبر نے اپنے ایجنٹوں کے ذریعہ اس عمومی نفرت کو اپنے حق میں موڑ دیا، جبکہ فتنوں کی آگ سلگانے کے وقت بھی یہ عناصر پیش پیش تھے۔

۹۷۸ھ / ۱۵۷۰ء میں حسین شاہ مر گیا اور اب اُس کا بھائی علی شاہ تخت نشین ہوا۔ اس نے اکبر کے نام سکّہ اور خطبہ جاری کر کے عملاً اس کی سیادت قبول کی۔ وہ سُنّی مذہب پر عامل تھا اور مشائخ الرّیت جن میں حضرت شیخ مخدومؒ اور بابا ہردی ریشی شامل تھے کا عقیدت مند تھا۔ وہ بڑا دیندار اور صوم و صلوٰۃ کا پابند تھا اور تفسیر دینی کتابوں کا مطالعہ کرتا تھا۔ ایک دن وہ حسب معمول عیدگاہ میں چوگان (پولو) کھیلنے گیا اچانک یہاں گھوڑے سے گر گیا اور محل سلطنت میں پہنچتے ہی انتقال کر گیا۔ عیدگاہ وارد ہونے سے پہلے اس نے مشکوٰۃ شریف کی چند احادیث کا مطالعہ کیا تھا۔۱؎

علی شاہ چک کے بعد جو لوگ حکومت کے اُمیدوار تھے ان میں ایک اس کا بیٹا یوسف شاہ چک اور دوسرا اس کا بھتیجا یوسف خاں (فرزند حسین شاہ چک) سرِفہرست تھے۔ یوسف چک عیش و طرب کا متوالا، ساز و سنگیت کا ماہر اور امور مملکت سے بیگانہ تھا جبکہ یوسف خاں بڑا بہادر اور باحوصلہ نوجوان تھا۔ اسی نے مہرالنسا کی محبت کی راہ میں جہانگیر کے رقیب علی قلی خاں "شیر افگن" کو مار ڈالا تھا یہ واقعہ عینی شاہد رئیس الملک حیدر ملک چاڈورہ کشمیری (جو یوسف خاں کے قریبی رفیقوں میں سے تھا) کے مطابق اس وقت پیش آیا جب قطب الدین خاں جہانگیر کے ایما پر شیر افگن کو بنگال میں مارنا یا گرفتار کرنا چاہتا تھا، اس نے اس مقصد کے لئے کچھ کشمیریوں کو جن

۱؎: تاریخ بہارستان شاہی (قلمی) ۔
۲؎: مآثر رحیمی، ج ۱، ص ۲۵۷ ۔

میں یوسف خاں (پسر حسین شاہ چک) اور مورخ ملک حیدر بھی شامل تھے، آلۂ کار بنانا چاہا۔ ایک دن جب وہ اس مقصد کے لیے تاک میں بیٹھے تھے شیر افگن کو ان کے عزائم کا اندازہ ہوا۔ اس نے قطب الدین خاں اور ملک حیدر مورخ کشمیری کو زخمی کر دیا۔ اس پر ایک اور کشمیری ایبہ خاں نے شیر افگن کو صلواتیں سنائیں، شیر افگن نے گالی سنتے ہی ایبہ خاں کا خاتمہ کر دیا اسے دیکھتے ہی یوسف خاں شیر کی طرح شیر افگن پر جھپٹ پڑا، اور تلوار کی ایک کاٹ سے اس کا سر قلم کر دیا۔ بعض یورپی مورخوں [1] نے یوسف خان (پسر حسین شاہ چک) سے یوسف شاہ چک۔ (پسر علی شاہ چک) مراد لیا ہے مگر وہ صحیح نہیں ہے۔

شیر افگن کو مارنے کے ساتھ ہی یوسف خاں، جہانگیر کا منظورِ نظر بن گیا۔ اس نے حیدر ملک کو بھی کشمیر کا صوبیدار بنایا [2] قابلیت اور صلاحیت کے باوجود یوسف خاں نے کشمیری سیاست میں کوئی دلچسپی ظاہر نہیں کی۔ کیونکہ اسے اپنی بصیرت سے کشمیر کے نااہل اقتدار کوشوں کی آوارہ گردی بے مقصد نظر آتی تھی۔ اسے وسیع اور طاقتور مغلیہ سلطنت میں کشمیر کا

---

[1]: مثلاً Persian Literature: C.A. Storey, P.680 اور Reiu's Catalogue, Vol I, P. 297

[2]: حیدر ملک کی تاریخ کا کوئی نسخہ کشمیر میں موجود نہیں تھا۔ تاریخِ کشمیر کے بلند پایہ محقق پروفیسر صاحبزادہ حسن شاہ (سابق اسسٹنٹ ڈائریکٹر) نے ۱۹۵۲ء میں اس کے عکس انڈیا آفس لائبریری اور برٹش میوزیم سے منگوا کر اس کے مخطوطے تیار کروائے۔ شکر اللہ مساعیہ۔

مکمل انضمام بالکل قریب نظر آتا تھا۔ اس کے خاص دوست ملک حیدر نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

یوسف خاں ولد حسین شاہ برائے صواب نمائی و ذہن و فراست و پیش بینی دریافتہ کہ دیگر سعی و تردد کردن دریں ملک آہن سرد کشتن است۔[1]

یوسف خاں (فرزند حسین شاہ چک) اپنی صواب دید اور عقلمندی سے پہلے ہی یہ جان چکا تھا کہ اب کشمیر میں اقتدار حاصل کرنے کی کوشش کرنا سرد لوہا کوٹنے کے مرادف ہے۔

اس طرح یوسف خاں کی بے رغبتی سے یوسف شاہ چک کشمیر کا بلا شرکتِ غیرے حکمران ہوا مگر جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا کہ یوسف شاہ فطرةً عیش کوش اور چنگ و رباب کا دلدادہ تھا، جیسا کہ معاصر مورخ حیدر ملک بھی اعتراف کرتا ہے:

"بعد از فوت ابدال خاں چوں شریکے در سلطنتِ یوسف شاہ نماندہ باد نخوت و غرور بہ دماغش راہ یافتہ بکلی رابنظر نیاوردہ اکثر با زنانِ مغنیہ و قوالاں و کلاونتاں بسر برد و ازیں معنی خوف سیاستِ ملکی از خاطر اہالی و موالی بدر رفت۔"[2]

اس طرح روز بروز ملک کا نظم و نسق بگڑتا گیا۔ اس وقت مغل دربار میں کشمیر کے سربر آوردہ علماء اور ارباب سیاست موجود تھے اور وہ سب مغلوں کی فوجی مداخلت کے خواہش مند تھے۔ یوسف شاہ چک

---

[1]: تاریخ کشمیر (قلمی)۔ [2]: ایضاً۔

نے اپنا اقتدار قائم رکھنے اور ساتھ ہی مغلوں سے مخاصمت مول نہ لینے کی کوشش کی۔ اس کے لئے اس نے یہ احمقانہ طریقہ اختیار کیا کہ کشمیر میں اپنے سیاسی حریفوں کو مغلوب کرنے کے لئے اکبر سے فوجی امداد کی درخواست کی۔ اکبر نے جو مناسب وقت کا منتظر تھا' ایک لشکر جرار کشمیر کی طرف روانہ کیا۔ یوسف شاہ چک کو اپنی سیاسی حماقت اور اکبر کے اصلی عزائم کا احساس ہوا۔ اس نے اپنا استمداد کا عدم قرار دیا اور خود بھاگ کر کشمیر لوٹا۔ یہاں اس نے زور و شور سے مغل فوج کا مقابلہ کرنے کی تیاری شروع کی۔ مغلوں نے اسے غداری سے تعبیر کر کے اپنی پیش قدمی جاری رکھی۔ یوسف شاہ نے کشمیر کی سرحدوں پر حملہ آور فوج کو نقصان پہنچایا' مگر یوسف شاہ کی حقیقت مغل فوج کے سامنے ایک تنکے کے برابر تھی۔ جب اُسے اپنی شکست کا یقین ہوا تو اُس نے مان سنگھ کی صلح کی پیشکش قبول کی۔ مان سنگھ نے اُسے جان کی امان دے کر دربارِ اکبری میں پہنچایا اکبر نے اُسے وطن سے دُور رہنے کا حکم سُنایا۔

یوسف شاہ چک گرفتار ہوا تو اس کے بیٹے یعقوب شاہ چک نے اپنے باپ کو مردہ تصور کر کے اپنی تخت نشینی کا اعلان کیا۔ اُس نے ایک طرف مغلوں سے ٹکر لینے کا تاثر دیا مگر دوسری طرف شراب خوری اور بھنگ نوشی کو ایک لمحہ کے لئے بھی ترک نہ کیا۔ اصل میں اُسے جب اقتدار کی کشتی پوری طرح ڈوبتی نظر آئی تو وہ اپنے نئے پرانے حریفوں اور مخالفوں سے جلد جلد انتقام لینے کے لئے مضطرب ہوا۔ ان میں علمائے اہلِ سُنت والجماعت نمایاں تھے۔ چنانچہ کشمیر میں کشت خون اور

خانہ جنگی کا بازار پھر گرم ہوا۔ یہ خونین ڈرامہ اُس وقت اختتام کو پہنچ گیا جب یعقوب شاہ نے ایک مقتدر سیاسی اور مذہبی شخصیت قاضی موسیٰ سے انتقام لینے کا پختہ ارادہ کیا۔ اُن کا جرم یہ تھا کہ انہوں نے سالہا سال پہلے یوسف شاہ چک کے ایک سیاسی حریف ابدال ماگرے کی لاش اُس وقت میدان سے کئی دن بعد اٹھا کر محفوظ جگہ دفن کروائی تھی۔ جب یوسف شاہ نے اس لاش کو میدان جنگ میں ہی بے گور و کفن چھوڑ دیا تھا۔ یوسف شاہ نے اپنے عہدِ حکومت میں قاضی موسیٰ سے اس "جرم" کی پرسش نہیں کی تھی مگر اب یعقوب شاہ نے آج اپنی انتقامی آگ اُن کے خون سے بجھانے کا عزم کیا، اس کے لئے اُس نے ایک پھیکا سا مذہبی بہانہ ڈھونڈا اس نے قاضی صاحب سے اذان میں علیؑ ولی اللہ اضافہ کرنے کے جواز میں فتویٰ طلب کیا قاضی صاحب نے نہ صرف اسے رد کر دیا بلکہ مسجد میں علی الاعلان مسلمانوں کو نوربخشیوں کے عزائم سے آگاہ رہنے کی تلقین کی۔ یعقوب شاہ نے قاضی صاحب کو انتہائی بے دردی سے قتل کروایا۔ یہ شہادت اس سفاکی اور ظالمانہ طریقے پر عمل میں لائی گئی کہ اعتدال پسند شیعہ مؤرخوں نے بھی اس پر دکھ اور افسوس ظاہر کیا ہے۔ مؤرخ حیدر ملک (جو ایک ٹھیٹھ نوربخشی مگر تحقیق پسند مؤرخ ہیں) دُکھ کا اظہار کرنے کے ساتھ ساتھ بطور ہمدردی مشورہ دیتے ہیں کہ قاضی موسیٰ نے اگر اس "حدیث" استر ذہبک و ذھابک و مذھبک (یعنی اپنی دولت، اپنی منزل اور اپنا مذہب چھپا کر رکھنا چاہئے) پر عمل کیا ہوتا تو ممکن تھا کہ وہ بچ جاتے۔"

مگر جس طرح محدثینِ اہلسنّت والجماعت کے نزدیک اس حدیث کی کوئی بنیاد ہی نہیں ہے اسی طرح دینِ حق کے مخلص اور سرفروش خادموں کے ہاں اس قسم کی "بہادرانہ بزدلی" کا وجود نہیں ملتا۔

قاضی موسیٰ کی شہادت یعقوب شاہ چک کے محل اور مملکت کے لئے قہرِ الٰہی کا صاعقہ بن کر نازل ہوئی۔ مغل فوج جو پہلے ہی سرحد پہ موجود تھی اور موسم ٹھیک ہونے کی منتظر تھی، کشمیر داخل ہوئی۔ یعقوب شاہ نے چھپ چھپ کر بستیاں جلانے اور شبخوں مارنے سے مغل فوج کیلئے رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کی، مگر یہ ساری اچھل کود اس کی سراسیمگی کا نتیجہ تھی۔ اُسے بہت جلد گرفتار کیا گیا اور دربارِ اکبری کی طرف روانہ کیا گیا۔ اکبر نے باپ اور بیٹے دونوں کو بہار کی طرف جلاوطن کیا جہاں وہ وقتِ موعود پر طبعی موت مر گئے۔

غیر ملکی تسلط کے منفی اثرات | وسیع سلطنتِ مغلیہ کا ادنیٰ سا جزو بننے کے ساتھ ہی کشمیر جریدۂ عالم پر اپنا انفرادی مقام کھو بیٹھا جو ملک ہزار ہا سال سے آزاد اور خودمختار Independent تھا اب وہ مغلوں کے لاہور میں متعین صوبیداروں کا دست نگر Dependent بن گیا۔ مگر یہ قانونِ قدرت کے عین مطابق تھا۔ جب جب کشمیر نے للتادتیہ اور سلطان شہاب الدین شاہمیری جیسے حکمران پیدا کئے تو بڑی سے بڑی بیرونی طاقت نے بھی کشمیر کی طرف سر اٹھانے کی جرأت نہیں کی تھی اور جب سہہ دیو اور یوسف شاہ چک جیسے نکمے حکمرانوں کو جنم دیا تب اس کا وجود ہی خطرے میں پڑ گیا۔ مغلوں نے جونہی کشمیر پر اپنا قبضہ جمایا تو انہوں نے یہ قبضہ مستحکم کرنے کے لئے تمام ممکنہ

تدبیریں بروئے کار لائیں۔ انہوں نے اہلِ کشمیر سے خود سری اور جنگجوئی کی صلاحیت ختم کرنے کے لئے انہیں عیش کوشی اور راحت طلب بنایا اس غرض کے لئے انہوں نے مختلف باغات بنوائے۔ اپنی سطوت و صولت کی دھاک بٹھانے کے لئے ابھرتے کوہ ماران کے اردگرد بہت مہیب دیوار کھڑی کر دی جس کا کوئی دوسرا مقصد ہی نہیں تھا۔ اس کے برعکس یہاں ایک بھی علمی ادارہ قائم نہیں کیا گیا۔ مغلوں کے توسّع اور آزاد خیالی سے کشمیر میں متضاد اور مختلف فرقے ایک ساتھ پنپتے رہے اور مغل حکمران یکساں طور پر ان کی ہمت افزائی اور پشت پناہی کرتے تھے اس سے کشمیر میں فرقہ واریت کی چنگاریاں بجھنے کے بجائے سلگتی رہتی تھیں اور اس سے حکومت کو فائدہ پہنچتا تھا۔ مغل حکمران گھاگ سیاستدانوں کی طرح شیعہ اور سنّی فتنہ پردازوں کی سرپرستی کرتے تھے۔ اگر وہ ایک طرف سنّیوں کو اپنی دادرسی کا یقین دلاتے تھے تو دوسری طرف ان پر شیعہ گورنروں کو مسلّط کرتے تھے ان میں ظفر خان احسن کا نام قابلِ ذکر ہے وہ سخت شیعہ تھا مگر اس کے باوجود اسے دو مرتبہ کشمیر کا گورنر مقرر کیا گیا، اسی نے اپنی مرکزی لابی کی مدد سے مشہور صوفی اور مبلغ حضرت خواجہ خاوند محمود نقشبندی کو شاہجہان کے حکم سے کشمیر سے نکلوایا۔[۱] انہیں پھر کبھی

---

(۱) مولانا غلام سرور لاہوری ان کے مقام و مرتبہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "پیش جلال الدین اکبر و جہانگیر و شاہجہان قبولِ عظیم یافت، بحدیکہ بیگمات دستورات شاہی ہم از آنحضرت پردہ نہ داشتند۔" خزینۃ الاصفیا، ج ۲، ص ۶۲۵۔

کشمیر آنے کا موقعہ نہیں دیا گیا، یہاں تک کہ اُن کا انتقال بھی کشمیر سے دور لاہور میں ہوا۔ مغل حکمرانوں پر شیعہ عالموں، شاعروں اور سیاست گروں کی جو مضبوط گرفت تھی اُس سے کشمیر بھی بے حد متاثر ہوا۔ ان لوگوں نے کھُل کر کشمیر میں ایرانی فکر و ثقافت پھیلائی، ان میں میر فتح اللہ شیرازی نے کشمیر میں لمبی مدّت گزاری۔ وہ کشمیر ہی میں سپردِ خاک ہیں[۱] یہی حال مشہور دریدہ دہن شیعی عالِم مُلا نور اللہ شوستری کا بھی ہے۔ کشمیر کے بارے میں اس کی متعصّبانہ ذہنیت اس کی کتاب میں جگہ جگہ نمایاں ہوتی ہے[۲]

اورنگ زیب کے فیوض | تاہم سلطان محی الدین اورنگ زیب عالمگیر کا دور اُس کے اسلاف سے مختلف تھا۔ وہ بذاتِ خود اسلام پسند اور بے راہ روی کے خلاف تھا۔ اس کا اثر کشمیر پر بھی پڑا۔ اس نے یہاں باغات کے بجائے مسجدیں تعمیر کیں۔ حسنؔ کے مطابق کشمیر میں اس کی بنائی ہوئی مسجدوں کی تعداد پانچ سو تھی (عالمگیر در عہدِ خود پانصد مساجد احداث نمود[۳])۔ اُس نے مخلص، متبحر اور دیندار علماء کی کھُل کر سرپرستی کی، جس سے اُن کے حوصلے نہایت بلند ہوئے اور انہوں نے آزادی سے کشمیر میں تعلیم اور اصلاحِ معاشرہ میں بیش بہا خدمات انجام دیں۔ ان میں شیخ حیدر خاں اور خواجہ معین الدین

۱: سرزمین ہند، علی اصغر حکمت، ص ۶۷۔

۲: مجالس المؤمنین۔

۳: تاریخ حسن، ج ۱، ص ۳۱۶۔

نقشبندی (فرزند خواجہ خاوند محمود نقشبندیؒ) خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ خواجہ صاحب حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے شاگرد تھے۔ شیخ حیدر، فتاویٰ عالمگیری کو مدون کرنے والوں میں بھی شامل تھے اورنگ زیب نے انہیں قاضی خان کا لقب دیا تھا۔ خواجہ معین الدین صاحب کو عالمگیر سے جسمانی تعلق بھی تھا۔ ان کی اہلیہ خواجہ عبدالرحیم دہبیدی کی بیٹی تھی اور خواجہ دہبیدی، عالمگیر کے بہنوئی تھے۔ خواجہ معین الدین صاحبؒ بلند پایہ عالمِ دین، صاحبِ قلم مصنف اور سربرآوردہ روحانی پیشواء اور مبلغ و مصلح تھے۔ وہ اورنگ زیب عالمگیر کی تجدید و اصلاح کے زبردست مداح و معترف تھے اسی جذبے کے زیرِ اثر انہوں نے اپنی کئی کتابیں جن میں قرآن حکیم کی دو تفسیریں فتاویٰ کا مجموعہ، عقائد و کلام پر لکھے ہوئے رسالے عالمگیر ہی پر معنون کی ہیں۔ رسالہ ردّ الملاحدہ میں وہ عالمگیر کو ان القاب سے یاد کرتے ہیں:

"المخدوم الاعظم صاحب السیف والقلم، رافع مراتب العلم الی غایتہ القصوی و دافع کلمۃ اهل البدعۃ الی الارض السفلی، المخصوص بالنفس القدسیۃ المکرم بالرویا الانسیۃ محی الدین ابوالظفر محی شاہ اورنگ زیب بہادر پادشاہ عالمگیر خلد اللّٰہ ملکہ و دولتہ۔"[۱]

ایک سرکردہ صوفی منش فاضل مولانا محمد امین گیلانیؒ اورنگ زیب کی علمی اور اصلاحی خدمات کی تعریف میں اس طرح رطب اللسان ہیں:

---

[۱]: ردّ الملاحدہ (قلمی)۔

در سماءِ عُلا چو مہرِ مُنیر | شاہ اورنگ زیب عالمگیر
در بساطِ زمیں خلیفۂ حق | ہمہ رَہ وارث از خلافتِ مطلق
حامیٔ شرع و سایۂ رحمٰن | مَبدا ءِ جود منبعِ احسان
دیدۂ معرفت دلِ صافش | عینِ میزانِ عدل و انصافش
دہر را فضل اوست فصلِ بہار | جودِ اُو ابر لیک گوہر بار
نیک بر لطفِ اُو فضائے اَمل | سہل از قہرِ اُو فنائے اجل
نورِ علم از ہدایتش روشن | محو قہرش ہمہ ضلال و فتن
اوست ظلماتِ کفر را قامع | نورِ ایمان ز روئے اُو لامع
اندریں خانقاہ مینا فام | دادہ آئین و رونق اسلام
برگزید از برائے اہلِ کمال | از کرامت مناصبِ اجلال

خوانِ جودی میانِ خلق نہاد
طالباں را ازاں وظائف داد[۱]

آگے مولانا ممدوح نے چند اشعار میں شہزادہ معظم کی بھی تعریف کی ہے۔

عہدِ مغلیہ کی درسگاہیں | جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا مغلوں نے سرکاری سطح پر کشمیر میں علوم و فنون کی منصوبہ بند طریقے پر نشر و اشاعت میں کوئی دلچسپی نہیں لی، جیسا کہ اولین شاہمیری سلاطین نے کیا تھا یہی وجہ ہے کہ ہمیں صدہا سال پر پھیلے ہوئے اس دور میں کوئی غیر معمولی مدرسہ کشمیر میں نظر سے نہیں گزرتا ہے۔ مگر پھر بھی اس تغافل سے کشمیر کی علمی ترقی میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوئی، جس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ پرانے مدارس سیاسی امن و سکون اور معاشی خوشحالی

---

[۱] : رسالہ فی اصول الحدیث (قلمی)

حاصل ہوتے ہی پھر آباد ہو گئے، بے شمار اہلِ علم ہندوستان بلکہ ایشیا کے اہم علمی مراکز سے فارغ ہو کر جب کشمیر لوٹ آئے تو وہ جہاں بیٹھے وہاں مجلسِ درس جم گئی۔ اس طرح علماء کے گھر مستقل تعلیمی ادارے بن گئے، یہی حال خانقاہوں کا ہوا مغل حکمرانوں نے انہیں ان جاگیروں سے پھر نوازا جن کو چک امراء اور سلاطین نے ضبط کیا تھا۔ ان خانقاہوں میں ایک بار پھر بہار آئی اور بہترین تعلیمی اور تحقیقی مرکز بن گئے۔

درسگاہِ مُلّا حیدر | علامہ حیدر چرخی (تلمیذ شیخ عبد الحق محدث دہلوی) نے جہانگیر کے عہدِ حکومت میں گوجوارہ سرینگر میں قائم کی اور عرصۂ دراز تک موجود رہی۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے فرزند اس کے مہتمم مقرر ہوئے۔ ڈاکٹر محی الدین صوفی لکھتے ہیں کہ کشمیر کے سربرآوردہ علماء اسی درسگاہ کے فارغ التحصیل تھے[۲] محدث جلیل مولانا عنایت اللہ شالؒ مولانا عبد الرشید زرگر، مفتی محمد طاہر اور حضرت شیخ محمد عشقی رادھو جیسے اکابر علماء اسی مدرسے سے فارغ ہوئے تھے۔ ان کے فضل و کمال اور تدریسی خدمات کا تذکرہ زیرِ نظر کتاب میں مناسب مقامات پر آئے گا۔

مدرسۂ سید منصور | یہ مدرسہ ۱۱۲۵ھ (۱۷۱۳ء) میں وجود میں آیا تھا۔ اُس وقت مغلوں کی طرف کشمیر کے صوبیدار عنایت اللہ خان تھے جو قاضی موسیٰ شہید کی اولاد میں سے تھے۔ وہ خود اس مدرسے کے سربراہ رہے تھے، اس کے صدر مدرسوں میں اخوند مُلّا سلیمان کلوؒ فرزند مولانا ابو الفتح کلوؒ جیسے فاضل بھی رہے تھے۔ جو نہ صرف مدرس بلکہ عربی و فارسی کے بلند پایہ مصنف بھی تھے۔

۱؎ اعظمی ؛ تاریخ، ج ۳ - ۲؎ Koshir: A History of Kashmir, vol. 2

مدرسۂ فاضل خاں | فاضل خاں صوبیدار کشمیر اپنی رعایا پروری، علم نوازی اور رفاہِ عامہ کے کاموں میں مشہور گزرا ہے۔ اس نے ساڑھے تین سالہ صوبیداری کے زمانے میں سات سو چناروں کے درخت لگوائے۔ حسن آباد اور جوگی لنکر میں خانقاہیں تعمیر کیں اور نومسجد نگین کے متصل ایک حمام اور مدرسہ قائم کیا۔[1]

خانقاہِ شمسی چک | یہ خانقاہ آخری شاہمیری دور سے ہی علم و عرفان کی پیاس بجھانے والوں کے لئے چشمۂ صافی کی حیثیت رکھتی تھی۔ حضرت شیخ حمزہ مخدوم ؒ نے اس خانقاہ میں بیس سال قیام کرکے مراتبِ عالیہ حاصل کئے تھے۔[2]

خانقاہ میر سید علی ہمدانی ؒ | مغلیہ دور میں اس خانقاہ کو ایک مرتبہ پھر اپنی سابق رونق لوٹ آئی۔ علماءِ وقت یہاں درس دیتے تھے اور اصحاب قلم تصنیف و تالیف کا کام کرتے تھے۔

خانقاہ ملک جلال | ملک جلال الدین ٹھاکور کی خانقاہ بھی ایک مستقل درسگاہ کی حیثیت اختیار کر گئی۔ ملا حسین گنائی کے بارے میں مؤرخ اعظمی لکھتے ہیں،

"در خانقاہ ملا جلال الدین ٹھکور درس مے گفت۔"[3]

خانقاہِ نقشبندیہ | شاہجہاں اور اورنگ زیب کے زمانے میں حضرت خواجہ خاوند محمود نقشبندی کی خانقاہ دوسری تمام خانقاہوں میں اپنی علمی اور تربیتی سرگرمی میں ممتاز تھی۔ شیعہ صوبیدار نے شاہجہاں سے خواجہ صاحب پر کشمیر میں رہنے پر پابندی لگوائی۔ مگر ان کے نامور

---

[1]: اعظمی، ص ۱۹۰۔ [2]: اعظمی، ۱۷۹۔ [3]: اعظمی، ص ۱۴۳۔

فرزند خواجہ معین الدین صاحب نے اپنے والدِ بزرگوار کا سلسلۂ ارشاد و تبلیغ آگے بڑھایا۔ اس خانقاہ میں کشمیر کے سرکردہ علماء اور مصنفین درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کا کام کرتے تھے۔ اسی خانقاہ میں فقہ کی مشہور کتاب فقہ کے ممتاز علماء نے مدوّن کی جو فتاویٰ نقشبندیہ کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس کا تذکرہ ہم نے فقہ کے باب میں کیا ہے خواجہ صاحب کے انتقال کے بعد اولادِ نرینہ نہ ہونے کی وجہ سے اُن کی اہلیہ نے خانقاہ کا انتظام و انصرام بذاتِ خود سنبھالا اس طرح اس کا فیض جاری رکھا۔

مدرسہ مُلّا عبید اللہ کشمیر کے اُن سرکردہ علماء میں سے تھے جو اپنی نظیر صرف آپ تھے۔ مؤرخ محمد اعظم ان کے شاگردوں میں تھے اور نہایت انکسار کے ساتھ انہیں کا ذکر کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں: کہ مُلّا عبید اللہ جملہ علوم و فنون بالخصوص معقولات کے عجوبۂ روزگار متبحر عالم تھے۔ فرخ سیر ان کی بڑی قدر کرتا تھا اور اس نے انہیں عالمگیری کا فارسی میں ترجمہ کرنے پر مامور کیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ دور و دراز سے طلباء آتے اور ان سے تعلیم پاتے تھے۔ اُن کے شاگرد آسمانِ علم و فضل پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے۔

"چہ از مردمِ توران و ایران کہ در آں وقت وارِدِ ایں شہر مے شدند چہ از مردمِ کشمیر کہ بہ تربیت بخشِ مسندِ افادہ بودند بہرۂ علم و ادب مے اندوختند۔"[۱]

اگرچہ وہ بہت کم اپنے معاصرین کو خاطر میں لاتے تھے۔ تاہم مُلّا محمد محسن کھشو کے شاگرد ہونے پر فخر کا اظہار کرتے تھے۔ وہ بڑے صالح

---

[۱]: اعظمی، ص ۲۲۶۔

اور قانع و متوکل تھے۔ ان کا مدرسہ بھی باطنی برکات سے خالی نہیں تھا۔
"تعلیم مدرسہ آنجناب خالی از برکتے ہم نبود و یمن زیادتے داشت۔"[1]

اعظمی یہ بھی لکھتے ہیں کہ مُلّا محمد مرحوم کا صبح تا شام کا واحد مشغلہ درس و افادہ تھا، یہاں تک کہ رات کا ایک حصہ بھی اسی میں گذرتا تھا۔[2]

عہدِ مغلیہ کے ممتاز علماء اور مدرسین: عہدِ مغلیہ میں کشمیر کے تشنگانِ علم کو ایک حصار سے نکل کر دور و دراز کے علمی مقامات اور فکری مراکز تک پہنچنے اور استفادہ کرنے کا موقعہ ملا۔ اگرچہ اس سے پہلے بھی کچھ طلباء علم کی پیاس بجھانے کیلئے افغانستان، ایران اور حرمین جاتے تھے مگر اب ان کی تعداد میں زبردست اضافہ ہوا گویا انہیں اب وسیع سلطنت کا حصہ بنتے ہی اس کے فوائد و ثمرات کا حصہ دار ہونے کا احساس ہوا یہ علماء پورے ہندوستان کی خاک چھان لیتے تھے۔ عربی دینی علوم کے مدارس، صوفیائے کے مراکز اور اصحاب شعر و فن کی مجلسوں میں پہنچتے خود بھی فائدہ حاصل کرتے اور دوسروں کو بھی اپنی صلاحیتوں سے فائدے پہنچاتے تھے۔ شیخ یعقوب صرفیؒ، شیخ معین الدین چشتیؒ، شیخ حیدر رابتورؒ، علامہ حیدر قاضی خانؒ، شیخ محمد عاصمیؒ (برادرِ اصغر شیخ یعقوب صرفیؒ) علامہ داؤد خاکیؒ، محدث داؤد مشکوتیؒ، مولانا ابوالفتح کلو، ان کے فرزند مولانا سلیمانؒ، علامہ عنایت اللہ شالؒ، علامہ محمد محسن کھتوؒ، مولانا محمد امین گنائیؒ، علامہ عبدالرشید زرگرؒ، مولانا محمد یوسف مدرسؒ، مفتی محمد طاہرؒ وغیرہ اس دور کے وہ سربرآوردہ علماء تھے جو علمی

---

[1] و [2]: اعظمی، ص ۲۲۶۔

جامعیت، تصنیفی صلاحیت اور تدریسی شہرت میں ہندوستان کے اُن علماء سے کچھ کم مرتبہ نہیں رکھتے تھے جنہیں اُس زمانے میں مرجعیت حاصل تھی۔ ان علماء کے علاوہ جن دوسرے بزرگوں کو علم وبصیرت بالخصوص مدرسانہ کمالات سے متصف ہونے میں شہرت حاصل ہوئی تھی ان میں بابا فتح اللہ، مولانا محمد صالح (فرزند قاضی موسیٰ شہید) مُلّا حاجی گنائی، مُلّا عبدالرزاق بانڈے، قاضی محسن اندرواری مولانا یوسف گنائی، مولانا عبدالشکور تیلو وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان میں بعض علماء ہندوستان کے مختلف اداروں کی زینت بنکر رہ گئے۔ مثلاً مُلّا عبدالرزاق بانڈے کو شاہجہاں نے مدرسہ کابل کا صدر مدرس مقرر کر کے بھیجا۔ مولانا محمد علی کشمیری، عبدالرحیم خان خاناں کے منظورِ نظر بن کر رہ گئے۔ خان خاناں ہی کے حکم پر انہوں نے ضیاء الدین ترکمانی کی عربی کتاب حافش کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ مولانا محمد حسین کشمیری پٹنہ (عظیم آباد) کے مفتی مقرر ہوئے تھے۔ قاضی حیدر کو اورنگ زیب نے قاضی خان کا لقب دیا تھا، وہ کشمیر سے باہر قاضی اور میر عدل کے عہدوں پر فائز تھے۔

غرض سلطنت مغلیہ میں کشمیر کے علمی بازار میں ایک بار پھر وہ رونق عود کر آئی جو چک حکمرانوں کی نا اہلی اور غفلت شعاری سے تقریباً ختم ہوچکی تھی۔ مغل سلاطین خود بڑے عالم، علم پرور اور علماء کے مرتبہ شناس تھے۔ اس سے جہاں سارا ہندوستان بہرہ ور ہوا وہاں کشمیر بھی محروم نہیں ہوا۔

ہی عظیم مغلیہ سلطنت پر جو فضا چھا گئی وہ کشمیر تک پھیل گئی۔ مرکز کی قوت کمزور ہوتے ہی کشمیر کا نظم و نسق بگڑ گیا، اقتدار کوشوں کی دوڑ دھوپ پھر شروع ہوئی۔ جنہوں نے ایک بار پھر اپنی سیاسی آوارہ گردی سے عوام کا سکون درہم برہم کر دیا اگر ان میں کوئی شخص مخلص، جرأت مند اور باغیرت ہوتا تو کشمیر کو کم از کم غیر ملکی استیلائی سے نجات دلا کر اپنے مقدر کا آپ مالک بنا سکتا تھا مگر بد قسمتی سے ان لوگوں کی حیثیت اوباشوں سے زیادہ نہیں تھی۔ جب انہیں خوف و ہراس اور فتنہ و فساد پھیلانے سے کچھ حاصل نہیں ہوا تو اب ان کی آنکھیں افغانستان کے درانیوں کی طرف اٹھ گئیں، ان میں ایک شخص میر مقیم کنٹھ کے بارے میں ایک مورخ نے صاف الفاظ میں لکھا ہے کہ وہی افغانوں کے کشمیر پر قبضہ جمانے کا محرک تھا۔[1] درانی سلطنت اس وقت احمد شاہ ابدالی کی قیادت میں پورے عروج پر تھی اور احمد شاہ سکھوں اور مرہٹوں کی قوت توڑنے میں مصروف تھا۔ اس کی فوج کے ایک دستے نے کشمیر کو اپنی ترکتازیوں کا نشانہ بنایا اور کسی خاص مزاحمت کے بغیر مغلوں کی نااہلی، کمزوری اور کشمیر کے سیاست گروں کے سر پھٹول سے ۱۷۵۲ء میں کشمیر پر قابض ہونے میں کامیاب ہو گئی۔

احمد شاہ ابدالی بذاتِ خود کشمیر کبھی نہیں آیا۔ وہ قابل اعتماد افغانوں کو صوبیدار بنا کر کشمیر کا نظم و نسق سنبھالنے پر مامور کرتا تھا کشمیر کی معاشی و معاشرتی بربادی کے اصلی ذمے دار یہی افغان صوبیدار

---

[1] [illegible]

اور اُن کے حاشیہ بردار تھے۔ ان صوبیداروں نے، جن میں اگرچہ کچھ لوگ دیندار اور صوفیائے کرام کے ارادتمند بھی تھے، مجموعی طور پر کشمیر میں شرمناک لوٹ کھسوٹ، دہشت گردی اور بربریت کی مہیب یادیں تازہ کر دیں۔ اس دور کے ممتاز مورخ میر سعد اللہ شاہ آبادی، جو جمعہ خان صوبیدار (۱۷۸۷ء تا ۱۷۹۲ء) کا معاصر تھا، کے درج ذیل اشعار سے ابدالی صوبیداروں کے کارناموں کا صحیح اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

ظلم شاہاں ز جورِ سلطاناں — یکقلم کرد ملک را ویراں
ہر کسے دختریست می خواہند — عورتاں خود کنیزکِ شاہ اند
نائبِ شاہ بصوبۂ کشمیر — کہ بود قلعہ گیر پیشہ تدبیر
کرد از دختراں بکارت فاش — غیر ازیں نیست قلعہ گیریہ اش
شیوہ اش شوخی است و بیباکی — پیشہ اش غارت است و ضحاکی
گر اماں از کفش طلب دارد — مادرِ کیقباد نگذارد
زیں عروسک زنی کہ کارِ وی است — مادرش بالغئے حصارِ وے رست
پس چہ گویم ز مملکت رانی — چند ازو خواندہ درس ویرانی
زہ چہ ظالم کہ نیست ثانی او — ایں زمیں را بحکم رانی او
ہر زمیں را کہ خواست او آباد — تخم و آبش ز نہیبِ غارت داد
نیست در ہیچ شہر پیشہ وری — کہ نہ در قہرِ اوست بہر زری

آگے لکھتے ہیں:

عقدِ جمعیت از نظام افتاد — رخنہ در کارِ خاص و عام افتاد
ہمہ حیراں نہی زبانہ ز برگ — سر زد ایں بعث و نشر پیش از مرگ

شور قیامت چنانکہ نیست ضرور ۔۔۔ مر اسرافیل را دمیدن صور
کار و بار ہمہ دریں بازار ۔۔۔ بار مار عیال و کار فرار

اس طرح درانیوں کے لوٹ کھسوٹ، غارتگری، عصمت ریزی، اور بے انتہا حرص و ہوس نے کچھ دنوں کے اندر اندر حیرتناک حد تک اس ہرے بھرے چمن کو اُجاڑ دیا۔ ان حالات میں کسی نے درد و کرب کی حالت میں کہا تھا:

پرسیدم از خرابیٔ گلشن ز باغبان
فغاں کشید و گفت افغاں خراب کرد

حضرت شاہ ولی اللہ محدث رحمۃ اللہ علیہ، جو ابدالیوں سے ان کے مرہٹوں اور سکھوں کا مقابلہ کرنے پر حسنِ ظن رکھتے تھے، سے کشمیر کے اہلِ علم اپنی بے اطمینانی کا اظہار کرتے تھے۔ کیونکہ کشمیر میں ایسا ظلم و جبر اور بے حیائی و آبرو ریزی روا رکھنے کا کوئی جواز ہی نہیں تھا۔ ان کی سنگ دلی کے بارے میں مشہور تھا۔

"سر بریدن پیش ایں سنگ ۔۔۔ ان سنگدلوں کے ہاں دھڑ سے
دلاں گل چیدن است" ۔۔۔ سر اُکھاڑنا اتنا ہی معمولی ہے جتنا
پھول چننا۔

درانیوں کے عہد میں ہی کئی تباہ کن سیلاب اور زلزلے رونما ہوئے ان حالات میں حکمران طبقہ لوگوں کے مصائب دور کرنے کے بجائے عیش و طرب میں غرق تھا اور کسی بغاوت سے بچنے کے لئے مذہبی منافرت کو ہوا دیتا تھا۔ چنانچہ اسی بدقسمت دور میں دو مرتبہ ایسے ہولناک شیعہ اور سنی فسادات ہوئے جن میں فریقین نے

ایک دوسرے کی بستیاں اور مذہبی مقامات چشم زدن میں تودۂ خاک میں بدل دیئے۔

افغان دورِ حکومت کے ممتاز علماء ان بدترین حالات میں کشمیر میں علوم و فنون کا ترقی کرنا ایک غیر متوقع امر تھا۔ بہت سے لوگوں نے پرانی سُنّت تازہ کرکے ہجرت کی اور ہندوستان کے مختلف مقامات میں بکھر گئے۔ غریب عوام مفلوک الحال ہونے کی بنا پر زبردست قنوطیّت کا شکار ہوا۔ اور تیغِ تقدیر بہ موت کا انتظار کرنے لگے۔ اس طرح علوم و فنون کا بازار ایک بار پھر سُنسان پڑ گیا۔ اگرچہ اس دور میں ہمیں کوئی ایسا عالم نظر سے نہیں گزرتا ہے جو علمی تبحّر اور جذبۂ تجدید و اصلاح میں خواجہ معین الدین نقشبندیؒ یا علامہ داؤد خاکیؒ کے ہمسر ہوتا، تاہم مغل دور کی مقتدر علمی شخصیتوں کے فیض یافتہ بزرگوں میں جو ہجرت نہ کر سکے، مقدور کے مطابق اپنی ذمہ داریاں پورا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ بالخصوص شیخ معین الدین رفیقی (م۔ ۱۱۴۷ھ)، خواجہ نور الدین محمد آفتاب (م۔ ۱۱۵۶ھ)، مولانا ابوالفتح (م۔ ۱۱۴۹ھ)، عبدالوہاب نور آبادی (م۔ ۱۱۵۳ھ) میر سید محمد اسماعیل بخاری ہمدانی (م ۱۱۵۳ھ) جیسے مشائخ کرام جو آخری دورِ مغلیہ کی یادگار تھے اور جنہوں نے ابتدائی درانی عہد بھی دیکھا تھا، کے تلامذہ اور خلفاء و مسترشدین نے ارشاد و سلوک کا چراغ بجھنے نہیں دیا۔ ان میں شیخ رحمت اللہ، ملا محمد مقیم، شیخ عبدالسلام وکیل۔ اور مولانا مفتی ابوالوفا وغیرہم کے اسمائے گرامی قابلِ ذکر ہیں جن کے بارے میں اس دور کے مؤرخ

محمد اعظم دیدہ مری لکھتے ہیں : "امروز چراغ افروز خانۂ علم و عمل اند"[1]
ان کے علاوہ اس دور میں کچھ سرکردہ علماء یہاں تشریف لائے
جن سے بہت سے لوگوں نے علمی فوائد اور روحانی فیوض حاصل
کئے۔ ان میں شیخ عبدالولی طرخانی اور میر محمد یوسف نقشبندی،
خواجہ پادشاہ قابلِ ذکر ہیں۔ اول الذکر شیخ محمد عابد سندھی محدث
کے شاگرد تھے۔ اس طرح ان کے توسط سے کشمیر کے اہلِ علم اور
طلباء سندھ کے ایک جلیل القدر محدث کے فیوض سے گھر بیٹھے مستفید
ہوئے۔ مزید برآں کچھ تشنگانِ علم ملحقہ ممالک کے علمی مراکز کی
طرف اب بھی جاتے تھے۔ چنانچہ اس دور میں بخارا میں کشمیر کے
کچھ طلباء پائے گئے۔[2]

سکھ اور ڈوگرہ عہدِ حکومت | افغانستان میں احمد شاہ ابدالی کی حکومت
اس کے انتقال کے ساتھ ہی زوال کی طرف بڑھنے لگی تو کشمیر بھی متاثر
ہوا۔ اس نے کشمیر کے ارباب سیاست کو اپنی قوم کی تقدیر سنبھالنے
کے لئے ایک اور قیمتی موقعہ فراہم کیا مگر اپنی مکمل نا اہلیت، نا عاقبت
اندیشی اور ہنگامہ آرائی سے انہوں نے یہ موقعہ بھی گنوا دیا۔ اس
دوران کچھ دوسرے اندرونی اور بیرونی عناصر پیدا ہو چکے تھے،
جنہوں نے کشمیر کے عوام کو مکمل طور پر مجبور کر رکھا تھا۔ جونہی
پنجاب میں سکھوں نے اپنی حکومت قائم کی تو انہوں نے کشمیر پر تیس
ہزار فوجوں کی مدد سے حملہ کیا۔ اس وقت جبار خان کشمیر کا صوبیدار

---

[1]: تاریخ اعظمی، ص ۲۶۶۔
[2]: The Cambridge History of Islam, Vol. I, P. 479

تھا۔ اُس نے بھی سکھوں کا مقابلہ کرنے کی تیاری کی، مگر ٹڈی دل فوج کے سامنے شکست کھائی۔ جونہی اُسے اپنی شکست کا یقین ہوا تو اپنے اسلاف کی روایت برقرار رکھتے ہوئے اولین فرصت میں لوٹ کھسوٹ کا مال اکٹھا کیا اور اسے جانوروں پر لاد کر کابل کی طرف روانہ ہوا۔ اس طرح کشمیر ۱۲۳۴ھ مطابق ۱۸۱۹ء میں پنجاب کی سکھ سلطنت کا جُزو بن گیا۔

اس مرتبہ سکھوں کو کشمیر پر قبضہ جمانے میں سب سے زیادہ تعاون یہیں کے کچھ سیاست آشنا پنڈتوں نے دیا تھا۔ اِن میں پنڈت بیربل در اور اس کا بیٹا راجہ کاک در قابلِ ذکر ہیں۔ اصل میں جونہی ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کمزور ہو گئی اور سکھ، جاٹ اور مرہٹے ہندوستان کی سیاست پر چھا گئے اسی وقت سے کشمیر کے کچھ ہندوؤں کے دلوں میں بھی نئی امنگیں اور آرزوئیں پیدا ہو گئیں۔ اگر انتہائی اقلیت میں ہونے کی بنا پر وہ بذاتِ خود کوئی بڑا انقلاب لانے کے اہل نہیں تھے تاہم انقلاب لانے والوں کو قیمتی مدد فراہم کرنے میں خاص ہی صلاحیت رکھتے تھے۔ اس کا بہترین موقعہ انہیں اس وقت حاصل ہوا جب ڈوگرانیوں نے اپنے عہدِ حکومت میں پنجاب کے ایک کھتری راجہ سوکھ جیون مل کو کشمیر کا صوبیدار بنا کر بھیجا اس نے ابتدا میں اپنے انصاف پسند اور علم دوست رعایا پرور ہونے کی نمائش کی جس سے وہ شروع میں ہر دل عزیز بن گیا مگر کچھ ہی وقت کے بعد اپنی حکمتِ عملی بدل دی۔ اس نے کشمیر کے پنڈتوں

کو اپنا مقرب بنا کر مسلمانوں کی مذہبی آزادی سلب کرنے کی علی الاعلان کوشش کی۔ جن پنڈتوں کو اس نے اونچے مناصب پر فائز کیا۔ انہوں نے مسلمانوں کو بڑی سختیوں میں مبتلا کر دیا۔ سوکھ جیون مل کے بعد ہی فتح خاں، مدد خاں، غفار خاں وغیرہ صوبیداروں کے زمانے میں پنڈتوں کا کشمیر کے انتظامیہ میں عمل دخل اتنا بڑھ گیا کہ وہ اپنے ہموطنوں کے لئے کسی راحت کا باعث نہیں بن سکے۔ مؤرخ سعد اللہ لکھتے ہیں :

تا بدیوانی یافت دخل ہنود　　　دفتر ظلم را حساب افزود

خاص غفار خاں صوبیدار کے بارے میں کہتے ہیں :

رتق و فتقش ہنود را فرمود　　　شوکت و شانِ کافراں افزود
کارِ ہندو چو داش گو نہ بود　　　ملک را راستی چگونہ بود؟ [۱]

جب سکھ برسرِ اقتدار آگئے تو اربابِ ریاست پنڈتوں کے حوصلے نہایت بلند ہوئے۔ پنڈت بیربل در نے سکھوں کو کشمیر پر حملہ کرنے کی منت سماجت کی۔ اس مقصد کے لئے اس نے سکھوں کو کامیابی کا یقین دینے کے لئے اپنے بیٹے راج کاک در کو بطور یرغمال ان کے پاس رکھا اور خود سکھ فوج کی راہنمائی کرنے لگا۔ جب سکھ تسخیرِ کشمیر میں کامیاب ہوئے تو انہوں نے اپنے ان محسنوں کی بڑی قدر کی۔ سکھوں نے اپنے اٹھائیس [۲۸] سالہ دورِ حکومت میں

---

[۱] : باغ سلیمان (قلمی)۔

[۲] : ڈی۔ پی۔ در اسی خاندان سے تعلق رکھتے تھے جو اپنی ذہانت میں اپنے اسلاف سے بڑی مشابہت رکھتے تھے۔

کشمیر کے مسلمانوں پر جو بے پناہ مصیبتیں ڈھائیں ان میں انہیں پنڈت بیربل در جیسے درباری پنڈتوں کا بھی تعاون حاصل تھا۔ تاہم پنڈت بیربل در کا یہ کارنامہ اس لحاظ سے قابل داد ہے کہ جب سکھوں نے حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانی رح کی خانقاہِ معلیٰ کو توپوں سے اُڑانے کا پختہ ارادہ کیا تو پنڈت بیربل در نے خوفناک بلوہ پھوٹنے کے اندیشے سے انہیں ایسا کرنے سے روکا تھا۔

منصوبہ بند ظلم واستبداد ایک یورپی مقالہ نگار کشمیر پر افغانوں اور سکھوں کے مظالم کا موازنہ کرتے ہوئے یورپ میں بیٹھکر ـــــ لکھتا ہے:

"سکھ حکومت بھی ظالمانہ اور جابرانہ تھی مگر افغانوں سے پھر بھی اچھی تھی"[1]

اسکے برعکس ایک اور یورپی سیاح مورکرافٹ، جو اس دور میں خود کشمیر آیا تھا ـــــ لکھتا ہے:

"افغانوں کا ظلم منتشر تھا جبکہ سکھوں کا ظلم واستبداد منظم ہے۔ درانیوں کی لاپروائی کے باعث کچھ لوگ لوٹ کھسوٹ سے بچ بھی جاتے تھے جبکہ رنجیت سنگھ کا قہر وغضب منظم شکل میں ہے۔ رنجیت سنگھ کی حکومت حد درجہ ظالمانہ ہے"[2]

کشمیر کی تاریخ مورکرافٹ کے چشم دید حالات کی تائید کرتی ہے۔

---

1. Encyclopedia of Islam, Vol 2 "Kashmir"

2. Travells, Sir William Moorcraft, Vol 2, P293

سکھوں نے اقتدار سنبھالتے ہی اذان اور گاؤکشی پر پابندی عائد کی۔ جامع مسجد سرینگر پر تالا چڑھایا گیا اور مورکرافٹ نے اپنی سیاحت کے دوران (۱۸۱۹ء تا ۱۸۲۵ء) اِسے مقفل پایا تھا[1]۔ اسی طرح دوسری بہت ساری مسجدیں، جن میں مشہور نو مسجد سنگین بھی شامل تھی، نزولات میں شامل کروائی۔ ۱۲۳۵ھ میں رسوائے زمانہ سفاک ہری سنگھ نلوہ کشمیر کا صوبیدار بن کر آیا تو اس نے علماء اور مشائخ کے مناصب اور جاگیروں کو کالعدم قرار دے کر انہیں نانِ شبینہ کا محتاج بنا ڈالا۔ عام لوگوں کی حالت بیان کرتے ہوئے مورکرافٹ لکھتا ہے: کہ "ان کے پاس جو کچھ بھی ہے اس کو طلب کیا جاتا ہے۔ سکھ حکمران کشمیریوں کو مویشیوں سے بدتر سمجھتے ہیں۔ کوئی سکھ کسی کشمیری کو قتل کرتا ہے تو اس کو حکومت کی طرف سولہ سے بیس روپیہ تک جرمانہ کے طور پر ادا کرنے ہوتے ہیں۔ اس رقم میں مقتول کو چار روپیہ دیئے جاتے ہیں بشرطیکہ وہ ہندو ہو۔ اگر مقتول مسلمان ہوگا تو اس کے وارثوں کو صرف دو روپیہ دیئے جاتے ہیں۔"[2] مورکرافٹ آگے لکھتا ہے: "کشمیر کے لوگ ہمیشہ سے ایشیاء کے سب سے زیادہ باسلیقہ اور زندہ دل سمجھے جاتے تھے اگر مدبرانہ نظامِ حکومت انہیں میسر ہو تو ممکن ہے کہ یہ خوبیاں

۱؎: Travells, Vol 2. Page 294

۲؎: Travells, Vol 2. Page 293

کشمیر کے مسلمانوں پر جو بے پناہ مصیبتیں ڈھائیں اُن میں انہیں پنڈت بیربل در جیسے درباری پنڈتوں کا بھی تعاون حاصل تھا۔ تاہم پنڈت بیربل در کا یہ کارنامہ اس لحاظ سے قابل داد ہے کہ جب سکھوں نے حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانی رح کی خانقاہِ معلیٰ کو توپوں سے اُڑانے کا پختہ ارادہ کیا تو پنڈت مذکور نے خوفناک بلوہ پھوٹنے کے اندیشے سے انہیں ایسا کرنے سے روکا تھا۔

منصوبہ بندِ ظلم و استبداد | ایک یورپی مقالہ نگار کشمیر پر افغانوں اور سکھوں کے مظالم کا موازنہ کرتے ہوئے یورپ میں بیٹھکر ــــ لکھتا ہے:

"سکھ حکومت بھی ظالمانہ اور جابرانہ تھی مگر افغانوں سے پھر بھی اچھی تھی"[۱]

اسکے برعکس ایک اور یورپی سیاح مورکرافٹ، جو اس دور میں خود کشمیر آیا تھا ــــ لکھتا ہے:

"افغانوں کا ظلم منتشر تھا جبکہ سکھوں کا ظلم و استبداد منظم ہے۔ درانیوں کی لاپروائی کے باعث کچھ لوگ لوٹ کھسوٹ سے بچ بھی جاتے تھے جبکہ رنجیت سنگھ کا قہر و غضب منظم شکل میں ہے۔ رنجیت سنگھ کی حکومت حد درجہ ظالمانہ ہے"[۲]

کشمیر کی تاریخ مورکرافٹ کے چشم دید حالات کی تائید کرتی ہے۔

ر۱: Encyclopedia of Islam, Vol 2 "Kashmir"

ر۲: Travells, Sir William Moorcroft, Vol 2, P293

سکھوں نے اقتدار سنبھالتے ہی اذان اور گاؤکشی پر پابندی عائد کی۔ جامع مسجد سرینگر پر تالا چڑھایا گیا اور مورکرافٹ نے اپنی سیاحت کے دوران (۱۸۱۹ء تا ۱۸۲۵ء) اِسے مقفل پایا تھا[1]۔ اسی طرح دوسری بہت ساری مسجدوں، جن میں مشہور نو مسجد سنگین بھی شامل تھی، نزولات میں شامل کروالی۔ ۱۲۳۵ھ میں رسوائے زمانہ سفاک ہری سنگھ نلوہ کشمیر کا صوبیدار بن کر آیا تو اس نے علماء اور مشائخ کے مناصب اور جاگیروں کو کالعدم قرار دے کر اُنہیں نانِ شبینہ کا محتاج بنا ڈالا۔ عام لوگوں کی حالت بیان کرتے ہوئے مورکرافٹ لکھتا ہے: کہ "ان کے پاس جو کچھ بھی ہے اس کو سلب کیا جاتا ہے۔ سکھ حکمران کشمیریوں کو مویشیوں سے بدتر سمجھتے ہیں۔ کوئی سکھ کسی کشمیری کو قتل کرتا ہے تو اس کو حکومت کی طرف سولہ سے بیس روپیہ تک جرمانہ کے طور پر ادا کرنے ہوتے ہیں۔ اس رقم میں مقتول کو چار روپیہ دیئے جاتے ہیں بشرطیکہ وہ ہندو ہو۔ اگر مقتول مسلمان ہوگا تو اس کے وارثوں کو صرف دو روپیہ دیئے جاتے ہیں۔"[2] مورکرافٹ آگے لکھتا ہے: "کشمیر کے لوگ ہمیشہ سے ایشیاء کے سب سے زیادہ باسلیقہ اور زندہ دل سمجھے جاتے تھے اگر مدبرانہ نظام حکومت انہیں میسر ہو تو ممکن ہے کہ یہ خوبیاں

۱: Travells, Vol 2. Page 294

۲: Travells, Vol 2. Page 293

ان میں دوبارہ پیدا ہو جائیں مگر اس وقت اس جیسی گری ہوئی نسل کا دنیا میں کہیں اور وجود نہیں ہے۔[1]

غرض سکھوں کی بربریت، لوٹ کھسوٹ اور قتل و غارتگری سے جس طرح شمالی ہندوستان کے سارے مسلمان دوچار تھے اسی طرح بلکہ ان سے کہیں زیادہ کشمیر کے مظلوم لوگ بھی تھے۔ پھر ان میں قوت مدافعت و مزاحمت افغان ظالموں نے پہلے ہی فنا کر دی تھی اس لئے سکھ حکمراں یہاں زیادہ جری اور بے باک ہو گئے تھے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اگر ایک طرف اس حال میں ان کی خونخواری اور سلب و نہب پر اپنے غم و اندوہ کا اظہار کرتے تھے:

جزی اللّٰہ عنا قوم سکھ و مرہٹہ عقوبۃ شر جزئی غیر اجمل
وقد قتلوا جمعاً کثیراً من الوریٰ وقد اوجعونی اہل شاء و جاہل

(خدا سکھوں اور مرہٹوں کو جلد ہی ان کی برائیوں کا سخت بدلہ دے۔ انہوں نے بہت سارے لوگوں کو قتل کر ڈالا یہاں تک کہ معصوم عوام اور چرواہوں کو بھی نہیں چھوڑا۔ جن کی وجہ سے مجھے دکھ پہنچا ہے۔)

تو دوسری طرف کشمیر کے مسلمان اس طرح خون کے آنسو بہاتے تھے:

جرم ما ، مارا بجود امنگیر شد قوم سنگاں وارد کشمیر شد

ڈوگروں کی سودا بازی | سکھوں نے ستائیس سال تک (۱۸۱۹ء تا ۱۸۴۶ء) کشمیر کو تاراج کیا۔ اس کے بعد جموں کے ڈوگروں نے انگریزوں سے ساز باز کر کے سکھوں کو اقتدار سے محروم کرنے اور اپنا قبضہ جمانے

---

[1] Travells, p. 128

میں کامیابی حاصل کی۔ ڈوگروں نے انگریزوں سے یہ سرزمین (بشمول ہزارہ و کوہستان) ۷۵ لاکھ مروجہ سکوں میں خریدی۔ یہ سیاسی تجارت خوبصورت وادی کے ساتھ ساتھ اس کے مظلوم باشندوں کے اجساد و ارواح سمیت ان کی مطلق ناواقفیت کی حالت میں امرتسر کے مقام پر طے ہوئی۔ علامہ اقبالؒ نے اسے سودا بازی سے تعبیر کیا اور جسٹس آنند نے اس تعبیر کو قانوناً صحیح قرار دیا ہے۔ جسٹس آنند لکھتے ہیں: کہ "کشمیر فروخت کرنے کے موقعہ پر اس کے اخلاقی اثرات کی جانب کوئی توجہ نہیں کی گئی، بھیڑ بکریوں کی طرح لاکھوں لوگ بیچ ڈالے گئے۔ اور اس سودا بازی کے موقعہ پر، جو اہل کشمیر کی عدم موجودگی کی حالت میں کی گئی، ان کے حقوق اور مستقبل کے بارے میں بیعنامہ امرتسر میں کوئی تذکرہ نہیں کیا گیا۔ ہندو ڈوگرہ حکمرانوں کی طرف اکثریتی طبقے یعنی مسلمانوں پر حکومت کرنے کے لئے بے انتہا طاقت منتقل کی گئی۔"[1]

ظاہر ہے جن حکمرانوں نے یہاں کی سرزمین اور اس کے بسنے والوں کو لوٹنے کی غرض سے خریدا تھا وہ اسے کیا دے سکتے تھے؟ ڈوگروں نے تقریباً ایک صدی تک (۱۸۴۶ء تا ۱۹۴۷ء) کشمیر پر حکومت کی۔ یہ مدت بالخصوص اس کا ابتدائی دور تاریخ کشمیر کا ہیبت ناک اور دل ہلا دینے والا دور گزرا ہے۔ اس دور کی حالت کا تھوڑا سا اندازہ ان یورپی سفیروں کے سفرناموں سے لگایا جا سکتا ہے جو سیاحت کی غرض سے اس زمانے میں کشمیر وارد ہوتے تھے۔

---

[1] The Development of the Constitution of Jammu & Kashmir, A.S. Anand, Delhi 1980, ص: 13

ان میں سے بعض اہلِ قلم نے اپنے سفرناموں کے نام ہی کچھ ایسے رکھے ہیں جن سے حقائق و واقعات کی عکاسی ہوتی ہے۔ آرتھر برنکمن Sir Arthur Brinkman نے کشمیر کے گناہ Wrongs of Kashmir، رابرٹ تھورپ Robert Thorp نے کشمیر کی بدانتظامی Kashmir Misgovernment، ولیم ڈگبے Sir William Digbay نے مذمتِ ناشنیدہ Condemned Unheared وغیرہ نام کے سفرنامے لکھے۔ ان میں انہوں نے ایسے واقعات درج کئے ہیں جنہیں پڑھ کر ہر اس شخص کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، جس میں انسانیت کی کی معمولی رمق موجود ہو۔ آرتھر برنکمن برطانوی حکومت کو آگاہ کرتے ہوئے لکھتا ہے: کہ "ہر سال سینکڑوں کشمیری ظلم و جبر اور عام بدنظمی کی تلخی سے نجات پانے کی غرض سے اپنا وطن، اہل و عیال اور گھر بار چھوڑ کر پہاڑوں کی طرف بھاگتے ہیں"[1] موصوف آگے بیان کرتا ہے: "غلامی تمام حیثیتوں سے کشمیر میں موجود ہے کوئی بھی کشمیری اپنی کسی چیز کا مالک نہیں ہے، زمین، پانی، لکڑی یہاں تک کہ اس کی روح بھی اس کی اپنی نہیں ہے۔ یہ لوگ تمام حقوق سے محروم ہیں۔ یہ سب کچھ ڈوگرہ راجاؤں کے بدولت ہو رہا ہے۔"[2] بیعنامہ امرتسر کا ہیرو گلاب سنگھ ڈوگرہ تھا۔ جو بقول مشہور معاصر صحافی ایم۔ جے اکبر اپنے زمانے میں جواہرات کا بدنام

۱: Kashmir Papers, Page 10

۲: " " "

زمانہ چور تھا۔[۱]" نامور مصنّف Frederic Drew نے لکھا ہے: کہ "مہاراجہ گلاب سنگھ ایک روپیہ پر جھپٹ پڑتا تھا۔[۲]" اس کی طبیعت کی دنائت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اگر کسی مصیبت کے مارے کو مہاراجہ کی توجہ اپنی طرف مبذول کرنے کی ضرورت پڑتی تھی تو وہ دُور سے ایک روپیہ دکھا کر کہتا تھا: عرض ہے! اور مہاراجہ متوجہ ہوتا تھا۔[۳] اس کی سنگدلی کا یہ عالم تھا کہ اس کے حکم سے قتل عمد پر مجرم کا پہلے مُثلہ کیا جاتا تھا، اس کے بعد پھانسی دی جاتی تھی۔[۴] کسان اور مزدور طبقے کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ وہ رات دن محنت کرنے کے باوجود شکم پالنے اور تن ڈھانکنے سے محروم تھے۔ جس طرح جموں کے ظالم حکمرانوں سے یہاں کے مسلمان خوفزدہ تھے اسی طرح وہ اُن ہم وطن پنڈتوں سے بھی مایوس تھے جو انتظامیہ پر چھائے ہوئے تھے۔ لارنس نے لکھا ہے کہ اگر یہ لوگ تعلیم اور ذہانت میں اپنے ہم وطن مسلمانوں سے فائق ہیں مگر دفتری ملازموں کی حیثیت میں یہ لوگ بے انتہا حریص، ظالم اور تنگ نظر ثابت ہوئے ہیں۔[۵]"

۱: India; The Seige Within: M.J. Akbar -

۲: The Jammu & Kashmir Territories, P. 50 - London 1875 - (ed)

۳: Kashmir Papers, Page X & XI

۴: The Jammu & Kashmir Territories: Fredric Drew, P. 50 - Kashmir. P. 10

۵: The Valley of Kashmir; Lawrance P. 282;

علمی زوال: ان ناگفتہ بہ حالات میں کشمیر میں کسی علم وفن (بالخصوص اسلامی فنون) کا پنپنا یا رواج پانا بعید از عقل تھا۔ ماہرینِ تعلیم نے علمی ترقی کے لئے سیاسی امن و سکون، اطمینانِ قلب اور خوشحالی لازمی شرطیں قرار دی ہیں۔ اور یہ تینوں چیزیں تھیں جنہیں افغان، سکھ اور ڈوگرہ حکمرانوں نے اوّلین فرصت میں نیست و نابود کر ڈالا تھا۔ اس سے علم و فکر کے سوتے دیکھتے دیکھتے خشک ہوئے، مدارس اجڑ گئے، مسجدوں اور خانقاہوں پر تالے چڑھ گئے۔

مہاراجہ رنبیر سنگھ نے بدنامی اور رُسوائی دُور کرنے کے لئے کچھ تعلیمی ادارے کھولے اور ترجمہ کا ایک ادارہ بھی قائم کیا تھا[۱] مگر شکستہ حال مسلمانوں کو تعلیم کی طرف راغب کرنے میں کوئی دلچسپی ظاہر نہیں کی۔ بے شمار علمی گھرانے جہالت کی تاریکی میں گم ہو گئے۔ بلند پایہ علماء حکمرانوں کی حوصلہ شکنی اور استبدادی احکامات کے شکار ہو کر علم کو خیرباد کہنے اور پیٹ پالنے کے لئے معمولی پیشے اختیار کرنے پر مجبور ہوئے، وہ اس اعتبار سے لائقِ تحسین ہیں کہ مظلوم بن کر علماء کی سطح سے اُتر کر ادنیٰ درجے کے پیشہ ور اور مزدور بننے کو ترجیح دی، مگر حالات سے مصالحت نہ کر کے ایسے "شرفاء" بننا ٹھکرا دیا جو ایک انسان کو ظاہری رکھ رکھاؤ برقرار رکھنے کے لئے معنوی بربادی میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ بہت سے اہلِ علم اپنی علمی اور فکری تشنگی کو کسی حد تک تسلی دینے کے لئے خطاطی اور کتابت کی طرف مائل ہو گئے

۱۔ ملاحظہ ہو، عبدالقادر سروری صاحب کا مضمون "مہاراجہ رنبیر سنگھ اور اس کا دارالترجمہ" نذرِ ذاکر، ص ۴۶۵۔ ۱۹۸۱ء نئی دہلی۔

ان میں جب لوگوں نے انہیں ذریعۂ معاش کے طور پر اپنایا وہ بدستور مفلوک الحال رہے۔ نیشاپور کے ایک کاتب ابو حاتم نے بہت پہلے اپنی حالت اس طرح بیان کی تھی:

ان الوراقۃ حرفۃ مذمومۃ　　محرومۃ عیشی بھا زمن
ان عشت عشت ولیس لی اکل　　او مت مت ولیس لی کفن

(کتابت قابل مذمت حرفت ہے۔ میں اس سے خوشحال زندگی گزارنے سے محروم رہا۔ اگر زندہ ہوں تو پیٹ پالنے کے لئے کچھ نہیں ہے۔ اگر مر جاؤں تو میرے پاس کفن کی بھی گنجائش نہیں ہوگی)
کشمیر کے کاتبوں کی حالت اس سے مختلف نہیں تھی۔

مسلمان معاشرے کی تباہی اور عقائد میں فساد۔

ظلم و جبر اور لوٹ کھسوٹ کی مسلسل ڈیڑھ سو (۱۵۰) سالہ حکومت سے کشمیر جیسی چھوٹی سی مملکت کے باشندوں کا معاشرہ اور کردار و عمل معتدل رہنا ناممکن تھا۔ ابتداء میں انہوں نے تھوڑی سی مزاحمت ضرور کی مگر بہت جلد ظلم کے آگے اس حد تک سپر انداز ہوئے کہ غیروں کے نزدیک "ظلم پرست" کہلانے لگے۔ اس سے جہاں چار سمت تاراجی اور خانماں بربادی کی مہیب فضا چھا گئی، وہاں رفتہ رفتہ قنوطیت اور افسردگی کا ایسا عالم طاری ہوا جس کی مثال کشمیر کی تاریخ میں نہیں ملتی ہے۔ جو قوم اپنی ذہانت اور عقلمندی میں پوری دنیا میں مشہور تھی یکایک فاسد اوہام، باطل عقائد اور جھوٹے عجوبات کی اسیر ہو گئی۔ مذہبی پیشواؤں کی جگہ ان لوگوں نے لے لی جنہوں نے

سیدھے سادھے لوگوں کو خوابوں، کرامتوں اور جنتر منتر کے چکر میں الجھا دیا۔ علم و تحقیق کی جگہ قصہ خوانی نے لے لی، قرآن و حدیث اور فقہ و عقائد جیسے علوم کے بدلے رمل و جفر اور عملیات رواج پانے لگے۔ اب وہ واعظ منبر و محراب پر نمودار ہونے لگے جو تصوف اور تزکیہ نفس کے نام پر زندگی سے نفرت اور فرار اختیار کرنے کی تبلیغ کرتے تھے۔ اس قسم کے مواعظ سے مسلمانوں سے قوت ارادی، کشمکش زندگی، مذہبی حمیت اور عزت نفس کی حس دیکھتے دیکھتے نابود ہو گئی۔ مولانا حیدر بن جمال الدین کشمیری (م ۱۱۴۳ء) اپنی دور کے واعظوں کے بارے میں لکھتے ہیں کہ یہ لوگ دلربا الفاظ اور خوشنما نکات سے عاقلوں کو بے ہوش کر کے انہیں عقل و فکر سے محروم کرتے ہیں۔ ان لوگوں پر رعونت سوار ہے اور عقل و علم سے محروم ہونے کے باوجود اپنے آپ کو سب سے بڑے عالم اور عارف سمجھتے ہیں حالانکہ ان کے اعمال ایسے ہیں کہ فاسق و فاجر ملحدوں اور ہندو برہمنوں کو بھی شرمندہ کر دیتے ہیں۔ عوام الناس گدھوں کے مانند ہو گئے ہیں۔ وہ نابینا ہو کر ان ہی داناؤں کی پیروی کرتے ہیں:

"از عوام الناس چہ گویم کہ ایشاں نابینا بند و در حقیقت تابع ہمیں دانا بند۔"[1]

مولانا حیدر یہ بھی لکھتے ہیں کہ اگر کوئی بھی خواہ ان لوگوں میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر کمر ہمت باندھ لے ہے یا ملحدوں

---

[1] : تنویر السراج (قلمی) خطبہ کتاب۔

اور بدعتیوں کو لگام دینے کی کوشش کرتا ہے تو یہ لوگ اُسے پاگل ٹھہراتے ہیں۔[1] بے عمل درویشوں اور ملنگوں کے ساتھ عقیدت ہونے لگی۔ صوفیائے اسلام نے اپنے اپنے دور میں انہیں سر اُٹھانے کا موقعہ نہ دیا تھا۔ مرزا حیدر دوغلات بھی، جس کو کشمیر کے سُنّی مسلمان عزّت کی نظروں سے دیکھتے تھے، اپنی حکومت کے زمانے میں درویش نما جیب کتروں کے سروں پر شمشیر برہنہ ثابت ہوا تھا۔

اسی طرح اسی تنزّل و انحطاط کے زمانے میں کشمیر کے بہت سے مسلمانوں میں نسلی غرور اور آباء پرستی کی دبا پھوٹ گئی جس نے بہت جلد کھلّی برہمنیّت اختیار کر لی۔ حضرت شیخ حبیب اللہ محبّی نوشہری نے بہت پہلے کشمیر کے مسلمانوں کو یہ وعظ و نصیحت فرمائی تھی:

ع

نہ حسب کار در تجارت حُبّا نہ نسب

ترک دعوئی فُلاں ابن فُلاں باید کرد

یا

ہرگز مگو کہ خواجہ اِم و خواجہ زادہ اِم

فخرِ عباد خاص ز حُسنِ عبادتست

مگر جب بصیرت پر جہالت کے پردے پڑ گئے تو مقدس اسلاف کے نصائح سُننے کی بھی صلاحیت ختم ہو گئی۔ جن سادات نے صرف دو صدیاں پہلے اپنے علم و عمل سے کشمیر کو گہری برہمنیّت سے نکال کر ایشیا کا اہم ترین اسلامی مرکز بنایا تھا، اب اُن کے اخلاف اپنی نالائقی اور بد علمی سے اپنے اسلاف کے لئے باعث رسوائی بن گئے۔ مشہور صوفی اور مرتاض بزرگ شیخ نظام الدین نور الٰہی (م - ۱۲۶۱ھ)

---

[1]: تنویر السراج (قلمی) خطبہ کتاب۔

نے اس دور کے "سیدوں" کے افسوسناک حالات ان دو اشعار میں سمونے کی اچھی کوشش کی ہے:

سیدانِ زمانہ سیہ ساماند — در لباسِ حسینؑ یزیدانند
آدمؑ از خاکِ سیدان نورست — آدمیت ز سیدان دورست[1]

اسی دور میں فتوئی فروشی بھی وجود میں آگئی۔ شہر میں چار حریف قاضی تھے جو ایک دوسرے سے دست وگریباں رہتے تھے۔ وہ واقعات کی تحقیق کرنے سے اپنے آپ کو بری الذمہ سمجھتے تھے اس لئے ان کے فتووں میں زبردست تضاد پیدا ہوتا تھا۔ لارنس لکھتا ہے، کہ مفتیوں کے اس غیر ذمہ دارانہ وطیرہ کی بنا پر کشمیر میں "تنہا بہ قاضی" کا محاورہ مشہور ہو گیا ہے[2]

بڑے رسوم اور بدعات سیئہ نے ہیبت ناک صورت اختیار کر لی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ اولیاء اللہ سے کشمیر کے مسلمانوں کی عقیدت ومحبت ہمیشہ سے ان کی عظیم الشان پونجی رہی ہے مگر اس زمانے میں اس نے ایک ایسی صورت اختیار کر لی تھی جو ایمان ویقین کو غارت کرنے کے لئے کافی تھی۔ لارنس نے یہی صورت حال دیکھ کر لکھا ہے: کہ "کشمیر کے مسلمان دل کے ہندو ہیں"[3]

اصلاحی کوششیں اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ ان سخت تاریک حالات میں بھی مختلف گوشوں سے بعض اللہ کے

۱: تاریخ حسن، ج ۳۔
۲: The Valley of Kashmir ص 296
۳: حوالۂ بالا، ص 282۔

بندے اصلاح وتبلیغ کی شمعیں جلاتے رہتے تھے۔ اگرچہ گھٹاٹوپ ظلمت کے سامنے ان کی روشنی بہت ہی معمولی ہوتی تھی مگر پھر بھی اس سے بہت سے بھٹکے ہوئے اللہ کے بندوں کو ہدایت کا راستہ نظر آیا۔ اس کی ابتدا حضرت سید احمد شہید رحمۃ اور حضرت شاہ محمد اسماعیل شہید رحمۃ کی اصلاحی کوششوں سے ہوئی۔ ان دونوں بزرگوں کو کشمیر کے ابتر سیاسی اور معاشرتی حالات پر بھی نظر تھی۔ کشمیر ان کی تحریک سے عملاً اس وقت متاثر ہوا جب بالاکوٹ مجاہدین کی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا، اور ان ایام میں بالاکوٹ اہل کشمیر کی سیرگاہ تھا۔ مجاہدین میں کشمیر کے کچھ مسلمان بھی شامل تھے، ان میں حاجی یوسف غازی کشمیری کا نام تاریخوں میں محفوظ ہے[1]۔ یہ کشمیری مسلمانوں کی ایک اور بدقسمتی تھی کہ جب حضرت سید احمد بریلوی اور حضرت شاہ محمد اسماعیل رح، نیز ان کے پیروکار مجاہدین نے جنوری ۱۸۳۱ء میں کشمیر داخل ہونے اور یہاں کے باشندوں کو سکھوں کے ظلم وستم سے خلاصی دلانے کی خواہش ظاہر کی تھی[2] تو اس سے پہلے ہی سکھوں کی ایک یلغار میں یہ دونوں جلیل القدر مجاہدین اسلام شہید ہوئے اور کشمیر آنے کی نوبت نہیں آئی۔

اصلاحی تحریک کا ایک دوسرا سلسلہ عدم تقلید کے علمبرداروں کی جانب سے بھی شروع ہوا۔ اس میں شک نہیں ہے کہ اگرچہ حضرت اصلاح وتبلیغ کی کوششوں میں زیادہ مخلص، دوراندیش اور حقیقت پسند واقع

۱: سیرت سید احمد شہید، مولانا غلام رسول مہر، ص ۳۱۳۔

۲: A History of Kashmir, Dr. Sofi, Vol. 2, P. 734

ہوئے ہوتے تو یقیناً ایک بڑا انقلاب لاتے۔ مگر یہ دونوں زیادہ تر میاں نذیر حسین صاحب محدّث دہلوی اور نواب سید صدیق حسن خان صاحب کے شاگرد ہوتے تھے جنہیں مسلک حنفی کو نیچا دکھانے کی غرض سے فروعی اختلافات کو رواج دینے کی زیادہ فکر رہتی تھی۔ اس طرح اس نے بھی کشمیر کے مسلمانوں کو فائدہ پہنچانے کے بجائے ایک دوسری خانہ جنگی کی مصیبت میں مبتلا کر دیا، مہاراجہ رنبیر سنگھ کے زمانے میں یہ مصیبت خوفناک صورت اختیار کر گئی تھی یہاں تک کہ مہاراجہ کو یہ تحریک بزور طاقت کچلنی پڑی۔[1]

تبلیغ و ارشاد اور اصلاح و تربیت کا تیسرا اور کامیاب سلسلہ حضرت شاہ محمد اسحاق دہلوی محدّث کے کشمیری تلامذہ کی طرف سے بھی شروع ہوا تھا۔ ان کی صحیح تعداد ہمیں معلوم نہیں ہو سکی، صرف تین بزرگوں کے اسماءِ گرامی ہمیں تاریخ و تراجم کی کتابوں میں ملے ہیں۔ اور وہ یہ ہیں:

(۱) حضرت شیخ احمد واعظ (۲) مولانا سیّد سعید اندرابی۔
(۳) شیخ احمد ترالی۔

اوّل الذکر دونوں بزرگ متبحّر عالم، فارسی و عربی کے جلیل القدر مصنّف اور اپنے وقت کے ممتاز مدرّس و مبلّغ تھے۔ حضرت شیخ احمد واعظ نے تبلیغ دین میں اتنی شہرت و مقبولیت حاصل کی کہ واعظ ان کے نام کا غیر منفک جزو بن گیا۔ ان تینوں بزرگوں نے انتہائی نامساعد حالات میں درس و تدریس اور تبلیغ و اصلاح کی شمع فروزاں رکھی یہ ان لوگوں میں سے تھے جنہیں ابنائے وطن کی زبوں حالی نے اپنی

---

[1] The vally of Kashmir, By: Walter Lawrance —

اپنی پریشانیوں سے بے فکر کر دیا تھا، اور وہ ان کی رستگاری کے لئے ہر وقت خدا سے یہ دُعا مانگتے تھے:

اللّٰھمّ بحقّ نبیّ عندک ادفع عن الخلق ما نزل بھم ولا تسلّط علیھم من لا یرحمھم فقد حلّ بھم من لا یرفعہٗ غیرک ولا یدفعہٗ سواک۔ (۱)

اے اللہ! اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے اپنی اس مخلوق سے وہ مصیبت دُور کر دے جو ان پر نازل ہوئی ہے اور اُن پر ایسا ظالم حکمران مسلط نہ کر جو ان پر کوئی رحم نہ کھائے۔ ان پر ایک ایسی مصیبت اب نازل ہوئی ہے، جسکو تیرے سوا کوئی دوسرا دُور نہیں کر سکتا۔

حالانکہ ان حالات میں بڑے بڑے حوصلہ مند لوگ بھی یا تو ہمت ہار دیتے ہیں یا حیلوں اور بہانوں کی پناہ لے کر حالات کا مقابلہ کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ اس کی مثال مولانا عبدالرشید شوپیانی مرحوم کی ہے جو یقیناً کشمیر کے بُرے حالات سے مضطرب تھے اور انہیں قابلِ اصلاح سمجھتے تھے، مگر اُن کا اضطراب صرف ان ہی کے دل تک محدود رہا۔ وہ کشمیر سے ہجرت کر گئے اور بھوپال میں نواب صدیق حسن خان قنوجی کے دامنِ امارت میں پناہ لی۔ اہلِ وطن کے لئے اُن کے پاس ناراضگی کے سوا

---

(۱): یہ دُعا علامہ محمد محسن کھشو ؒ کے ایک شاگردِ مُلّا امان اللہ کشمیری کی دھرائی ہے۔ انہوں نے اپنی آنکھوں سے افغانوں کا ظلم و جبر دیکھا تھا۔

کچھ باقی نہ رہا تھا:

وقد سلّط اللہ علیہم حاکماً یذبح ابناءھم۔ وفی ھذہ السنۃ اخذھم اللہ بسنین کسنین یوسف واللہ عزیز ذوانتقام [1]

اللہ نے کشمیر کے مسلمانوں پر ایک ایسا ظالم حکمران مسلّط کیا ہے جو اُن کے بیٹوں کو ذبح کرتا ہے۔ اسی طرح انہیں حضرت یوسفؑ کے زمانے کی قحط میں گرفتار کیا ہے۔ بیشک اللہ طاقت والا اور انتقام لینے والا ہے۔

حضرت شیخ احمد واعظ کا دائرۂ وعظ و تبلیغ پنجاب تک پھیل گیا تھا۔ انہوں نے اسلامی عقائد پر عربی زبان میں کئی فاضلانہ رسالے لکھے جن میں افراط و تفریط کرنے والوں کے خلاف اپنی ناپسندیدگی کا کھُل کر اظہار کیا ہے۔ وہ اگرچہ سخت حنفی اور احسان و سلوک کے داعی و مبلغ تھے مگر اس راہ میں جس فرد یا جماعت کو اعتدال کا دامن چھوڑتے ہوئے دیکھتے تھے اس کے خلاف اپنی آواز بلند کرتے تھے۔ اُن کے دَور میں کشمیر کے بہت سے سادہ لوح مسلمانوں میں ایک بدعت رائج ہو گئی تھی تو انہوں نے "تنبیہ الغافلین" کے نام سے عربی زبان میں ایک جلیل القدر رسالہ لکھا اور بغیر کسی خوف و تردّد کے خلافِ شریعت اعمال و

---

[1] المنتقی: علامہ ابوالبرکات ابن تیمیہؒ، مقدمہ از مولانا عبدالرشید شوپیانی، مطبوعہ فاروقیہ دہلی ۱۹۷۰ء، صفحہ ۳۵ (حاشیہ)

The vally of Kashmir, By: Walter Lawrance

وظائف کی بے وقعتی واضح کی۔ اس بدعت کے حق میں جو دلائل پیش کیے جاتے تھے اُن کے بارے میں حضرت شیخ احمد لکھتے ہیں:

یوردون فی فضلها اما لایسمن ولا یغنی من جوع ولا یطابق المنقول والمسموع من خبر مفتری وحدیث موضوع و یفترون علی اللہ الکذب وھم یعلمون المشروع من غیر المشروع۔

کچھ لوگ اس کی فضیلت میں وہ دلائل پیش کرتے ہیں جو کسی طرح اطمینان بخش نہیں ہیں۔ نہ وہ عقل و وجدان کے موافق ہیں اور نہ نقل و تواترث سے مطابقت رکھتے ہیں۔ یہ کسی جھوٹی خبر اور جعلی حدیث پر قائم ہے۔ یہ لوگ خدا پر جھوٹ باندھتے ہیں۔ حالانکہ انھیں شرعی اور غیر شرعی ہونیکا فرق معلوم ہے

ایک اور جگہ ایک موضوع حدیث پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں!

سبحانک ھذا بھتان عظیم وافتراءٌ علی الرسول الکریم واجتراءٌ علیہ علیہ الصلوٰۃ والتکریم۔ فخف علی طباع اکثر العوام ھذا الکلام لکون طباعھم عن الخیر

خدا کی پاک ذات اس سے بلند ہے اور یہ بڑا بہتان اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مقدسہ پر افتراء اور جسارت ہے اس قسم کی باتوں سے اکثر لوگوں کی طبیعتوں میں سستی پیدا ہوئی کیونکہ لوگوں کے مزاج عموماً نیکوں سے دور اور

نافرة والى الشرور راغبة فاتكلوا عليها وتركوا الطاعة ومالوا الى البطالة۔ فانهكوا في العيش الرغد شغاورياً واضاعوا الصلوٰة واتبعوا الشهوات فسوف يلقون غيا۔

برائیوں کی طرف راغب ہوتے ہیں۔ اس طرح انہوں نے اس قسم کی بے بنیاد باتوں کا سہارا لیکر اطاعت اور دیانتداری چھوڑ دی اور بطالت و گمراہی کی طرف مائل ہو گئے جس کے نتیجے میں وہ ایک طرف عیش و عشرت کی زندگی گزارنے میں غرق ہوئے اور دوسری طرف نماز قضاء کرکے خواہشات کی پیروی کرنے لگے مگر وہ جلد برے انجام کا سامنا کرینگے۔

انہوں نے اُن لوگوں کے خلاف بھی قلم اُٹھایا جو توحید کے نام پر احسان و تصوّف سے یکسر انکار کرتے تھے اور اولیائے کاملین کے روحانی فیوض و برکات کے منکر اور ان سے اِستفادہ کرنے کو ناجائز اور خلافِ شریعت قرار دیتے تھے۔ اس جماعت کے خلاف اُن کا فاضلانہ عربی رسالہ نجوم الشہابیہ علمائے متقدمین کی مستند کتابوں کا مغز اور جوہر ہے۔ اس رسالے پر ہم نے کلام اور فلسفہ کے باب میں قدرے تفصیل سے تبصرہ لکھا ہے۔

حضرت مولانا سید سعید صاحب اندرابی بھی بلند پایہ محدّث اور مفسّر تھے انہوں نے درس و تدریس کے ذریعہ دینی علوم کی اشاعت جاری رکھی۔ بے شمار طلبائے علم اُن سے مستفید ہوئے تھے۔ وہ ایک ضخیم تفسیر کے مصنّف بھی تھے۔ اسی طرح حدیث کی کئی اہم

The vally of Kashmir, By: Walter Lawrance

کتابوں پر حاشیے لکھے تھے۔

دورِ حاضر میں دوسری مسلمان مملکتوں کی طرح کشمیر بھی متعدد عصری تحریکات سے متاثر ہوا مگر بد قسمتی سے کسی قابلِ ذکر فائدے کے بجائے کئی افسوسناک نقصانات کا شکار ہوا۔ سیاسی بے چینی نے مخلص دینی راہنماؤں کے نقوش خاک میں ملا ڈالے۔ مذہبی جماعتیں اور انجمنیں اس چھوٹے سے خطۂ زمین میں برساتی کیڑوں کی طرح پھوٹ گئیں مگر عملاً سوداگری سے آگے نہیں گزریں۔ دینی جماعتوں نے پیشہ ور تاجروں کی طرح اپنی اپنی دکانیں لمبے لمبے خوشنما لیبلوں سے سجائیں مگر علم و فکر اور اخلاص و للہیت سے محروم ثابت ہوئیں۔ کسی نے حضرت میر سید علی ہمدانی رح کا مشن آگے بڑھانے کا دعویٰ کیا مگر مسلمانوں کو اوہامِ فاسدہ اور خرافات پرستی سے نکالنے کی بجائے انہیں ان میں اور زیادہ مبتلا کر دیا۔ کسی نے تجدید اور احیائے دین کا علم بلند کیا، مگر اولیاء اللہ اور ائمۂ دین سے لوگوں کے تعلق و محبت پر ضربیں مارنے کے سوا کچھ نہیں کیا انہوں نے سادہ لوح لوگوں کو بڑی مکاری سے اکابرِ اسلام کی "غلامی" سے نجات دلاکر اپنی غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دیا۔ کسی نے اتحادِ اسلامی کا صور پھونکا اور اس کے لئے اسلام اور اسلامی شعائر کا کھل کر استحصال کیا مگر ساری تحریک کا لب لباب اقتدار پر قابض ہونا تھا کسی نے عدمِ تقلید کا شور مچایا مگر آمین بالجہر اور قرأت خلف الامام کے جائز و ناجائز ہونے کے فتنے قائم کرکے حیران و سرگرداں مسلمانوں کو

متحد کرنے کے بجائے ایک دوسری خانہ جنگی میں مبتلا کر ڈالا۔ ان نام نہاد مصلحوں اور مبلغوں میں صرف ایک شخص پر نظر پڑتی ہے جس کی زندگی کے پچاس سال بظاہر سیاست کی خارزار کی نذر ہو گئے، مگر اس کے باوجود کشمیر میں مسلمانوں کا ملّی اور مذہبی تشخص قائم رکھنے میں اس کا ناقابلِ فراموش حصّہ رہا ہے۔ اس شخص سے ہماری مراد شیخ محمد عبداللہ مرحوم سے ہے جن کا آج عزت سے نام لینا مولی گاجر لے نے سے کم نہیں ہے مگر قرآنی حکم " اذا قولوا فاعدلوا " پر خلوص سے عمل کرنے کی نیّت ہو تو غرض مند انسانوں کی پسند و ناپسند کوئی وقعت نہیں رکھتی ہے۔ شیخ صاحب مرحوم بظاہر ایک معرکتہ الآراء سیاسی نظریئے کے قائل تھے مگر جن اسباب و وجوہ کی بنا پر وہ اس نظریئے کے قائل ہوئے تھے اُن سے صرف نظر کرنا معروضی مطالعہ نہیں کہا جا سکتا ہے۔ بیسویں صدی کے نصف اوّل میں برصغیر ہمالیائی قد و قامت کی سیاسی شخصیتوں سے بھرا تھا۔ شیخ صاحب کا سیاسی وجود ان شخصیتوں سے منسلک تھا۔ یہ تمام شخصیتیں پنجہ آزمائی کے نشے سے مسحور تھیں۔ اس طوفانِ بلاخیز میں جب بہت سے اچھے زیر قامت لوگ خس و خاشاک کی طرح بہہ گئے تو شیخ صاحب کا بالکل محفوظ رہنا قطعاً ناممکن تھا۔

شیخ محمد عبداللہ کو ہندو دانش مند ایک کٹر مسلمان رہنما ہونے کا دعوٰی کرتے ہیں۔ اگرچہ کٹر کا لفظ متعصّبانہ ذہنیت کی پیداوار ہے مگر اس میں شک نہیں ہے کہ وہ ایک مسلمان شخص ہی تھے اور وہ مسلمانوں پر ڈھائی جانے والی مصیبتوں سے مضطرب ہوتے تھے۔ انہوں نے کشمیر میں اپنی سیاسی تحریک

[illegible]
[illegible] Kashmir. By: Walter Lawrance —

کی ابتدا یہاں کے قدیم ترین تبلیغی مرکز خانقاہ حضرت میر سید علی ہمدانیؒ سے کی
اسی جگہ کشمیر کے مسلمانوں کو اکٹھا کیا اور انہیں اجتماع و مرکزیت کے فلسفے سے آشنا
کیا۔ اسی طرح جب انہیں اپنے سفر آخرت کی قربت کا احساس ہوا تو حضرت بل کے
داخ درگاہ عالیہ کے سائے میں اپنی ابدی نیند کیلئے دو گز زمین خرید کر رکھوا لی۔
جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا کہ شیخ صاحب کو قید و بند اور جلا وطنی کی صعوبتوں
میں زندگی کے بہترین سال گزارنے پڑے۔ جب اُن کی ہمت جواں، حوصلہ
بلند اور عزائم پختہ تھے، اگر وہ اس دور میں آزاد ہوتے تو یقیناً کشمیر کی قلب
ماہیت ہو جاتی۔ پھر بھی انہیں جتنا وقت اطمینان سے گزارنے کا موقعہ ملا
انہوں نے اس میں اہلِ کشمیر کے لئے قابلِ قدر خدمات انجام دیں۔ وہ یقیناً وقت
کو اس کی تلوار سے کاٹ نہیں سکے مگر اس میں شک نہیں ہے کہ انہوں نے
تن تنہا سینہ تان کر اس کے وار کا مقابلہ کیا۔ وہ بظاہر سیاسی آدمی تھے مگر
کشمیر کی عبادت گاہوں، خانقاہوں اور زیارت گاہوں کی انہوں نے بذاتِ خود سرپرستی
کی۔ ان کی تعمیر و تجدید میں بھرپور دلچسپی لی، بلکہ انہی مقدس مقامات میں بیٹھ کر
کشمیر کی مفلوج سیاست کو تلاطم سے آشنا کیا۔ وہ ادارہ اوقاف اسلامیہ کے
سرپرست بھی تھے اور اپنی زیرِ سرپرستی اسے ایک فعّال ادارہ بنانے کی سعی کی۔
اس ادارے نے ــ اپنی خامیوں اور کوتاہیوں کے باوجود ــ شاندار مسجدیں
بنائیں، زیارتوں کی توسیع اور تحفظ کا اہتمام کیا۔ درسگاہیں قائم کیں۔
بیواؤں اور یتیموں کی مدد کی۔ اگرچہ ادارہ اوقاف مسلمانوں کی توقعات پر
سو فیصدی پورا نہیں اُتر سکا مگر اس کی مذکورۂ بالا خدمات کا اعتراف نہ
کرنا محسن کشی اور ناشکر گزاری کے مرادف ہو گا۔

کشمیر کے مہاجر علماء اور اربابِ فکر و سیاست | کشمیر کے لوگوں کو مختلف

زمانوں میں مختلف حادثات و واقعات کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ سیاسی بد نظمی، قدرتی آفات اور ناگہانی مصیبتیں وقت وقت پر یہاں کے لوگوں کو جان بچانے کیلئے ہجرت پر مجبور کرتی تھیں۔ مسلمانوں کے اقتدار سنبھالنے کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ اگرچہ شاہمیری عہد میں سکون و اطمینان کا دور تھا اور کشمیر خود غیر ملکی مہاجروں کا ملجا و ماوی بن گیا مگر چکوں کے دورِ وزارت اور عہدِ سلطنت (جو کہ کسی طور بھی نصف صدی پر مشتمل تھا) میں جب بغض و عناد کی آگ بھڑک اٹھی تو سنی حنفی علماء کی ایک کثیر تعداد کشمیر کو خیرباد کہنے پر مجبور ہوئی۔ یہ لوگ ہندوستان کے مختلف مقامات میں مقیم ہوئے۔ ان میں سیالکوٹ خاص طور پر کشمیری مہاجروں کا مرکز بن گیا۔ یہیں مولانا فتح اللہ صاحب، مولانا کمال الدین اور ان کے بھائی مولانا جمال الدین بھی مقیم ہوئے جو پنجاب میں اپنے مدرسہ کمالات میں بے حد مقبول ہوئے تھے اور جنہیں پنجاب کے اکابر شیوخ اور ارباب فضل و کمال کا استاد ہونے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ مغلوں کے زمانے میں اگرچہ جبری ہجرت کا سلسلہ رک گیا پھر بھی بہت سے اہلِ علم نے کشمیر سے باہر رہنا پسند کیا تھا جس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ یہ چھوٹی سی مملکت اپنے مخصوص جغرافیائی خصوصیات کی بنا پر ہمیشہ بیرونی دنیا سے کٹ کر رہتی تھی۔ یہ عموماً تہذیب و تمدن اور افکار و نظریات کی کشمکش اور آویزش سے نا آشنا رہتی تھی۔ یہ سکون اور خاموشی کا گھر تھا جہاں کشمکشِ حیات میں حصہ لینے والے لوگ کچھ وقت کیلئے آرام کرنے آتے تھے اسی لئے کشمیر کے وہ لوگ جو خود زندگی کی دوڑ دھوپ میں حصہ لینے کے خواہشمند ہوتے تھے وہ کشمیر سے ہجرت کرتے تھے۔ اس طرح مختلف وقتوں میں کشمیر کے بہت سے مسلمان دلی، لاہور، لکھنؤ، فیض آباد، حیدرآباد وغیرہ میں آباد ہوئے۔ پنجاب میں کشمیری مسلمانوں کی ایک مستقل انجمن "انجمن کشمیری مسلمانانِ پنجاب" کے نام سے موسوم تھی۔ ایک بار محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس زیر صدارت سر سلیم اللہ نواب ڈھاکہ منعقد ہوا تو علامہ

محمد اقبالؒ نے اس جلسہ میں کشمیری مسلمانوں کے مسائل بھی ابھارے تھے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں:

"پوشیدہ نیست کہ اسلاف ما بغرض سیر و سیاحت و ترقی و تجارت و حصولِ روزگار راہِ غربت گرفتند و از خطۂ جنت نظیرِ خویش الفراق نمودہ در مملکتِ ہندوستان بر مقاماتِ مختلفہ اقامت ورزیدند[1]"

افغانوں، سکھوں اور ڈوگروں کے پونے دو سو سالہ ظالمانہ دور میں بے شمار کشمیری مسلمانوں نے ہجرت کر کے ان مقامات کی جانب رخ کیا جہاں ان کے قدیم ہم وطن پہلے ہی مقیم ہو چکے تھے۔ ان مہاجر کشمیریوں نے آزاد ماحول میں زندگی کے ہر شعبے میں اپنی مخفی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ تعلیم و تبلیغ، تصنیف و تالیف، صنعت و تجارت اور فکر و سیاست میں اسقدر حصہ لیا کہ برصغیر کی ثقافتی تاریخ میں اپنا علیحدہ اور مخصوص مقام حاصل کیا۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلویؒ کے ممتاز ترین شاگردوں اور انکے علوم و افکار کے معدودے چند ماہروں میں خواجہ جمال الدین شاہ محمد امین ولی اللہی کشمیری متفقہ طور پر درجۂ اول کے فاضل تسلیم کئے جاتے ہیں۔ جس زمانے میں حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کی جلیل القدر تالیف "تحفۂ اثنا عشریہ" پورے ہندوستان میں موردِ بحث و مناظرہ بنی ہوئی تھی تو مولانا رشید الدین خاں اہل السنت والجماعت کی طرف سے اور شیخ محمد بن عنایت شیعہ فرقہ کی طرف سے صف اول کے مناظر و متکلم کی حیثیت سے مشہور ہوئے تھے، اور یہ دونوں کشمیر الاصل عالم تھے اور اتفاق سے دونوں حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کے شاگرد بھی رہ چکے تھے۔ آگے علمی تبحر اور جامعیت میں صدر الصدور مفتی صدر الدین آزردہ اور محدث العصر علامہ محمد انور شاہ، تبلیغ و مناظرہ میں مولانا ثناء اللہ امرتسری، عقلی علوم کی مہارت میں علامہ تفضل حسین خاں، خطابت و بے باکی میں مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری، طب و حکمت میں نواب معالج خاں، اکابر شیعہ علماء اور اصحاب قلم میں مولانا ابوالقاسم

---

[1] تاریخ اقوام کشمیر، منشی محمد دین فوق، ج ۱ ص ۳۲۸ لاہور

حائری، مولانا سید ابوالحسن بن نقی شاہ کشمیری، مغربی فکر و فلسفہ کے تبصرہ نگار علامہ محمد اقبال اور سر سید احمد خاں کے سرگرم علمی معاون منشی چراغ علی[1] وغیرہ جیسی باکمال شخصیتیں کشمیر ہی کی زرخیز مٹی سے تعلق رکھتی تھیں۔ انہوں نے اپنی عظیم الشان صلاحیتوں سے ان ظالم حکمرانوں کے منصوبوں

لے: منشی چراغ علی کشمیر الاصل تھے۔ اُن کے آباؤ اجداد سرینگر سے پنجاب وارد ہوئے تھے۔ یہاں سے ان کے والد میرٹھ منتقل ہوئے تھے۔ منشی چراغ علی انگریزی، فارسی، اردو کے زبردست فاضل، عربی، عبری اور کالڈی سے استفادے کی حد تک واقف تھے۔ انہوں نے انگریزی میں مختلف اسلامی موضوعات پر شاندار علمی کتابیں لکھی ہیں جن پر یورپ کے سرکردہ علمی رسالوں میں وقیع الفاظ میں تبصرے شائع ہوتے تھے۔ انہی میں جہاد پر اُن کی مشہور کتاب Critical Exposition of Apulor Jihad شامل ہے جس نے جدید تعلیم یافتہ طبقے بالخصوص سر سید کے حلقۂ احباب میں بڑی مقبولیت حاصل کی تھی۔ اسی کتاب کے بعض مضامین کی تردید میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے "الجہاد فی الاسلام" کے نام سے مشہور کتاب لکھی۔ اس کی دوسری علمی کتابوں میں ـــ
Reforms under Muslir Rule "ii, MOHAMMAD
Proposed Political, اور The True Prophet
Legal and Social reforms under..
Muhammadan Rule ـ مشہور ہیں۔ ان میں آخری کتاب کا ترجمہ بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب نے اعظم الکلام فی ارتقاء الاسلام کے نام سے کیا ہے۔ اگرچہ منشی چراغ علی کو ہندوستان کے دینی حلقوں میں زیادہ شہرت حاصل نہیں ہوئی اور انہیں ہندوستان کے مغربیت زدہ لوگوں (باقی ص ۱۵۵ پر)

کو خاک میں ملا دیا جو کشمیر کے مسلمانوں کو جانوروں کے ریوڑ میں تبدیل کرنے کے لئے دور دور سے آئے تھے۔ اگرچہ کشمیر کے مسلمان اپنے ان ہمارے جلیل القدر ہموطنوں سے براہ راست بہت کم مستفید ہو سکے اور شاید ملا

(بقیہ حاشیہ ص ۱۵۴) میں شمار ہوتا ہے۔ تاہم ہندوستان سے باہر عرب اور یورپ سے تعلق رکھنے والے اسلامیت کے بہت سے مخلص داعیوں اور مفکروں نے ان کی کتابوں سے کھل کر استفادہ کیا۔ مشہور عرب فاضل علامہ امیر شکیب ارسلان اپنی ایک مشہور تالیف میں منشی چراغ علی اور جسٹس سید امیر علی کے بارے میں اعتراف کرتے ہیں:

العبقریین الذین اشتہروا فی العالم کلہ بما اخرجاہ للناس من الکتب القیمۃ الباحثۃ فی شؤن الاسلام و روحہ۔ وقد کتبا ھذہ الکتب باللغۃ الانکلیزیۃ الفصحیٰ فذاعت ذیوعاً قل ان یعرف لہ مثیل۔ (حاضر العالم الاسلامی، ج ۱، ص ۲۷)

یہ دو ایسے عبقری تھے جنہوں نے لوگوں کے لئے اسلامی مسائل و موضوعات اور اسکی روح و مغز پر فصیح انگریزی زبان میں بڑی محققانہ کتابیں لکھیں جنہیں ایسی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی جسکی بہت کم مثال مل سکتی ہے۔

ان کے انتقال پر سر سید احمد خان، ان کے فرزند سید محمود اور مولانا الطاف حسین حالی نے بے حد درد و غم کا اظہار کیا تھا۔ یہاں یہ ذکر کرنا نامناسب نہیں ہوگا کہ خود سر سید کی والدہ بھی ایک کشمیر الاصل خاتون تھی۔ کیونکہ سر سید کے نانا خواجہ فرید الدین کشمیر کے رہنے والے تھے۔ سر سید کی والدہ نے حضرت سید احمد شہیدؒ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ ان باتوں کا انکشاف خود سر سید نے کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو: رسالہ نواب دبیر الملک، مؤلفہ سر سید احمد خان، مفید عام پریس آگرہ ۱۸۹۶ء)۔

طاہر غنی کشمیری نے بھی بدقسمتی محسوس کر کے اپنا یہ مشہور حسرت بھرا شعر کہا ہو گا،

غنی روز سیاہ پیر کنعاں را تماشا کن
کہ نور دیدہ اش روشن کند چشم زلیخا را

تاہم کشمیر کے مسلمان ان بزرگوں کے فیوض سے یکسر محروم بھی نہیں رہے کشمیر کے کچھ طلبائے علم ان سے براہ راست مستفید ہوئے تھے اور انہوں نے ہی بعد میں ان کے فیوض و فوائد کو کشمیر میں عام کیا۔ اسی طرح انہی کشمیری مہاجروں میں کچھ سرکردہ ادیب، شعراء، مفکرین اور ارباب سیاست اُٹھے تھے جنہوں نے ڈوگروں کی ظالمانہ حکومت زمین بوس کرنے میں اپنی ہم عصر تحریک حریت کشمیر کی بھرپور مدد کی تھی جن میں علامہ محمد اقبالؒ پیش پیش تھے۔ علامہ ممدوح کو ہمیشہ اپنے کشمیر الاصل ہونے پر فخر محسوس ہوتا تھا۔

تنم بگلے زخیابان جنت کشمیر
دل از حریم حجاز و نوا ز شیراز ست

تفسیر اور قرآنی علوم

تفسیر اور قرآنی علوم

کشمیر کے علمائے قرآنی علوم کی طرف بہت کم توجہ کی ہے وہ ضرورت کے وقت عموماً متقدمین کی کتابوں سے ہی استفادہ کرتے تھے۔ میر سید علی ہمدانیؒ نے جس وقت کشمیر میں تبلیغ دین کا کام سنبھالا تو یہ سرزمین غیر اسلامی علوم و ثقافت کا مرکز تھی۔ اگر شیخ ہمدانی نے اسلامی علوم بالخصوص تصوف پر گرانقدر ذخیرہ چھوڑا تھا مگر یہاں اس کے سمجھنے والے معدودے چند لوگ ہی تھے۔ اس طرح اس ذخیرے کی قدر و حفاظت کرنے والوں کی بڑی کمی بھی تھی۔ جس ماحول میں قرآن کی حرف، تجوید و قرأت ایک مشکل مرحلے سے کم نہ تھی، اس میں قرآنی علوم سمجھنے سمجھانے اور ان پر کچھ لکھنے کا تصور بھی ناممکن تھا۔ تاہم جب سو سال کا عرصہ گزر گیا اور یہاں اسلام نے اچھی طرح جڑ پکڑ لی، نیز مسلمان سلاطین علم پرور ثابت ہوئے اور اسلامی ممالک کے ساتھ کشمیر کے تشنگان علم کا رابطہ قائم ہوا تو علمائے کشمیر نے بھی قرآنی علوم کی جانب توجہ کی اور کئی قابل قدر تفسیریں لکھیں۔

اصل میں کشمیر کے علماء نے سلطان زین العابدین ہی کے زمانے میں قرآن مجید کی تدریس و تفہیم اور اس پر لکھنے میں گہری دلچسپی دکھائی تھی۔ اس کا اندازہ صرف اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب سلطان کو علماء سے یہ معلوم ہوا کہ مکہ مکرمہ میں علامہ زمخشری کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا تفسیر قرآن کا نسخہ موجود

---

(۱) : علامہ ابوالقاسم محمود بن عمر خوارزم کی ایک بستی زمخشر میں ۴۶۷ھ میں پیدا ہوئے اور ۵۸۳ھ میں انتقال کیا۔ وہ بلند پایہ فاضل، مصنف اور مفکر تھے اپنے زمانے میں ہی اتنے مشہور ہوئے کہ شعراء اور ادیب ان کی مدح کرنے لگے اور بلند پایہ علماء ان کی کتابیں پڑھنے پڑھانے کی اجازت اُن سے لیتے تھے۔ حافظ ابوالطاہر السلفی نے اسکندریہ سے خط وکتابت کے ذریعے ان سے یہ اجازت حاصل کی۔ وہ بڑے پرہیزگار، باوقار اور غیرتمند تھے۔ مکہ مکرمہ میں بیت اللہ کے قریب ٹھہرنے کی وجہ سے اپنے آپ کو "جار اللہ" (خدا کا ہمسایہ) کا لقب دیا۔ انہیں اپنے علم و فضل کا احساس بھی تھا خود ہی کہتے ہیں:

• سَهَرِي لتنقيحِ العلومِ ألذُّ لي ۔۔۔ من وصلِ غانيةٍ وطولِ عناقِ

"علوم کی تحقیقات میں میرا راتوں کا بیدار رہنا حسیناؤں اور دراز گردن محبوباؤں کی ملاقات سے کہیں زیادہ مجھے لذت دیتا ہے۔"

• وتمايلي طرباً لحلِّ عويصةٍ ۔۔۔ أشهى وأحلى من مدامةِ ساقي

"مشکل علمی مسائل حل کرنے کی جانب میرا خوشی خوشی متوجہ ہونا، ساقی کے شراب پلانے سے مجھے زیادہ میٹھا اور لذیذ لگتا ہے۔"

• وألذُّ من نقرِ الفتاةِ لدفِّها ۔۔۔ نقري لألقي الرملَ عن أوراقي

"مجھے کسی حسینہ کے ڈھول پر چوٹ مارنے سے کہیں زیادہ لطف (بقیہ حاشیہ دوسرے صفحہ پر)

ہے تو اس نے ایک کاتب کو کثیر رقم دے کے مکہ مکرمہ روانہ کیا تاکہ وہاں سے اس مستند نسخے کی نقل لے کر آئے۔ جب کاتب دو سال بعد یہ نقل لے کر کشمیر واپس آیا تو اس کا گرمجوشی سے استقبال کیا گیا اور شعرائے نے اس کی مدح میں قصیدے کہے۔ ایک قصیدے کا مطلع تاریخ کی کتابوں میں محفوظ رہا ہے۔

شہر راز مدینہ نورِ برہاں آمد
رنجوریِ اہل دین بہ درماں آمد

حضرت میر سید علی ہمدانیؒ بذاتِ خود قرآنی علوم کے ماہر تھے اور ناسخ و منسوخ پر انہوں نے ایک رسالہ بھی لکھا ہے جس کا ذکر آگے آتا ہے

(بقیہ حاشیہ ص گذشتہ) اپنی کاپی پر انگلی مارنے سے حاصل ہوتا ہے جب ان سے گرد جھاڑنا مقصود ہوتا ہے

• وصریر اقلامی علی اوراقہا   احلی من الدوکاء والعشاق

"کاپی پر میرے قلموں کی سرسراہٹ موسیقی کے دو مشہور نغموں دوکاء اور عشاق سے کہیں زیادہ میرے لیے میٹھی ثابت ہوتی ہے۔"

• أأبیت سہران الدجی وتبیتہ   نوماً وتبغی بعد ذاک لحاقی؟

"کیا میں تاریک راتوں میں بیدار رہوں اور تم میٹھی نیند میں رات گزار دو گے اور پھر بھی مجھ تک پہنچنے کی تمنا کرو گے؟"

ادب، بیان و بلاغت، فلسفہ و فکر اور دینیات پر انکی بہت سی شاندار کتابیں ہیں، قرآن حکیم کی شرح میں انکی الکشاف بہت ہی مشہور و مقبول رہی ہے۔ تمام مفسرین نے قرآن کے ادب و بلاغت کے نکات واضح کرنے میں اسی کتاب پر انحصار کیا ہے حالانکہ علامہ زمخشری فلسفۂ اعتزال سے بہت ہی متاثر تھے۔

ان کے دو رفقاء بھی، جو کشمیر میں آباد ہوئے، دینی علوم کے ماہر تھے خاص طور پر قرآن کے ساتھ لگاؤ رکھنے میں مولانا پیر محمد قاری بڑے مشہور تھے۔ شیخ ہمدانیؒ نے انہیں سلطان قطب الدین کی تعلیم و اصلاح کے لئے مقرر کیا تھا۔ مؤرخ محمد اعظم لکھتے ہیں:

مولانا پیر محمد قاری حافظ کلام اللہ بہ ہفت قرأت ماہر و جامع علوم ظاہر و باطن بود۔ حسب الامر امیر کبیرؒ برائے تعلیم سلطان قطب الدین داخل شہر در کشمیر ورزیدند۔[1]

مولانا پیر محمد قاری قرآن مجید کے حافظ، سات قرأتوں کے ماہر اور ظاہری و باطنی علوم میں جامعیت کے مالک تھے۔ امیر کبیر میر سید علی ہمدانیؒ کے حکم سے سلطان قطب الدین اور شہر کے مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کرنے پر مامور رہے۔

شیخ احمد خوشخواں قرآن تلاوت کرنے میں مشہور تھے وہ کشمیر الاصل بزرگ تھے اور شیخ ہمدانیؒ کی خدمت میں اسلام قبول کیا تھا۔ قرآن شریف خوش الحانی سے پڑھنے کی بنا پر خوش خواں کے عرف سے معروف ہوئے۔[2]

سید حلبی خوارزمی میر سید محمد ہمدانیؒ کے رفقاء میں سے تھے اور انہی کے ساتھ کشمیر تشریف لائے تھے، منور آباد (سرینگر) میں ان کا مدفن ہے۔ سلطان سکندر ان سے قرآنی مطالب سیکھا کرتا تھا۔

سلطان سکندر بعلم قواعد قرآن اکثر در خدمت ایشان کردہ۔[3]

انہی کی خدمت میں سلطان سکندر قرآنی اصول و قواعد کا علم پاتا تھا۔

۱: تاریخ اعظمی، ص ۴۱۔ ۲: ایضاً ص ۴۰۔ ۳: ایضاً ص ۴۲

مغلیہ دور کے علماء میں مُلّا حبیب میر عدل درسِ قرآن اور تفسیر قرآن میں بہت مشہور ہوئے تھے۔ طالب علمی کے زمانے میں انہوں نے ہندوستان سے ذخیرۂ تفاسیر اپنے ساتھ لایا تھا۔ اس دور کے ممتاز ترین علماء اور مصنفین جیسے علامہ ابوالفتح کلو، مولانا طاہر، مولانا یوسف خاموش اور شیخ حیدر رائینہ ان ہی کے شاگرد رہ چکے تھے۔

"درسِ تفسیر بسیار مے گفت و تفاسیرِ بسیار از سفر ہمراہ خود آوردہ بود۔"[۱]

خواجہ حسن قاری اور خواجہ حسین قاری دونوں بزرگوں کو قرآنی علوم پر اعلیٰ دستگاہ رکھنے کی بنا پر ہی شہرت ہوئی تھی[۲]۔ اشائی خاندان کے ایک بزرگ عالم خواجہ نورالدین اشائی (م ۱۰۱۱ھ) نے پارہ عم کی تفسیر لکھی تھی اور مقبولیت حاصل کی تھی۔ عہدِ شاہجہان کے ایک نامور کشمیری عالم مُلّا حسن کو جو نے تفسیرِ بیضاوی پر ایک حاشیہ لکھا تھا[۳]۔ مولانا ابوالحسن خواہم بابا کے بارے میں اُن کے ایک معاصر عالم مُلّا یوسف گنائی کہتے تھے کہ علمی مجلسوں میں تفسیر بیضاوی کے اقتباسات فر فر سُناتے تھے۔ معقولات میں اتنا درک رکھتے تھے کہ مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کی بعض تحقیقات اعتماد سے رد کرتے تھے۔ ہم عصر علماء کو بہت کم خاطر میں لاتے تھے۔

۱: تاریخ اعظمی، ص ۱۳۵۔

۲: کشمیر میں فارسی ادب کی تاریخ؛ پروفیسر عبدالقادر سروری، ص ۱۵۲

۳: تاریخ اعظمی، ص ۱۴۸۔

نگاہے التفات بجانبِ علمائے حاضر نمے کرد۔ [1]

عالمگیری عہد کے ایک عالم مولانا محمد اشرف منٹو قرآنی علوم میں وسیع نظر رکھتے تھے۔ اسی دور میں مُلا صفی الدین اردبیلی، اورنگ زیب کی بیٹی زیب النساء کے حکم سے وظیفہ لے کر کشمیر وارد ہوئے۔ زیب النساء نے ان کو امام فخر الدین رازی کی تفسیر کا فارسی میں ترجمہ کرنے پر مامور کیا۔ یہ ترجمہ کشمیر ہی میں مکمل ہوا اور زیب التفاسیر کے نام سے موسوم ہوا۔[2] سکھ دور کے ایک کشمیری عالم مولانا نور الدین نے "نور البیان فی توضیح القرآن" کے نام سے ایک رسالہ لکھا جو قرآن کے مسائل کی وضاحت میں ایک اچھا رسالہ ہے۔[3] متأخر دور کے علماء میں مولانا میر سید سعید اندرابی (م۔ ١٦ ربیع الاول ١٣٨٢ھ)، مفسرِ قرآن کی حیثیت سے بہت مشہور ہوئے۔ انہوں نے قرآنِ حکیم کی مبسوط تفسیر لکھی تھی جو بے قدری کی شکار ہو گئی ہے۔ مولانا یوسف شاہ صاحب میر واعظ نے بھی کشمیری زبان میں قرآن کا ترجمہ کیا۔ مشہور ہے کہ انہوں نے سوپور کے ایک عالم کے ترجمۂ قرآن کو سامنے رکھ کر یہ کام انجام دیا ہے۔

کشمیر میں قرآن اور قرآنی علوم پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں درج ذیل سات کتابیں تفصیلی تعارف کے مستحق ہیں:

(١) الرسالة فی الناسخ والمنسوخ : میر سید علی ابن سید شہاب الہمدانی

---

[1]: تاریخ اعظمی، ص ١٤٤۔

[2]: Kashir : A history of Kashmir by Dr. G.M.D Sufi, Vol. 2 P. 357

[3]: کشمیر میں فارسی ادب کی تاریخ، ص ٣٠٠۔

(۲) مطلب الطالبین : شیخ یعقوب صرفی عاصمی کشمیری
(۳) لغات القرآن : شیخ مراد نقشبندی
(۴) زُبدۃ التفاسیر : شیخ معین الدین بن خاوند محمود کشمیری
(۵) آیات الاعجاز : مولانا عبدالرشید شوپیانی کشمیری
(۶) تفسیر الکلام بکلام الرحمان : مولانا ثناء اللہ امرتسری کشمیری
(۷) تفسیر القرآن : مولانا ابوالقاسم کشمیری

الرسالۃ فی الناسخ والمنسوخ | حضرت میر سید علی ہمدانیؒ کی

تصانیف میں یہ رسالہ بھی دستبردِ زمانہ سے محفوظ رہا ہے۔ انڈیا آفس اور مرکزی دانشگاہ طہران کے کتابخانوں میں اس کے نسخے موجود ہیں۔ اس رسالے میں شیخ ہمدانیؒ نے قرآن کے مسئلہ ناسخ و منسوخ سے بحث کی ہے۔ ہم نے اس کے اقتباس پڑھے ہیں جن کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ اس میں کوئی نئی بات نہیں کہی گئی ہے۔ مؤلف نے اپنے تلامذہ اور صاحبِ علم ارادتمندوں کی تفہیم کے لئے یہ رسالہ لکھا ہے، اور متقدمین ہی سے خوشہ چینی کی ہے۔ مسئلۂ ناسخ و منسوخ صدرِ اسلام سے آج تک معرضِ بحث رہا ہے۔ متقدمین قرآن کی سینکڑوں آیتیں منسوخ مانتے ہیں۔ علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے انہیں صرف اکیس (۲۱) تک محدود کیا،[۱] پھر شاہ ولی اللہ دہلوی صاحبؒ تشریف لائے تو انہوں نے قرآنی معارف میں مزید غواصی کر کے منسوخ آیتوں کی تعداد صرف سات تک محدود کر دی۔[۲] عصرِ حاضر کے بعض ممتاز ترین علماء نے لفظ منسوخ کے

---

(۱) : اتقان فی علوم القرآن، علامہ جلال الدین سیوطی، ص ۱۲۵۔
(۲) : الفوز الکبیر فی اصول التفسیر، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، ص ۲۲۔

معنیٰ متعین کرتے ہوئے کسی بھی آیت کو اپنے تمام جزئیات کے ساتھ منسوخ ماننے سے انکار کیا ہے[1]۔ غرض میر سید علی ہمدانیؒ اس بحث میں جمہور مفسرین ہی کے مقلد ہیں۔ دو منسوخ آیات اور ان کے ناسخ بطورِ مثال نقل کی جاتی ہیں:

(۱) "یسئلونک عن الشھر الحرام قتال فیہ" فرماتے ہیں یہ آیت "اقتلوا المشرکین حیث وجدتموھم" سے منسوخ ہے۔

(۲) "لا اکراہ فی الدین" لکھتے ہیں کہ یہ آیت "جاھد الکفار والمنافقین" سے منسوخ ہے۔

مذکورہ بالا رسالے کے سوا شیخ ہمدانیؒ نے اپنے بہت سے کتب و رسائل میں قرآنِ مجید کی سینکڑوں آیات کی تشریح اور ان کا مغز اور جوہر قلمبند کیا ہے۔ ذخیرۃ الملوک میں انہوں نے سارے ابواب اور فصول کی ابتداء قرآنی آیات ہی سے کی ہے اور انہی سے اپنی رائیں مؤید کی ہیں۔ اسی طرح سلاطین کے نام انہوں نے جتنے بھی مکتوبات بھیجے ہیں، وہ بھی قرآنی آیات کی وضاحت کے سوا کچھ نہیں ہیں۔ یہ مکتوبات رسمی تمہیدات اور القاب و الفاظی میں مقید نہیں ہیں۔ ہر مکتوب کی ابتداء قرآنی آیت سے کی گئی ہے اس کے بعد اس کا سلیس فارسی ترجمہ لکھا ہے پھر اس کے مغز و مفہوم کی روشنی میں مکتوب الیہ کو اپنے فرائض کا احساس دلایا ہے، مثلاً ایک مکتوب اس آیت شریفہ سے شروع ہوتا ہے۔

---

[1] فیض الباری علیٰ صحیح البخاری، علامہ محمد انور شاہ کشمیری، ج ۲، ص ۱۶۹۔

"افرایت ان متعناھم سنین، ثمّ جاءھم ما کانوا یوعدون۔ ما اغنیٰ عنھم ما کانوا یمتعون۔"

اس کے بعد آیت کے رموز و نکات مضمون کی صورت میں بیان کئے ہیں۔ اسی طرح دوسرا مکتوب اس آیت سے شروع کیا ہے:

"انّما الحیواۃ الدنیا لعبٌ ولھوٌ وزینۃٌ وتفاخر"

ایک اور مکتوب کی ابتداء اس آیت سے کی ہے:

"الّذین ان مکّناھم فی الأرض وأقاموا الصّلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ وأمروا بالمعروف ونھوا عن المنکر وللّٰہ عاقبۃ الامور۔"

یہ آیت مبارکہ لکھنے کے بعد حضرت شیخؒ نے اس کا لفظی ترجمہ لکھا ہے پھر سلطان کو اس کے فرائض کی طرف متوجہ کر کے انہیں پورا کرنے پر آمادہ کیا ہے۔ ہم یہاں اس کا خلاصہ پیش کرتے ہیں، فرماتے ہیں:

"اہل علم حضرات اور حاملینِ نفوسِ قدسیہ پر یہ بات مخفی نہیں ہے کہ انسانی طبیعتیں اپنی خصوصیات کے لحاظ سے جُدا جُدا ہیں۔ اس تباین سے امم عالم کے اقوال و افعال میں بھی اختلافات ظاہر ہوئے چونکہ بُرے اخلاق اور گندی صفتیں (از قبیل ظلم و جبر، فتنہ و فساد) انسان کی کی فطرت میں داخل ہیں اس لئے مخلوقات کے اغراض و مقاصد بھی مختلف واقع ہوئے۔ پس اللہ کی حکمتِ بالغہ کا یہ تقاضا ہوا کہ حکمران بلند اوصاف سے متصف ہو تاکہ وہ اولادِ آدم کے حرکات و سکنات کو راہِ صواب اور منزلِ رشد و ہدایت پر ڈالا

سکے، نیز دِین شریعت کے نفاذ میں حتی الوسع کوشش کرے۔ مظلوموں اور کمزوروں کو پنجۂ استبداد سے نجات دلائے۔ ظالموں کو اپنی گرفت میں لائے تاکہ عالم صُوری کا نظام برقرار رہے اور عوام و خواص کے مابین وحشیانہ حرکات ظاہر نہ ہونے پائیں۔ انبیاء کی بعثت اور علماء کی معرفت کا مقصد بھی یہی ہے کہ حق، باطل سے اور اصلاح، فساد سے بالکل جدا اور دُور رہے۔ اگر حاکم اس پر گامزن رہے تو محشر کے دن حاکم و محکوم دونوں جبارِ حقیقی کی سطوت و صولت سے محفوظ و مامون رہیں گے۔ اگر ایسا نہیں کیا تو اَلْیَوْمَ تُجْزٰی کُلُّ نَفْسٍ بِمَا کَسَبَتْ کے تحت ان سے مواخذہ کیا جائے گا۔ اس بادشاہ اور حکمران کو چاہیے کہ وہ اپنا منصب پہچانے۔ بندگانِ خدا کے معاملات کی دیکھ بھال کریں۔ سلاطینِ اسلام اور خلفاءِ راشدین کی سیرتوں پر غور کریں، اپنے آپ کو شاہی آداب سے عاری نہ سمجھیں۔ دنیا کی نعمتوں کو اپنی کجروی سے آخرت کی حسرت و ناامیدی کا بیج نہ بنائیں۔ فانی دنیا پر اعتماد نہ کریں۔ قیامت کی ذلت و گرفتاری سے غافل نہ رہیں اور فرصت کے دنوں کو غنیمت سمجھیں ــــــ والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ۔[۱]

۱۔ مجموعۂ رسائل میر سید علی ہمدانی (قلمی) نسخہ ریسرچ لائبریری سرینگر، نمبر ۱۶۷۹۔

غرض کشمیر میں جملہ دینی علوم کے ساتھ قرآنِ حکیم کی تدریس وتعلیم اور قرآنی علوم پر لکھنے اور تحقیق کرنے کی داغ بیل بھی شیخ ہمدانی رحہ ہی کے ہاتھوں پڑی، انہوں نے خود بھی اس پر لکھا اور اپنے صاحبِ علم رفقاء کو درس و تدریس قرآن پر مامور کیا۔ ان کی قرآن فہمی پر تصوّف کی گہری چھاپ ہے مگر یہ اُن کے دور کا تقاضا تھا اور کشمیر کے مسلمانوں کو اس وقت اسی انداز و اسلوب کی ضرورت بھی تھی۔ اس سے انہیں بے حد فائدہ پہنچا، اگر وہ امام رازی کا طریقۂ تفسیر اختیار کرتے تو فائدہ نفی کے برابر ہوتا۔

مطلب الطالبین: حضرت شیخ یعقوب صرفی رح | اکبر کے دور میں

جو علماء اپنے علمی تبحّر، تبلیغ و اصلاح اور زہد و تقویٰ میں مختلف حلقوں میں چاہے وہ سلاطین و امراء کا حلقہ ہو یا ادباء اور دانشوروں کا، صوفیاء اور روحانی پیشواؤں کا ہو یا سرگرم سیاست دانوں کا، یکساں مقبولیت اور عزت و احترام کے مالک تھے۔ ان میں حضرت شیخ یعقوب صرفی عاصمی کشمیری بھی ایک تھے۔ امورِ کشمیر سے متعلق یہ جلال الدین اکبر کے مُشیر، علمی مجالس میں فیضی کے قریبی دوست، حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی جیسے مجدّد و مُصلح کے اُستاد اور مُربّی اور حضرت شیخ سلیم چشتی کی محفلِ عشق کے ندیم تھے۔ ہم نے اُن کے حالاتِ زندگی پر حدیث کے باب میں قدرے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

حضرت شیخ صرفی رح نے نثر و نظم اور عربی و فارسی میں بہت سی فاضلانہ کتابیں لکھی ہیں جن کا تعلق دینیات میں حدیث، تفسیر

اور فقہ تینوں علوم سے ہے ۔ علاوہ ازیں تاریخ، شعر اور ادب پر بھی اُن کی مفصل کتابیں موجود ہیں۔ عربی میں اُن کی جلیل القدر کتابوں میں قرآنِ حکیم کی مبسوط عربی تفسیر "مطلب الطالبین فی تفسیر کلام ربّ العالمین" کے نام سے ہے جو آج بھی کئی کتب خانوں میں موجود ہے[۱]۔ راقم کے سامنے ریاست جموں و کشمیر کی ریسرچ لائبریری کا ادھورا نسخہ موجود ہے جو ۱۷۰۱/۱۶۰۵ "سم" سائز کے ۲۸۰ صفحات پر مشتمل ہے اور صرف سورۂ فاتحہ اور سورۂ بقرہ پر مشتمل ہے۔ یہ شاید مصنّف کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے اس پر جگہ جگہ اصلاحی حاشیئے ہیں۔ چونکہ آخری اوراق معدوم ہیں، اس لئے کاتب کا تعیّن کرنا مشکل ہے۔ تاہم بہت سے اوراق کرم خوردہ ہیں اور کاغذ کسی حد تک بوسیدہ ہو چکا ہے یہی اس نسخے کی قدامت کا واضح ثبوت ہے۔ اگر یہ شیخ صرفی کے اپنے ہی ہاتھ کا نسخہ ہوگا تو یہ مسوّدہ ہو سکتا ہے نہ کہ مبیّضہ۔

حضرت صرفیؒ نے آٹھ دس سطور میں اس کی تمہید لکھی ہے جس میں اپنی تفسیر لکھنے کا یہ سبب بیان کیا ہے کہ "بعض ساتھیوں کے اصرار پر انہیں یہ کام ہاتھ میں لینا پڑا وہ قرآنِ حکیم کے معانی و مطالب اور اس کے رموز و اسرار کھول کر جاننا چاہتے تھے۔" آگے اپنی معروفیات کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے کہ "اگر اس تفسیر کا ایک صفحہ

---

[۱]: ایک نسخہ حافظ محمود خاں شیرانی کی ذاتی لائبریری میں ہے۔ یہ ذخیرہ اب پنجاب یونیورسٹی لاہور منتقل ہو گیا ہے۔ اس نسخے کے کاتب کا نام روح اللہ بن نذیر بیگ لکھا ہے اور ماہ رمضان ۱۰۷۷ھ مطابق ۱۶۶۶ء میں لکھا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو مجلہ اردو تحقیقات پاکستان جون و اپریل ۱۹۶۸ء "فہرست مخطوطات شیرانی" مرتبہ ڈاکٹر محمد بشیر حسین۔

ہندوستان میں تو اس کا دوسرا صفحہ کشمیر میں لکھنا پڑا ہے۔" آگے اُمید ظاہر کی ہے کہ خدا اس کے ذریعہ سے خود مؤلف اور مسلمانوں کو فائدہ بخشے گا اور لوگ مؤلف کو اسکے انتقال کے بعد فاتحہ سے یاد کریں گے۔

جس زمانے میں حضرت صرفیؒ نے یہ کام شروع کیا اس میں اُن کے دوست فیضی کی تفسیر "سواطع الالہام" تحسین اور تنقیص کا نشانہ بنی ہوئی تھی۔ فیضی اس تفسیر میں قرآن کی روح اور مقاصد سے بے نیاز ہوکر صرف اپنا ادبی کمال دکھانا چاہتا تھا۔ راسخ العقیدہ علما اسے ربانی کلام کے ساتھ ایک مذاق سمجھتے تھے۔ شیخ یعقوب صرفی بھی عقیدتمند مسلمان تھے تاہم اُن کا ظرف بڑا وسیع تھا۔ انہوں نے فیضی کی تفسیر پر تقریظ بھی لکھی ہے جو مطبوعہ سواطع الالہام میں دیکھی جا سکتی ہے، لیکن ساتھ ہی انہوں نے اس تفسیر سے پیدا ہونے والے منفی اثرات پر روک لگانے کیلئے ایک بلند مرتبہ اور شایانِ شان تفسیر کا کام شروع کیا جس میں انہوں نے متقدمین کی تحقیقات سے بھی کما حقہ، استفادہ کیا اور خود بھی غور و خوض کیا۔ خود ہی لکھتے ہیں:

"اودعت فیہ اقوال المتقدمین	میں نے اس تفسیر میں اگلے
والمتأخرین واضفت الیھا	پچھلے مفسروں کے اقوال شامل کیے
ما سنح لخاطر فاطری	اور اس کے ساتھ ساتھ قرآنی
من النکات الوافیات لحل	سورتوں اور آیتوں میں جو رموز
مشکلات السوّر والآیات	اور نکات مجھ پر روشن ہوئے
(مطالب الطالبین، ورق ۱)	انہیں بھی سپردِ قلم کیا۔

چنانچہ پیش نظر نامکمل نسخہ میں سرسری نظر سے جن کتابوں کا حوالہ ملتا ہے۔ ان میں، حدیث میں صحاح ستہ، مصنف عبد الرزاق، مشکوٰۃ المصابیح، امام بیہقی کی کتاب السنن، امام نووی کی شرح مسلم، طبرانی کی معجم کبیر، دارقطنی، تفسیر میں الدر المنثور، امام فخر الدین رازی کی التفسیر الکبیر، علامہ زمخشری کی الکشاف، ابن منیر کا حاشیہ الکشاف، قاضی بیضاوی کی انوار التنزیل و اسرار التاویل، اصول فقہ میں امام شافعی کی کتاب الام، علامہ سعد الدین تفتازانی کی التوضیح والتلویح، بیان و بلاغت کی کتابوں میں مطول اور دلائل الاعجاز وغیرہ شامل ہیں۔

مطلب الطالبین میں شیخ صرفی نے اہم قرآنی مباحث جہاں بھی آئے ہوں ان کی کوشش کی ہے۔ صرف و نحو، بیان و بلاغت، عقائد و کلام، شریعت و احکام اور احسان و تصوف سے متعلق بے شمار مباحث ہیں جہاں جہاں موقعہ مل سکا قیمتی معلومات پیش کئے ہیں۔ ایاک کی بحث میں کلمۂ ایا کی خاصیت پر ائمۂ نحو نے جو رائیں پیش کی ہیں شیخ صرفی نے ان کا لب لباب ایک ماہر فن کی طرح پیش کیا ہے۔ یہی حال الفاظ کے اشتقاق پر روشنی ڈالنے کے وقت نظر آتا ہے۔ خود اس تفسیر کی سلیس عبارت ہی مفسر مرحوم کے عربی علوم میں رسوخ و مہارت کا بیّن ثبوت ہے۔

شرعی احکام میں وہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مقلد ہیں اور انہی کے مختارات کی تائید کرتے ہیں تاہم دوسرے ائمۂ فقہاء

کی تحقیقات بھی احترام و عزت کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

انہوں نے زیادہ وضاحت اور تفصیل ربانی علوم اور روحانی مضامین و مطالب سے مخصوص رکھی ہے۔ چونکہ وہ خود وسیع النظر عالم ہونے کے ساتھ بلند پایہ صوفی صافی بھی تھے اس لئے حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کی طرح ایسا کرنے کا حق بھی رکھتے تھے۔ وہ اکثر سوال و جواب کی صورت میں اشکالات کا جواب دیتے اور مشکلات کی تفہیم کرتے ہیں۔ مثلاً سورۂ فاتحہ میں اللہ تعالیٰ نے "انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم" میں انعام کی اسناد اپنی طرف کی ہے، جبکہ غضب کو بغیر اسناد رکھا۔ اس کی وجہ سوال و جواب کی صورت میں اس طرح بتلائی:

"فان قلت انہ تعالیٰ کما صرح باسناد الانعام الیٰ ذاتہ ولم یقل الذین غضبت علیھم۔ قلت: اما اولاً فلانہ فی اسنادہ الیٰ ذاتہ تعالیٰ سواء کان لطفاً او قھراً نوع تکریم وتشریف۔ حتیٰ ان العارفین یغبطون ابلیس فی قولہ تعالیٰ ان علیک لعنتی الیٰ یوم الدین	اگر تم کہو گے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے انعام عطا کرنے کو اپنی طرف وضاحت سے منسوب کیا اس طرح غضب کو اپنی طرف نہیں کیا! تو میں کہوں گا کہ پہلی بات یہ ہے کہ کسی معاملے کو چاہے وہ لطف و مہر کا ہو یا غضب و قہر کا، خدا کی طرف نسبت دینے اور حوالہ کرنے میں ہی ایک طرح کی بڑی عزت افزائی ہے یہی وجہ ہے کہ عرفاء نے اس آیت

ولمّا لم يكن هؤلاء الاذلّة من اهل التكريم لم يسند الغضب عليهم الى ذاته سبحانه"۱؎

انّ علیک لعنتی الی یوم الدّین یعنی اے ابلیس روز جزا تک تم پر میری پھٹکار رہے گی" میں ابلیس پر ٹوک کیا ہے۔ چونکہ اس آیت میں یہ ذلیل لوگ کسی بھی عزت افزائی کے مستحق نہیں تھے اسلئے خدا نے اُن کے غضب کو یہاں اپنی طرف نسبت دینا بھی گوارا نہیں کیا۔

اس نکتے کو انہوں نے بڑا لطیف اور بڑا عمدہ بتایا ہے:

"وهذه النكتة الطف النكات واحسنها عند من له ادنى مسكة من الشهود والعرفان"۲؎

جسے علم و عرفان کا معمولی حصہ بھی حاصل ہوگا۔ اس کے نزدیک یہ سب سے لطیف و حسین نکتہ شمار ہوگا۔

قرآن کے عارفانہ مضامین کی وضاحت انہوں نے شیخ اکبر محی الدین ابن عربی رح کی تحقیقات عالیہ کی روشنی میں کی ہے۔ جسے وہ "رئیس الموحدین الشیخ محی الدین" کہتے ہیں۔

غرض حضرت شیخ صرفی رح کی مطلب الطالبین ذخیرۂ تفاسیر میں چوٹی کی تفسیروں میں شامل کرنے کا حق رکھتی ہے۔ مگر افسوس یہ ہے کہ جس طرح اُن کے ادبی کمالات سے نظر انداز کرنے کی حد تک غفلت برتی گئی اُسی طرح ان کی تفسیر سے بھی علماء نے بہت

۱؎ : مطلب الطالبین، ورق ۹۸، الف ۲؎ : ایضاً، ورق ۹۸، الف

کم اعتنا کیا۔ کاش، خدا کا کوئی بندہ تحقیق و تہذیب کے ساتھ اس کی اشاعت کا بیڑا اٹھاتا!

جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا کہ حضرت شیخ صرفیؒ کی علمی جامعیت کے اُن کے سرکردہ معاصر اہل علم قائل اور معترف تھے۔ مُلّا عبدالقادر بدایونی نے ان کی تفسیر کو اُن کی ذہانت و فطانت اور غیر معمولی صلاحیت کا بڑا حیرت انگیز کارنامہ قرار دیا ہے[۱] اسی طرح ابوالفیض فیضی نے، جو بہت کم اپنے معاصر علمائے دین کو خاطر میں لاتا تھا، سواطع الالہام پر حضرت صرفیؒ سے تقریظ لکھوائی۔ ہمارے بعض قدیم تذکرہ نگاروں نے اس تقریظ کے بارے میں بے بنیاد باتیں لکھی ہیں۔ مثلاً یہ کہ یہ تقریظ بھی بے نقط ہے، اور یہ کہ حضرت صرفیؒ نے اس میں فیضی کو تنبیہ کی ہے کہ وہ اپنے کام پر زیادہ ناز نہ کرے وغیرہ۔ ان بے بنیاد باتوں سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ ان تذکرہ نگاروں نے تقریظ کے بارے میں صرف سُنا ہے اسے دیکھا نہیں ہے۔ حضرت صرفیؒ کی یہ تقریظ با نقط ہے اور چھیالیس اشعار پر مشتمل ہے۔ مطلع یہ ہے:

یا مَن بسرّ الوحي انت اعلمُ
قد جاء نا منک الکتاب المحکم[۲]

یہ نظم سواطع الالہام اور اس کے مصنف سے کہیں زیادہ قرآن مجید اور حامل قرآن پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف پر مشتمل ہے۔ بلکہ

---

[۱]: منتخب التواریخ، ج ۳، ص ۲۰۰، ۲۰۱۔
[۲]: سواطع الالہام، ص ۷۳۹۔

جہاں اُن کو موقع ملا فیضی کی آزاد خیالی پر درپردہ اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔ مثلاً:

مَن فسّر القرآن لا عن رایہٖ
عبدٌ عظیمٌ شانہٗ بل اعظم [1]

(جس نے قرآن کی تفسیر کو اپنی رائے کا پابند نہیں بنایا، ایسا ہی شخص بڑا ہے اور اسی کی شان بڑی ہے۔)

بعض تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ حضرت شیخ یعقوب صرفی نے خواجہ یعقوب چرخی (خلیفہ شیخ بہاؤ الدین نقشبندی) کے ایماء پر پارۂ عمّ اور سورۃ الملک کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا تھا، راقم کو تلاش کے باوجود اس کا کوئی نسخہ دستیاب نہ ہو سکا۔

جامع المفردات: شیخ مراد الکشمیری | ہندوستان میں لغات القرآن پر جس نے سب سے پہلے کام کیا وہ شیخ محمد مراد بخاری کشمیری ہیں۔ اگرچہ ان کے مستند حالاتِ زندگی' جو ان کے نامور پوتے شیخ خلیل مرادی نے لکھے ہیں' کی روشنی میں ان کے کشمیری ہونے پر کوئی روشنی نہیں پڑتی ہے۔ تاہم عصر حاضر کے سرکردہ محققین نے انہیں صاف الفاظ میں کشمیری لکھا ہے اور ان کے ایک معاصر کشمیری مؤرخ نے بڑے فخر سے اپنی تاریخ کشمیر میں اُن کے حالات قلمبند کیے ہیں بلکہ اُن کے حالات و کمالات میں ایک مستقل رسالہ بھی لکھا ہے تو لازماً ہم بھی یہاں اُن کی پیروی میں ان کے مختصر حالات کو

[1]: سواطع الالہام، ص ۲۰۷۔
[2]: حیاتِ صرفی، مولوی محمد شاہ سعادت مرحوم، الیکٹرک پریس لاہور، ۱۳۵۶ھ، ص ۷۶۔

اپنی کتاب کی زینت بناتے ہیں۔ عمر رضا کحالہ نے ان کے نام اور کام کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

محمد مراد بن علی الکشمیری البخاری مفسّر صوفیّ۔ ارتحل الی دمشق وھو شابٌ ثمّ الی دیار الرّومیّۃ و توفیّ بھا۔[۱]

محمد مراد بن علی کشمیری بخاری نقشبندی مفسّر اور صوفی تھے جوانی میں ہی دمشق وارد ہوئے یہاں سے روم کے ایک شہر آئے اور وہیں انتقال بھی کیا۔

اسماعیل پاشا بغدادی نے ان کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے:

جامع المفردات القرآنیۃ للشیخ محمد مراد ابن علی الکشمیری النقشبندی نزیل القسطنطینیۃ۔ المتوفی بھا اثنین وثلاثین ومائۃ والف (۱۱۳۲ھ)[۲]

جامع المفردات القرآنیۃ کے مصنّف شیخ محمد بن علی الکشمیری النقشبندی تھے۔ جو قسطنطینیہ وارد ہوئے تھے۔ وہیں ۱۱۳۲ھ میں وفات بھی پائی۔

شیخ خلیل مرادی نے ان کے حالات لکھے ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے:

"پورا نام مراد بن علی بن داؤد ...... حسینی حنفی بخاری نقشبندی تھا جو دمشق اور قسطنطینہ وارد ہوئے تھے

۱: معجم المؤلفین، مطبوعہ مصر، ج ۱۲، ص ۱۱۔

۲: ایضاح المکنون فی الذیل علی کشف الظنون، مطبعۃ المعارف الجلیۃ ۱۹۴۵ء، ج ۱، ص ۳۵۸۔

بلند پایہ عالم و امام، قطب الاقطاب، نادرِ روزگار .....
مجسم صلاح و تقویٰ تھے۔ تین زبانوں عربی، فارسی اور
ترکی کے ماہر، دس ہزار احادیث کے مع سند و متن حافظ
اور صاحبِ کرامات بزرگ تھے۔ اُن کے والد سمرقند کے
صاحبِ احترام لوگوں میں تھے۔ جب شیخ مراد تین سال کے
ہوئے تو آپ کے پیروں پر کوئی تکلیف نازل ہوئی جس
سے وہ چلنے پھرنے سے معذور رہے۔ پھر اچانک انہیں
اکتسابِ علم کی طرف توجہ ہوئی اور اُن کی بیماری دور ہوئی
اس طرح عربی علوم اور دیگر فنون حاصل کئے۔ پھر دنیاوی
علائق و خواہشات سے یکسر منہ موڑ لیا اور سالہا سال تک ریاضت
میں غرق رہے۔ اس کے بعد ہندوستان کی طرف ہجرت کی
یہاں حضرت شیخ محمد معصوم فاروقی، جو اُستاد شیخ احمد فاروقی
مجدد کے فرزند اور رفیع یافتہ تھے، سے روحانی تربیت اور
باطنی رہنمائی حاصل کی۔ پھر کچھ مدت بعد انہوں نے حج بیت اللہ
اور زیارتِ روضۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارادہ کیا
اور یہاں تین سال قیام کیا۔ یہاں سے وہ بغداد آگے بخارا
ہوتے ہوئے اصفہان آئے، راستے میں مرزا صائب اُن کی
ملاقات کے لئے نکلا اور اپنے کلام کا انتخاب انہیں پیش کیا۔
اس سفر میں بلخ اور سمرقند کے علماء ان کے ساتھ رہے، پھر
دوسری مرتبہ بھی حج کے ارادے سے نکلے اور ادائیگیٔ حج کے
بعد قاہرہ کی زیارت کی۔ یہاں سے دمشق آئے اور رہائش

میں وہ یہاں داخل ہوئے۔ دمشق کے لوگوں نے عزت و
احترام سے ان کا استقبال کیا ۱۰۹۲ھ میں بلاد روم کی
سیاحت کی اور قسطنطنیہ وارد ہوئے یہاں کے علماء و
صلحائے نے ان کا والہانہ خوش آمدید کہا اور ان سے
طریقت کی تعلیم حاصل کی، یہاں ان کا قیام حضرت ابوایوب
انصاریؓ کے محلے میں رہا۔ پانچ سال کے قیام کے بعد ۱۰۹۷ھ
میں پھر دمشق تشریف لائے۔ پھر تیسری بار حج کا ارادہ
کیا، فریضہ حج ادا کرنے کے ایک سال بعد پھر دمشق آئے
اور عوام و خواص کی نظروں میں یکساں احترام کے مالک
ہوئے وہ حکام اور رؤساء کے ہاں بارسوخ تھے اور
وہ ان کی سفارش مانتے تھے۔ انہوں نے دمشق کے لوگوں سے
کئی مظالم دور کئے۔ یہاں انہوں نے ایک ایسی جگہ
مدرسہ قائم کیا ہے، جو پہلے فسق و فجور کا اڈہ تھا۔ ان
کی کتابوں میں دو جلدوں پر مشتمل مفردات القرآنیہ ہے
جس میں انہوں نے قرآن کے لغات کی فارسی، ترکی اور عربی میں
تفسیر لکھی ہے اور علمائے روم میں بڑی مقبول ہے۔ اسی طرح
طریقۂ نقشبندیہ پر ان کے کئی اہم رسائل اور تحریریں بھی ہیں
ان کا انتقال قسطنطنیہ میں منگل کی رات میں مطابق ۱۲ ار
ربیع الثانی ۱۱۳۲ھ میں ہوا۔ جامع ابی ایوب میں ان کا
جنازہ پڑھا گیا اور درسخانہ، جو نیشانجی محلہ کا مشہور
مدرسہ ہے میں آسودۂ خاک کئے گئے۔ عربی اور ترکی میں

ان کے احباب اور تلامذہ نے مرثیے لکھے۔[۱] (ملخصاً)

اس دَور کے نامور کشمیری مؤرخ خواجہ محمد اعظمؒ نے مختصر الفاظ میں ان کے حالات اپنی تاریخ میں درج کیے ہیں۔ انہیں اُن سے بے پناہ ارادت تھی وہ اُن کے بیعتی مرید اور کشمیر کے سفر و حضر میں اکثر ساتھ رہتے تھے۔ وہ اُن کے علم و فضل، ریاضات، مجاہدات، اصلاح و تبلیغ اور روحانی بصیرت کا ذکر وقیع اور عقیدت بھرے الفاظ میں کرتے ہیں۔ انہوں نے بھی اُن کی طویل گوشہ نشینی اور سرہند شریف کے "فیضِ عام" سے مستفید ہونے کا ذکر کیا ہے۔ تاہم محمد اعظم کے تذکرے میں کچھ تضاد اور نقص ہے۔ اس کی وجہ یہ دکھائی دیتی ہے کہ مؤرخ مذکور اس جہاندیدہ بزرگ کے حالات و کوائف سے پوری طرح باخبر نہیں رہتے تھے۔ اور اس وقت کے ایک غریب گوشہ نشین کشمیری مؤرخ کا ایک برگزیدہ سیّاح کے حالات سے پوری طرح باخبر رہنا ممکن بھی نہیں تھا۔

حضرت سیّد مراد نقشبندیؒ کو کشمیر سے وہی تعلق رہا ہے جو حضرت میر سیّد علی ہمدانیؒ کا تھا۔ اگر وہ کشمیر الاصل بزرگ نہیں تھے اور نہ اُن کی ولادت یا وفات یہاں ہوئی ہے تاہم انہوں نے سالہاسال کی مدّت یہاں گزاری ہے اور بے شمار مسلمانوں کو فائدہ پہنچایا ہے۔ علماء اور مشائخ کشمیر کو اُن سے گہری عقیدت تھی اور اُن کے انتقال پر نثر و نظم اور عربی و فارسی میں مرثیے لکھے ہیں۔ خود مؤرخ محمد اعظم نے اُن کے حالات و کمالات

---

[۱] : سلک الدُرر فی اعیان القرن الثانی عشر ج ۴ مطبوعہ بولاق ۱۳۰۱ھ

پر ایک رسالہ فیض مراد کے نام سے لکھا تھا۔ ایک مختصر مرثیہ میں وہ
ان الفاظ میں انہیں عقیدت کا خراج ادا کرتے ہیں:

از جفائے سپہر غم بنیاد / سر کنم بادل حزیں فریاد
چشم از سیل گریہ جیحون است / دامن آسمان ہمہ خون است
شاہِ دیں شیخ آسماں بدرگہ / مقتدائے زمانہ مرشدِ راہ
اختر برج لی مع اللہی / گوہر معدنِ حق آگاہی [۱]

بحوالہ، البغدادی اور کشمیری مؤرخ اعظمی نے اپنی کتابوں میں اُن
کا تذکرہ "سید محمد مراد" کے نام سے لکھا ہے جبکہ اُن کے نامور حفید
شیخ خلیل مرادی نے اُن کا نام سید مراد بن علی لکھا ہے اور سید
محمد المرادی کے نام سے اُن کے فرزند کا علیحدہ اور مستقل تذکرہ قلمبند
کیا ہے۔ سید محمد مرادی اپنے والد سید مراد نقشبندی کے بعد دمشق
میں اُن کے جانشین کی حیثیت سے مقیم ہوئے تھے اور بڑی عزت و
وجاہت کے مالک تھے۔ اگرچہ ان کی ولادت ۱۰۹۴ھ میں قسطنطنیہ
میں ہوئی تھی مگر مستقل قیام دمشق میں کیا تھا اور یہیں ۱۱۶۹ھ
میں ان کا انتقال بھی ہوا تھا۔ وہ کئی کتابوں کے مصنف تھے
جن میں دلائل الیمن والبرکات، تحفۃ الاحباب اور
منزیل الخفا خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔[۲]

دمشق میں یہ "مرادی" خانوادہ عرصۂ دراز تک علم و فضل

۱: واقعاتِ کشمیر، ص ۲۲۳، ۲۲۴۔
۲: سلک الدرر، ج ۴، صفحہ ۱۱۶۔

درس و افتاء اور زہد و تقویٰ کا مرکز رہا ہے۔ سید محمد مرادی کے بعد اُن کے فرزند سید علیؒ اپنے والد کے جانشین اور ان کی قیمتی وراثت کے امین ہوئے تھے۔ وہ عرصۂ دراز تک دمشق میں مفتی احناف تھے۔ علماء اور مقتدر لوگ ان کی خدمت میں آتے اور استفادہ کرتے تھے۔ دیگر ممالک کے امراء اور علماء کے ساتھ بھی ان کے روابط تھے۔ انہوں نے حضرت شیخ عبدالغنی نابلسیؒ جیسے بزرگ سے علمی اور روحانی فائدے حاصل کئے تھے۔ اس کے علاوہ کئی فقہی کتابوں کے مصنف بھی تھے۔ جن میں "الروض الرائض فی عدم صحۃ نکاح اهل السنۃ للروافض" اور "الوجیہ عند فقد العصبات تزویج اولوا الارحام صحیح" قابلِ ذکر ہیں۔ وہ عربی میں شعر کہنے کا ماہرانہ ذوق بھی رکھتے تھے اور اُن کے فرزند نے ان کے بہت سے اشعار اپنی کتاب میں نقل کئے ہیں[1]۔ ان کے باقیات صالحات میں اُن کے جلیل القدر فرزند شیخ ابوالفضل محمد خلیل مرادی بھی شامل ہیں جن کی تصنیف "سلک الدرر فی اعیان القرن الثانی عشر" تاریخ و تراجم کی اہم اور مبسوط کتاب ہے جس سے نامور فضلاء نے استفادہ کیا ہے۔ جرجی زیدان معترف ہے :

قد عولنا علیہ فی بعض التراجم[2] — ہم نے بعض تراجم میں اس کتاب پر اعتبار کیا۔

---

[1] سلک الدرر، ج ۳، ص ۳۱۹ تا ۳۲۸۔

[2] تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ، ج ۴، ص ۲۹۶، مطبعۃ الہلال ۱۹۳۱ء

شیخ خلیل مرادی، دمشق میں ۱۱۷۳ھ میں تولد ہوئے تھے۔ ۱۱۹۲ھ میں انہیں دمشق کا مفتیٔ احناف مقرر کیا گیا۔ سیاست میں بھی سرگرم حصہ لیتے تھے۔ آخر میں حلب کی طرف ہجرت کی اور یہیں ۱۷۶۰ء/۱۱۸۴ھ میں وفات پائی۔ سلک الدرر کے علاوہ انہوں نے درج ذیل چار کتابیں لکھی ہیں۔

۱۔ عرف البشام فی من تولی فتوی دمشق الشام۔

۲۔ مطمع الواجد فی ترجمۃ الوالد۔

۳۔ اتحاف الاخلاق باوصاف الاسلاف۔

۴۔ تحفۃ الدہر۔

غرض یہ خاندان استنبول اور دمشق میں عرصۂ دراز تک علم و فضل، درس و افتاء، ادب و انشاء اور زہد و تقویٰ کا مرکز رہا۔

جامع المفردات | یہ کتاب شیخ مراد نقشبندی کے علم و فضل کے ساتھ تینوں زبانوں عربی، فارسی اور ترکی میں انکے زبردست رسوخ و مہارت رکھنے کا بیّن ثبوت ہے۔ اس کا ایک مخطوطہ جامع ازہر کے کتب خانے میں محفوظ ہے جو ۱۱۶۹ھ کا لکھا ہوا ہے اور فارسی رسم الخط میں ہے۔ یہ نسخہ ۱۱۳۰ صفحات پر مشتمل ہے۔[1] شیخ مراد نے قرآن مجید کے لغات کو ایک مستقل فن قرار دے کر اس پر قلم اٹھایا۔ چونکہ مصنف کو تینوں زبانوں میں مہارت تھی

[1]: فہرس المکتبۃ الازہریۃ، طبع دوم مطبعۃ الازہریۃ ۱۳۷۱ھ (۱۹۵۲ء) ج ۱، ص ۱۷۲۔

اس لئے اس فن کا ایک قابلِ قدر نمونہ اہلِ علم کے سامنے رکھا۔
اس میں انھوں نے دو ترتیبیں ملحوظ رکھی ہیں، پہلی ترتیب سورتوں اور دوسری ترتیب حروف تہجی کے مطابق ہے سورتوں کی ترتیب تو وہی ہے جیسی قرآن میں ہے پھر ہر ایک سورت کے الفاظ کے معانی حروفِ تہجی کی ترتیب کے ساتھ درج کئے ہیں۔ مولانا عبدالحلیم چشتی اس اہم کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں: "لغات القرآن پر ہندوستان میں سب سے پہلے بارھویں صدی ہجری میں کام ہوا اور شیخ محمد مراد بخاری کشمیری نے اس موضوع پر ایک جامع کتاب لکھی جس کا نام جامع المفردات ہے، یہ اپنی نوعیت کی پہلی اور آخری کتاب ہے اس میں الفاظ قرآنی کے معانی تینوں زبانوں میں بیان کئے گئے ہیں"[1] جامع المفردات کے سوا شیخ مراد نے نقشبندی طریقہ کے آداب پر ایک اور رسالہ لکھا ہے۔ شائد اسی کا نام "سلسلۃ الذہب" ہے[2] اگرچہ عمر رضا کحالہ "رسالۃ فی آداب الطریقۃ النقشبندیۃ" لکھا ہے[3]۔

زبدۃ التفاسیر: شیخ معین الدین نقشبندی کشمیری سلسلۂ نقشبندیہ کے ممتاز ترین مبلغ اور روحانی پیشوا حضرت شیخ معین الدین نقشبندی کشمیری، حضرت خواجہ خاوند محمود نقشبندی کے قابل فرزند تھے

---

[1]: الاتقان فی علوم القرآن (اردو) مقدمہ مولانا عبدالحلیم چشتی، اصح المطابع کراچی، ص ۶۷۔

[2]: اسماء المؤلفین و آثار المصنفین، ج ۲، ص ۳۱۶۔

[3]: معجم المؤلفین، ج ۱۲، ص ۱۱۔

جن کو جہانگیر اور شاہجہاں کے ہاں اتنا تقرب حاصل تھا کہ بلاتکلف حرم خانہ میں داخل ہوتے تھے۔ خواجہ صاحب اپنے زمانہ میں ہندوستان کے سرکردہ روحانی پیشوا اور مصلح تھے ان کا مقبرہ لاہور میں ہے اور تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ [1]

شیخ معین الدین کشمیری کی ولادت کشمیر میں ہوئی۔ علوم کی تحصیل پہلے اپنے نامور والد سے کی۔ اس کے بعد دہلی آئے اور یہاں حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے حلقۂ درس میں داخل ہو کر فقہ و حدیث کا درس لیا اس کے بعد کشمیر لوٹے اور یہاں خانقاہ نقشبندیہ (خواجہ بازار سرینگر) میں درس و تدریس، وعظ و تبلیغ، تربیت و ارشاد اور تصنیف و تالیف کی خدمات انجام دینے میں منہمک ہوئے اور انہی ذمہ داریوں کو سنبھالتے ہوئے ۱۰۸۵ھ میں انتقال کیا [2] ان کی قبر مرجع خلائق ہے۔ انتقال کے وقت عمر ۷۰ سال سے تجاوز کر چکی تھی۔ ان کے تین فرزند تھے جو ان کی زندگی میں ہی داغ مفارقت دے گئے تھے۔ انتقال کے بعد ان کی باصلاحیت اہلیہ نے خانقاہ کا انتظام و انصرام سنبھالا۔ مورخ محمد اعظم ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

در آباد کاری کارِ مرداں   اس خاتون نے خانقاہ کو آباد

---

[1]: رودِ کوثر، ڈاکٹر شیخ محمد اکرم، فیروز سنز، ص ۴۱۲، و نقوش، لاہور نمبر، ص ۳۱۹ تا ۳۲۲۔

[2]: حدائق حنفیہ، نولکشور ۱۹۰۶ء ص ۴۲۱، خزینۃ الاصفیاء، ج ۲ ص ۶۲۴۔ نزہۃ الخواطر و بہجۃ المسامع والنواظر، ج ۵، ص [illegible]

فرمودند و اطعام عمله و خدمۂ
روضه و خانقاه و وابستگان
دیگر بنوعے فرمودند که یادگار
اہلِ روزگار ماند[1]

رکھنے میں مردانہ کارنامے انجام
دئے۔ خانقاہ اور آستانے کے
ملازموں اور خادموں اور دوسرے
عقیدتمندوں کو اس طرح کھلاتی پلاتی
اور ضروریات پوری کر دیتی تھی
کہ زندہ جاوید شخصیت بن گئی۔

شیخ معین الدین صاحب جی عام کشمیری علماء کی طرح مسلکاً حنفی اور مشرباً صوفی تھے۔ وہ صاحب بصیرت صوفی ہونے کے باوجود بدعات و محدثات کے شدید مخالف تھے۔ مولانا غلام سرور لاہوری نے بجا طور پر لکھا ہے:

در زہد و تقویٰ و اتباعِ
شریعت و ترویجِ سنّت و
ترفیعِ بدعت ثانی نداشت۔[2]

زہد و تقویٰ، شریعت کی پیروی،
سنّت کی اشاعت اور بدعات
کا خاتمہ کرنے میں بے نظیر تھے

شیخ معین الدین صاحب نہ صرف اپنے دور میں کشمیر کے رہبر اور رہنما عالم تھے بلکہ علماء کے مرکز و محور بھی تھے۔ اُس دور کے تقریباً سارے کشمیری علماء فتویٰ دینے میں انہی کی پیروی کرتے تھے، جو علماء اُن کے پاس کثرت سے آمد و رفت رکھتے تھے ان میں مورخ محمد اعظم نے درج ذیل فضلاء کے نام درج کئے ہیں:

مولانا محمد طاہر فرزند مولانا حیدر علامہ۔ مولانا ابو المفتح کلو۔

۱: تاریخ اعظمی، ص ۱۶۹۔
۲: خزینۃ الاصفیاء، ج ۲، ص ۶۴۴۔

مولانا یوسف مدرس ملا عبد الغنی اور شیخ احمد مفتی۔

شیخ معین الدین صاحبؒ بلند پایہ مصنف بھی تھے۔ تفسیر، حدیث، فقہ اور تصوف پر ان کی نظر گہری تھی اور ان تینوں علوم پر انہوں نے عربی میں گراں قدر ذخیرہ بطور یادگار چھوڑا ہے۔ اُن کی درج ذیل کتابیں آج ملک اور بیرون ملک کے کتاب خانوں میں موجود ہیں۔

(۱) زبدۃ التفاسیر (عربی)
(۲) شرح القرآن (فارسی)
(۳) الفتاویٰ النقشبندیۃ (عربی)
(۴) کنز السعادۃ (فارسی)
(۵) الرضوانی (فارسی)
(۶) ردّ الملاحدۃ (عربی)

ان کتابوں میں "الفتاویٰ نقشبندیۃ" کا تفصیلی تعارف فقہ کے باب میں کیا گیا۔ ردّ الملاحدۃ بظاہر قرآن ہی سے تعلق رکھتا ہے کیونکہ جیسا کہ انہوں نے پیش لفظ میں اس کی تصریح بھی ہے کہ بعض معاصر ملحد یہاں تصوف اور روحانیت کے نام پر قرآنی آیات کی رکیک اور بارد تاویل کرکے اپنا اور سادہ لوح مسلمانوں کا ایمان و یقین برباد کرنے پر تلے ہوئے ہیں بالخصوص نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج سے بچنے کے لئے بے بنیاد اور ناقابل اعتبار خیالات کا اظہار کرتے ہیں جن کا قرآن و حدیث اور تعامل کے ساتھ کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ ایسے ہی ملحدوں اور اُن کے فاسد و ملحدانہ افکار کو

کی تبلیغ کے لئے یہ رسالہ لکھا گیا ہے ہم نے اس رسالے کو عقائد پر لکھی ہوئی کتابوں میں شامل کرکے کلام اور عقائد کے باب میں یہاں جگہ دی۔

زبدۃ التفاسیر، شیخ معین الدین صاحب کا اہم ترین علمی کارنامہ ہے۔ اس تفسیر کو اس حیثیت سے شیخ یعقوب صرفی کی تفسیر پر بھی فوقیت حاصل ہے کہ یہ مکمل ہے اور مکمل صورت میں کچھ تاریخی کتاب خانوں میں موجود ہے۔ اس کا ایک نسخہ بانکی پور کے خدا بخش لائبریری میں محفوظ ہے۔ یہ خط نسخ میں لکھا ہوا ہے، کہیں کہیں جگہ کرم خوردہ بھی ہے۔ متن اور تفسیر کے لئے علیحدہ علیحدہ روشنائی استعمال کی گئی ہے۔ لائبریری میں اس کا نمبر ۱۴۴۶ ہے۔[۱] اسی لائبریری میں ایک اور نسخہ رقم ۷۹۱ بھی محفوظ ہے۔ تیسرا نسخہ کیمبرج یونیورسٹی لائبریری میں ہے، اور اسے ۱۰۷۵ھ مطابق ۶۵-۱۶۶۴ء لکھا گیا ہے۔[۲] چوتھا نسخہ سعیدیہ لائبریری ٹونک میں ہے، اس کی تقطیع درمیانی درجے کی ہے اور صفحات کی تعداد ۱۰۱۷ ہے۔[۳] ایک اور نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے کتاب خانے

---

[۱] Catalogue of the Arabic and Persian Manuscripts, Banki-pore, Vol 18, Part II, P.127

[۲] Handlist of Mohammadan Manuscripts, Brown, No. 319

[۳] : "معارف" اعظم گڈھ، مارچ ۱۹۶۷ء، مضمون معین الدین بن محمود کشمیری، از قاضی محمد عمران خاں صاحب۔

میں محفوظ ہے جو ۱۰۵۰ھ میں لکھا گیا ہے ۔ لہ

زبدۃ التفاسیر، ان الفاظ سے شروع ہوتی ہے:

"الحمد للّٰہ الذی ہو ناسخ الادیان والباقی فی علاہ الی انقراض الدوران۔"

خاتمے کی عبارت سعدیہ لائبریری (ٹونک) اور خدا بخش لائبریری (پٹنہ) کے نسخوں میں مختلف ہے۔ سعدیہ لائبریری کے نسخے کی عبارت یہ ہے:

"الحمد للّٰہ حمداً کثیراً۔ قد وقع الفراغ من تالیف ہذا التفسیر....... وفی کشف وجوہ عرائس الفوائد مع الاقتصاد عن طرفی الاکثار والاقلال۔"

خدا بخش لائبریری کے نسخے میں ترقیمے کے الفاظ یہ ہیں:

"الحمد للّٰہ المعین المحمود الذی وفقنی لاتمام تحریر زبدۃ التفاسیر من جہد المعین فی یوم عشرین من رجب المرجب سنۃ الف واحدی وسبعین ارجوا من قرأ ہذا التفسیر الشریف ان لا ینسی فی دعائہم المستجاب۔"

اپنی دوسری کتابوں کی طرح اس تفسیر کو بھی شیخ معین الدین صاحب نے سلطان محی الدین اورنگ زیب کے نام معنون کیا ہے۔ سلطان کے لئے حافظِ دین وملت، سلطانِ اعظم و مفخم، کفار و روافض کا قاتل، دین حنیف کو زندہ کرنے والا، مساجد اللہ کا آباد کار،

لہ • Catalogue of Arabic Manuscripts, Asiatic Society by Lane, No. 186

پابند شریعت، جیسے تعظیمی القاب و آداب استعمال کئے ہیں۔ [1]
شیخ معین الدین صاحب کا زمانہ سامنے رکھتے ہوئے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یہ تفسیر اس عہد کا بلند پایہ علمی کارنامہ ہے۔ ٹونک کے کتب خانے میں جو نسخہ محفوظ ہے اس کے کاتب نے (جس کا نام مولانا عبدالکریم خوشنویس ہے جو نواب محمد علی خاں والیٔ ریاست ٹونک کا درباری عالم تھا) ان الفاظ میں اس پر تبصرہ لکھا ہے۔

التفسیر الذی لا نظیر لہٗ	یہ ایسی تفسیر ہے جو الفاظ کے
فی وجازۃ لفظہٖ وسلاسۃ	اختصار، عبارت کی سلاست اور
مبانیہٖ وایضاح معانیہٖ۔ [2]	معانی کی وضاحت میں بے مثال ہے۔

عربی تفسیر قرآن کے علاوہ شیخ معین الدین صاحب نے فارسی زبان میں بھی قرآن پاک کی تفسیر لکھی ہے۔ اس کا بھی ایک قیمتی نسخہ معہدیہ لائبریری میں محفوظ ہے اور یہ ۱۲۸۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ نسخہ نادر اور مصنف کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا۔ اور جا بجا انہی کے تصحیحی حواشی سے آراستہ ہے۔ فارسی زبان میں اس تفسیر کی موجودگی سے اب خود بخود یہ تسلیم کرنا محل غور ہو گیا کہ ہندوستان میں شاہ ولی اللہ صاحب رح نے ہی سب سے پہلے فارسی زبان میں قرآن کا ترجمہ لکھا ہے۔ [3]

---

[1]: ہندوستانی مفسرین اور ان کی عربی تفسیریں، محمد سالم صاحب قدوائی، ص ۷۹
[2]: "معارف" مارچ سنہ ۱۹۶۱ء۔
[3]: رودِ کوثر، ڈاکٹر شیخ محمد اکرام، فیروز سنز پاکستان، ص ۱۴۵

آیاتُ الاعجاز، شیخ عبدالرشید شوپیانی کشمیری

| تیرہویں صدی ہجری کے نصف آخر کے ممتاز کشمیری علماء میں سے تھے اور نواب صدیق حسن خان کی علمی مجلس کے رکنِ رکین بنے تھے۔ کشمیر میں اُن کا تعلق مشہور اور تاریخی مقام "شوپیان" سے تھا۔ یہ نام "شاہ پایاں" کی بگڑی ہوئی شکل ہے[۱] اس راستے سے مغل سلاطین کشمیر وارد ہوا کرتے تھے، یہی شاہ پایاں نام پڑنے کی وجہ ہے۔ مولانا عبدالرشید نے اپنی ایک تحریر میں اس علاقے کی خوبصورتی اور خوشگوار آب و ہوا کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

الشوپیان ...... قصبۃ من اعمالِ کشمیر بینھا و بین قاعتہ البلدۃ اربع فراسخ بھا یضرب المثل حتی فی کشمیر بعذوبۃ الماء ولطافۃِ الھواء و نظارۃ الخضراء والاطراف والارجاء۔[۲]	شوپیان، کشمیر کے مضافات میں سے ایک قصبے کا نام ہے اس کے اور مرکز شہر کے درمیان چار فرسخ کا فاصلہ ہے، کشمیر میں اس کی خوبصورتی، شادابی، قابلِ دید اطراف و اکناف اور معتدل ہوا، نیز میٹھا پانی ضرب المثل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

---

[۱]: اس کے لیے The Jammu & Kashmir ... کی Fredric Drew کی Imperial Gazetteer of India, Territories کا پندرہواں حصہ ملاحظہ کیجئے۔

[۲]: المنتقیٰ، حافظ مجد الدین ابن تیمیہ، مقدمہ مولانا عبدالرشید شوپیانی، ص ۴ مطبع فاروقیہ دہلی، ۱۲۹۷ھ۔

شوپیاں ہی میں مولانا عبدالرشید کی ولادت ہوئی تھی اور یہیں علوم متداولہ کی تحصیل بھی کی تھی۔ اس زمانے میں میاں نذیر حسین صاحب دہلوی کے بعض شاگردوں نے کشمیر میں غیر مقلدیت کی تبلیغ شروع کی تھی اور مولانا عبدالرشید کا گھر بھی اس سے پوری طرح متاثر ہوا تھا۔ وہ طالب علمی کے زمانے میں بھوپال آئے اور نواب صدیق حسین خاں کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو کر ان کے محکمۂ افتاء میں ذمہ دار منصب پر پہنچے۔ کچھ مدت کے بعد نواب صاحب کسی وجہ سے ان سے ناراض ہوئے اور انہوں نے مولانا عبدالرشید کو جلاوطن کر دیا۔ مولانا ہوشنگ آباد آئے اور یہاں سخت مصیبتوں اور تلخیوں کے شکار ہوئے۔ ان کا سارا صبر و سکون ختم ہوا اور علمی و تصنیفی زندگی درہم برہم ہو کر رہ گئی، خود ایک جگہ لکھتے ہیں: کہ میری حالت اس مثل جیسی ہو گئی ہے، "ذبحت لغسلے لکن لا بسکین"۔[1] تاہم اگر اگر نواب صاحب مرتے دم تک ان سے ناراض رہے مگر ان کے کنبے کے افراد کا ان سے آخر تک عقیدتمندانہ تعلق رہا۔ نواب صاحب کے فرزندوں نے جب اپنے والد کا رسالہ "ظفر اللاضی" شائع کیا تو اس پر مولانا عبدالرشید ہی سے تقریظ لکھوائی۔ اس میں موصوف نے اپنی تلخیوں اور پریشانیوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے اسی حالت میں ان کا انتقال ۸ صفر ۱۲۹۸ھ میں جبلپور میں ہوا۔

مولانا عبدالرشید صاحب، اسلامی علوم کے عالم تھے خاص طور پر

---

[1] ظفر اللاضی بما یجب فی قضاء علی القاضی، نواب صدیق حسن خان بھوپال ۱۲۹۴ھ ص ۱۶۱۔

عربی زبان و ادب پر اُن کی نظر وسیع تھی وہ خود عربی زبان میں نظم و نثر میں لکھنے پر قادر رہتے تھے۔ قرآن اور حدیث پر اُن کے دو مستقل رسالے موجود ہیں۔ حدیث پر لکھے ہوئے رسالے کو ہم نے حدیث کے باب میں پیش کیا ہے اسی طرح شعر و ادب کے باب میں بھی اُن کی شاعری کے نمونے پیش کئے جائیں گے قرآن پر لکھے ہوئے رسالے کا نام آیات الاعجاز ہے یہ ایک بہت ہی مختصر رسالہ ہے جسے انہوں نے اُنہی کی وضاحت کے مطابق ایک ہی دن میں اشراق سے لیکر غروب آفتاب تک دو نشستوں میں لکھا تھا۔ اِس کا ایک نسخہ ندوۃ العلماء لکھنو کے کتب خانے میں (رقم: ۲۷) موجود ہے۔ [۱]

آیات الاعجاز یہ رسالہ ایک پیش لفظ اور تین فصلوں پر مشتمل ہے۔ اس کے تالیف کرنے کا سبب یہ ہوا کہ مؤلف کو کسی دوست سے قرآن کے مقدارِ اعجاز سے متعلق بحث ہوئی تھی۔ مگر مولانا کے دلائل سے ان کے دوست اور ان کے دوسرے ہمخیال مطمئن نہیں ہوئے تھے، انہوں نے مولانا کا جواب سختی سے ٹھکرا دیا تھا۔ جیسا کہ وہ خود لکھتے ہیں:

"أطالوا في الإزراء	انہوں نے ملامت اور
والملامة ألسنتهم الاسنة	خورده گیری کی زبان دراز

[۱]: احقر کو اس کی نقل اس کے ایک عزیز شاگرد ڈاکٹر غلام قادر لون کے توسط سے حاصل ہوئی۔ جس کیلئے مؤلف ندوۃ کے شعبۂ مخطوطات سے وابستہ حضرات اور لون صاحب کا شکر گذار ہے

زعماً منهم ان هذا قول کی اور خیال کیا کہ یہ قول

محدث ما انبأ بہ احد" بے بنیاد ہے۔

پہلی فصل، میں انہوں نے اعجاز کی لغوی اور اصطلاحی تحقیق کرکے قرآن کے اعجاز کی حقیقت واضح کی ہے اس میں انہوں نے نہایت اختصار کے ساتھ بلاغت اور معانی کے سرکردہ علماء جیسے ابوالبقاء، قاضی ابوبکر باقلانی، سکاکی، علامہ زملکانی، مراکشی، الزرکشی وغیرہم کے اقوال بطور استشہاد نقل کئے ہیں۔

دوسری فصل، میں یہ بات واضح کی ہے کہ کونسی آیت کس صحابی کی موافقت میں نازل ہوئی ہے۔ مثلاً آیت " من کان عدوا اللہ و ملائکتہ و رسلہ ... الخ یہ حضرت عمرؓ کی زبان سے نازل ہوئی ہے اسی طرح جنگ بدر کے قیدیوں کے معاملے میں جب اصحاب رسولؐ کی رائیں مختلف ہوئیں تو وحی حضرت عمرؓ کی تائید میں نازل ہوئی۔ اسی طرح مؤلف نے حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت مصعب بن عمیرؓ وغیرہما کی تائید میں نازل ہونے والی آیتوں کی نشاندہی کی ہے اور حدیث کی کتابوں سے اُن معلومات اکٹھے کئے ہیں۔

تیسری فصل، میں مؤلف نے ان لوگوں کا پُرزور تردید کی جو اعجاز کو صرف قرآن کی طویل سورتوں تک محدود رکھتے ہیں اور یا تین سے کم آیتوں کیلئے اعجاز ضروری نہیں سمجھتے ہیں۔ ان کی تحقیق ہے کہ قرآن کا یہ معجزہ اس کی تمام آیتوں پر محیط ہے اور جن و انس کیلئے یکساں طور پر چیلنج پیش کرتا ہے۔ مقدار کی کمی یا بیشی میں محدود کرنے سے یہ چیلنج بے معنی بن جائیگا جس سے قباحتیں پیدا ہوسکتی ہیں جن پر جانور ہنسیں گے اور دیندار روئیں گے۔

رسالہ ۱۲۹۵ھ کے ماہ شعبان کے کسی ایک ہی دن میں لکھا گیا ہے۔ اس کی ابتدا میں نواب صدیق حسن خان اور اختتام میں نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ کا ذکر خیر بھی ہے۔ آخری عبارت یہ ہے:

" وانا الفقیر الجانی ابو الفتح عبد الرشید الکاشمیری الشوپیانی عفا عنہ اللّٰہ "

مولانا ثناء اللہ امرتسری کشمیری اور ان کی تفسیر ۳: شوپیان کی طرح ڈورو بھی اسلام آباد کشمیر کا ایک تاریخی اور جغرافیائی لحاظ سے خوبصورت علاقہ ہے۔ اس کی مٹی سے متعدد علماء اور شعراء اٹھے ہیں جنہوں نے فارسی شعر و ادب کو مالا مال کیا ہے۔ مولانا ثناء اللہ صاحب کے خاندان کا تعلق اسی شاداب مقام سے تھا۔ انہوں نے اپنی اردو تفسیر کے دیباچے میں لکھا ہے — " میرے والد مسمی خضر جو اور تایا مسمی اکبر جو علاقہ ڈورو تحصیل اسلام آباد ضلع سرینگر سے پشمینہ کا کاروبار کرنے امرتسر آتے تھے[۲] " ان کی ولادت امرتسر میں ۱۲۸۷ھ میں ہوئی تھی اور کشمیری کے بجائے امرتسری سے مشہور ہوئے۔ کشمیری پر امرتسری غالب آنے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہوئی کہ مرزا غلام احمد قادیانی نے، جس کے سر پر مولانا ثناء اللہ صاحب برہنہ خنجر کی طرح لٹکتے رہے، مولانا کی ذات

۱: انہی کے زمانے میں مصر کے مشہور ادیب اور شاعر سید مصطفیٰ الصادق الرافعی نے اعجاز القرآن کے نام سے ایک رسالہ لکھا ہے اگرچہ وہ بھی بقامت کہتر ہے مگر اس میں انہوں نے جو بیش بہا علمی جواہر ودیعت کئے ہیں وہ دیکھنے ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔

۲: منتخب حواشی مع ترجمۂ ثنائی قرآن مجید، ادارۂ اشاعت دین مومن پورہ بمبئی ۱۱، ۱۹۶۱ء، ص ۵۰۔

سے زیادہ اُن کے مولد کو اپنے سب و شتم کا نشانہ بنالیا۔ مرزا صاحب نے اپنے عربی اشعار میں طعن و تشنیع اور گالی گلوچ کا نشانہ جہاں جہاں امرتسر کو بنایا ہے[۱] وہاں ثناء اللہ صاحب ہی مراد ہیں۔

مولانا ثناء اللہ صاحبؒ کے والد کا انتقال اس وقت ہوا جب اُن کی عمر صرف سات سال تھی، پھر چودھویں سال کی عمر میں اُن کی والدہ بھی دنیا سے رخصت ہوگئیں اور اسی عمر میں مولانا کو تعلیم حاصل کرنے کا شوق دامنگیر ہوا۔ انہوں نے پہلے امرتسر کے بعض سرکردہ اساتذہ جیسے مولانا احمد اللہؒ اور شیخ عبد المنان سے اکتساب فیض کیا۔ پھر دہلی آئے اور یہاں مولانا نذیر حسین صاحب دہلوی مرحوم کے حلقۂ درس میں داخل ہوئے۔ پھر دیوبند آئے اور یہاں کے ممتاز اساتذہ سے نصابی تعلیم کی تکمیل کی۔ دیوبند کے اساتذہ میں وہ شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحبؒ سے زیادہ متأثر تھے، کیونکہ بقول اُن کے حدیث کے ساتھ اُن کو خاص انس تھا۔[۲] کچھ وقت انہوں نے مدرسۂ فیض عام کانپور میں گزارا اور مولانا احمد حسن کانپوری سے چوٹی کی علمی کتابیں پڑھیں۔ ۱۳۱۰ھ میں مدرسۂ فیض عام میں تقسیم اسناد کا جلسہ ہوا اور جن آٹھ طالب علموں کی دستار بندی ہوئی اُن میں مولانا بھی ایک تھے۔[۳] اس طرح ۱۳۱۰ھ

۱: اس کے لئے مرزائے قادیان کی دو کتابیں "درِّ ثمین" اور "انجام آتھم" ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔
۲: منتخب حواشی، ص ۴۹۔ ۳: ایضاً، ص ۵۱۔

میں وہ مدرسی زندگی سے فارغ ہوئے وہ اب امرتسر لوٹے۔ یہاں ایک مطبع قائم کیا اور اہلحدیث کے نام سے ایک ہفتہ وار رسالہ جاری کیا جس نے پورے چوالیس سال تک مسلک اہلحدیث کے ساتھ ساتھ عقائد اہلسنت والجماعت کی تبلیغ و نصرت پوری قوت کے ساتھ کی۔ ان کی پوری زندگی باطل فرقوں اور اسلام دشمن نظریات کی تردید میں صرف ہوئی، یہاں تک کہ اپنے زمانے کے سرکردہ مناظروں میں شمار ہوئے۔ مولانا عبدالحی صاحبؒ نے اُن کا تذکرہ ان الفاظ سے شروع کیا ہے:

الشیخ الفاضل ثناءُ اللّٰہ بن خضر جو الکشمیری ثمّ الامرتسری اَحَدُ الفضلاء المشہورین بالمناظرۃ۔[۱]

۱۳۲۶ ہجری میں جب اُن کے اور مرزا غلام احمد قادیانی کے درمیان مخالفت اور منافرت انتہا کو پہنچ گئی تو مرزائے قادیان نے بے بس ہوکر چیلنج کیا کہ ہم دو میں سے جو مفسد و کذاب ہوگا وہ اپنے حریف کی زندگی میں ذلت و حسرت کی موت مرے گا۔ اس اعلان کے ایک سال بعد ۲۶ رمئی ۱۹۰۸ء میں مرزا غلام قادیانی حسرت کی موت مرا، اور مولانا ثناءُ اللّٰہ صاحبؒ متنبیٔ کاذب کی موت کے پورے چالیس سال بعد انتقال کر گئے۔ انہوں نے اپنی مایہ ناز عربی تفسیر میں ایک جگہ اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے:

انّہ یخبر من شیئ مرزا صاحب کو کسی چیز کے

---

[۱] : نزھۃ الخواطر، ج ۸، ص ۸۵۔

فیـ ـومیں سکے یُخبرُ
بموت ادنیٰ غنڈا ھو جنگی
... عُمہ ... یاب اخر
نیمہ ... ۔ له

ہو جانے کی خبر دی جاتی ہے تو اس کا اثر ظاہر ہوتا ہے اُسے کسی شخص کے مر جانے کا الہام ہوتا ہے تو وہ زندہ رہتا ہے اسی طرح اُسے کسی کے زندہ رہنے کا الہام ہوتا ہے، مگر وہ مر جاتا ہے۔

مولانا ثناء اللہ صاحب تقسیم کے بعد گجرانوالہ (پاکستان) آ گئے مگر صرف ایک سال زندہ رہ کر راہی ملکِ بقا ہوئے۔

مولانا موصوف نے چھوٹی بڑی درجنوں کتابیں لکھی ہیں بیسویں صدی کے نصف اوّل میں مسلمانوں کی اصلاح اور اسلام دشمن طاقتوں کا ابطال کرنے میں ہندوستان کے جن علماء نے غیر معمولی کردار ادا کیا ہے ان میں مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری بھی ایک تھے۔ کٹر اہلحدیث ہونے اور فروعی اختلافات کو غیر معمولی اہمیت کے ساتھ پیش کرنے کی وجہ سے اگرچہ اُن کے اور دوسرے ممتاز ترین علماء کے درمیان کبھی کبھار شکر رنجی بھی پیدا ہوتی تھی تاہم قادیانیوں، آریہ سماجیوں اور عیسائی پادریوں کا جم کر مقابلہ کرنے کی وجہ سے، نیز مختلف دینی اداروں اور فلاحی و اصلاحی تنظیموں میں دل و جان سے حصّہ لینے کی وجہ سے سب علماء اُن کی عزّت کرتے تھے۔ اُمتِ اسلامیہ کی جن جلیل القدر شخصیتوں سے

له : تفسیر القرآن بکلام الرحمٰن، مطبع اہل حدیث امرتسر ۱۳۲۱ھ ص ۲۱۱ - (حاشیہ)۔

وہ متأثر تھے اور جن کے علوم سے انہوں نے فیض حاصل کیا ہے وہ بھی انہی کی تصریح کے مطابق علامہ شوکانی، حافظ ابن حجر عسقلانی، حافظ ابن قیم، بیہقی، امام غزالی، ابن حزم، عبدالکریم شہرستانی، ابن تیمیہ حرانی، امام رازی اور شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی ہیں۔

تفسیر ثنائی | انہوں نے قرآن مجید پر تین مستقل کتابیں لکھی ہیں جن میں دو عربی اور ایک اردو زبان میں ہے۔ اردو زبان والی کتاب سے ہماری مراد تفسیر ثنائی ہی ہے جس کے آج تک کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اس ترجمے میں انہوں نے زیادہ تر حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی کی موضح القرآن سے استفادہ کیا ہے۔ چونکہ وہ کٹر اہلحدیث تھے اس لئے حواشی میں مسائل احکام میں اسی مسلک کو پیش نظر رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہلحدیث حضرات میں اسے بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔

بیان القرآن علی علم البیان | یہ کتاب خاص قرآن مجید کے اسلوب اور ادبی اعجاز پر لکھی گئی ہے۔ اس میں قرآن کی تمثیلات و تشبیہات، سورتوں کی وجہ تسمیہ، مضامین کے رابطہ و ترتیب وغیرہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کا صرف ایک ہی حصہ شائع ہوا ہے۔

تفسیر القرآن بکلام الرحمٰن | چونکہ مولانا کے علمی کارناموں میں یہ کتاب شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے اس لئے ہم قدرے تفصیل سے اس کا تعارف پیش کرتے ہیں:

تفسیر القرآن بکلام الرحمٰن میں مولانا ثناء اللہ صاحب نے قرآنی آیات کے معانی و مطالب قرآن ہی کی آیات سے متعین کرنے کی کوشش کی ہے

اُن کے زمانے میں قدیم باطنیت مختلف فتنوں کی صورت میں سر نکال چکی تھی، اور اِنہی کے علمبردار کتاب اللہ کو اپنی مذبوحی حرکات سے مشقِ ستم بنا رہے تھے۔ اس لئے ان کی سرگرمیوں پر روک لگانے کی غرض سے انہوں نے زیرِ تبصرہ کتاب لکھی۔ انہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ملحدوں اور زنادقہ کے باطل افکار کا قرآن سے کوئی تعلق نہیں ہے اور یہ لوگ جو قرآن کی آڑ لیتے ہیں سادہ فریب کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ اس کام کے لئے انہوں نے قرآن کا بڑی گہرائی سے مطالعہ کیا ہے۔ اگر یہ دعویٰ کرنا بہت مشکل ہے کہ مولانا ممدوح اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب ہوئے ہیں تاہم اس میں انہوں نے جو محنت و مشقت اٹھائی ہوگی اس سے انکار نہیں ہو سکتا۔ بہت سے مقامات پر وہ معانی و مطالب سمجھانے سے قاصر نظر آتے ہیں اور قدرتی طور پر ایسی جگہوں پر معنوی تعقید پیدا ہوئی ہے بالخصوص احکام و عبادات سے متعلق آیات، جن کا سمجھنا اور سمجھانا احادیثِ رسولؐ پیشِ نظر رکھے بغیر ناممکن ہے، کی تفسیر میں بے بس ہو کر حواشی کا سہارا لیا ہے جن میں احادیث و آثار اور دوسرے عقلی و نقلی سرمائے سے مدد لی ہے۔

تفسیر کی ابتداء میں انہوں نے واضح کیا ہے کہ مفسرین کرام نے اپنی تفسیروں میں مشکلات و معضلات کی تشریح و تفہیم میں آثارِ سلف اور دلائلِ عقلیہ کا سہارا لیا ہے۔ البتہ بزرگانِ دین قرآن کے معانی کی تعیین قرآن ہی سے کرنا پسند کرتے تھے، میں نے عملاً یہ خواہش پوری کرنے کی کوشش کی ہے۔[1]

۱؎ : تفسیر القرآن بکلام الرحمٰن، ، ص ۲ ۔

اگرچہ مولانا ثناء اللہ صاحب اپنے مقصد میں بہت حد تک کامیاب ہوئے ہیں تاہم جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا عقائد اور احکام سے تعلق رکھنے والی آیات کے معانی متعین کرنے میں انہیں احادیث و آثار سے استمداد کرنے کے بغیر کوئی اور دوسری صورت نظر نہیں آئی ہے۔ بقول محدث العصر علامہ محمد انور شاہ کشمیری "زیادہ بلیغ کلام میں احتمالات بھی زیادہ ہوتے ہیں اس لئے قرآن حکیم سمجھنے اور سمجھانے کے لئے احادیث سے مدد حاصل کرنا بہت ضروری ہے۔" کیونکہ یہی وہ مضبوط بندھ ہے جو ملحدوں کو قرآن بازیچۂ اطفال بنانے سے دور رکھتا ہے۔ پھر مولانا ثناء اللہ صاحب میں اتنا توسع بھی نہیں تھا کہ وہ فروعی مسائل سے صرف نظر کر کے آیات مقدسہ کی روح اور لُبِّ لباب سمجھانے تک محدود رہتے انہوں نے اس نازک مہم میں بھی آمین کو جہر پڑھنے، رفع یدین کرنے، قرأت فاتحہ خلف الامام راجح ثابت کرنے پر زور دیا ہے اس طرح انہیں دوسرے ذرائع کا بھی سہارا لینا پڑا۔ آیت مقدسہ "وإذا قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا لعلكم ترحمون۔" کی تشریح اس آیت شریفہ سے کی ہے: "وقال الذين كفروا لا تسمعوا لهذا القرآن والغوا فيه لعلكم تغلبون۔" جب اس سے بھی تسلی نہیں ہوئی تو یہ حاشیہ لکھ کر اپنے فقہی نقطۂ نظر کی وضاحت کی:

استدل بعض اصحابنا	ہمارے بعض حنفی علماء نے
الحنفية بهذه الآية	اس آیت سے قرأت خلف الامام

علیٰ مَنْعِ قِرَأَةِ الْفَاتِحَةِ خَلْفَ الْإِمَامِ وَالْحَقُّ أَنَّهُ لَيْسَ بِمُمَارَاہوا۔[1] | کی نفی پر استدلال کیا ہے مگر سچی بات تو یہ ہے کہ انہوں نے جو کچھ سمجھا وہ درست نہیں ہے۔

پھر اس حاشئے سے بھی اطمینان نہیں ہوا، اس لئے مزید وضاحت ان الفاظ میں کی، " علماء کو اس آیت کے نزول میں اختلاف ہے، بعض اسے خطبے کے ساتھ خاص سمجھتے ہیں اور بعض نماز سے مختص کرتے ہیں۔ مگر صحیح یہ ہے کہ یہ آیت وعظ و تذکیر کی حالت میں قرآن سُننے کے بارے میں نازل ہوئی ہے، اس لئے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآن کفار کے سامنے تلاوت فرماتے تھے تو وہ اسے نہیں سُنتے تھے۔ بلکہ دورانِ تلاوت شور و غل مچاتے تھے اس پر اللہ تعالیٰ نے دورانِ تلاوت انصات و استماع کا حکم دیا۔[2]

اسی طرح مولانا ثناء اللہ صاحبؒ حضرت خضر علیہ السلام کی موت کے قائل ہیں۔ یوں تو حیاتِ خضرؑ کے قائل دوسرے بہت سے بلند پایہ علماء بھی رہے۔ جن میں امام بخاریؒ، حافظ ابن تیمیہؒ، علامہ ابن قیمؒ، علامہ ابن کثیرؒ، علامہ ابن جوزی رحمہم اللہ اجمعین بھی شامل ہیں۔[3] البتہ وہ علماء جو تصوّف اور روحانیت میں غیر معمولی مقام و مرتبہ کے مالک تھے، انہوں نے حضرت خضر علیہ السلام کی حیات پر زور دیا ہے۔ یہاں دیکھنے کی بات یہ ہے کہ مولانا ثناء اللہ صاحبؒ نے جو

---

[1]: تفسیر القرآن بکلام الرحمٰن، ص ۱۶۵ - [2]: ایضاً۔
[3]: قصص القرآن، مولانا محمد حفظ الرحمٰن سیوہاروی، ج ۱۔

آیت حضرت خضرؑ کی موت کے ثبوت میں پیش کی ہے، کیا اس سے واقعی ممات خضرؑ کا مفہوم اخذ ہوتا ہے۔ مولانا ممدوح سورۂ کہف کی آیت "فوجدا عبداً من عبادنا" میں عبد سے مراد خضرؑ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

کان اذ ذاک حیاً[1]	خضرؑ اس وقت زندہ تھے

پھر حاشیہ پر لکھتے ہیں:

فیہ اشارۃ الی ان خضر قد مات لقولہ علیہ السلام لو کان الخضر حیاً لزارنی[2]	اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام وفات پا چکے ہیں۔ چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اگر خضر زندہ ہوتے تو ضرور میری ملاقات کرتے۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ کس بنا پر یہ ارشاد ہے! قرآن مجید کی کسی بھی آیت سے حضرت خضر علیہ السلام کی دائمی زندگی پر روشنی پڑتی ہے نہ موت پر۔ یہاں تک کہ "خضر" نام بھی قرآن حکیم میں کہیں مذکور نہیں ہے۔ جہاں تک حیات خضر علیہ السلام پر حدیث سے استدلال کرنے کی بحث کا تعلق ہے تو ان کی حیات کے قائل علماء نے جوابات دیئے ہیں۔[3]

اسی طرح جب ان آیات سے گزرتے ہیں، جن کی وضاحت

---

[1] تفسیر القرآن بکلام الرحمٰن، ص ۲۶۹ - [2] ایضاً (حاشیہ)

[3] ملاحظہ ہو: روح المعانی، علامہ محمود آلوسی، مطبوعہ مصر، ج ۱۶

میں کچھ فرقوں کے اہلِ قلم مختلف رائے رکھتے ہیں تو اطمینان بخش قرآنی تشریح و توضیح پیش کرنے سے قاصر رہتے ہیں، اور صرف حیرانگی کا اظہار کرنے پر اکتفا کرتے۔ مثلاً آیت "انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اہل البیت و یطھرکم تطھیرا" سے شیعہ علماء نے اہل بیت سے ازواج مطہرات رضوان اللہ علیہن اجمعین کو خارج کرکے صرف اصحاب کساء تک محدود کر دیا۔ مولانا تو اسے رد تو کرتے ہیں مگر اپنے موقف کی اطمینان بخش تفسیر نہیں کر پاتے ہیں حاشیہ میں لکھتے ہیں:

لیت شعری کیف تخص الکریمۃ باصحاب الکساء وتخرج الازواج منھا ویعرض عن السیاق و سباق والشواھد وغیرھا فافھم ولا تکن من المقصرین. (ص ۴۲۵۵۲۵)	کاش میں جانتا کہ اس آیت کو آخر کس وجہ سے چادر ڈالے ہوؤں تک محدود رکھا جائے، اور ان سے ازواج مطہرات کو خارج کیا جائے سیاق و سباق اور شواہد سے منہ موڑا جائے۔ پس اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کرو، اور کوتاہی کرنے والوں میں نہ بن جاؤ۔

اسی طرح مولانا ثناء اللہ صاحب بعض آیات کی تشریح و تفسیر اس طرح کرتے ہیں کہ معتزلہ اور عصر حاضر کے عقل پرست مفسروں کے ہمنوا نظر آتے ہیں۔ سورۃ طٰہٰ کی آیت مبارک "فقبضت قبضۃ من اثر الرسول" میں اکثر و بیشتر مفسرین نے الرسول

سے حضرت جبرئیلؑ مراد لیا ہے: جب کہ معتزلہ نے اس سے حضرت موسیٰ علیہ السلام مراد لیا ہے۔ وہ سامری کی زبان سے کہتے ہیں:

اَیْ وقتَ ذَھابِکَ اِلَی الطّور فقبضتُ التّراب مِن اَثرِکَ باعتقاد النّاس ؎۱	اے موسیٰؑ! یہ مٹھی بھر مٹی میں نے تیرے قدموں کے نیچے سے اس وقت اٹھائی جب تم کوہِ طور پر گئے۔ ایسا میں نے لوگوں کی عقیدت دیکھ کر کیا۔

یہی وجہ ہے کہ مولانا ثناء اللہ صاحبؒ کو اس تفسیر کی اشاعت کے ساتھ ہی بعض علماء کی جانب سے سخت اعتراضات کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ معترضین میں اُن کے اپنے حلقے کے لوگ بھی شامل تھے۔ ان اعتراضات کی صدائے بازگشت سعودیہ عرب کے علمی حلقوں میں بھی سنائی دی۔ عبدالعزیز بن سعود کو ان کی تحقیقات کے لئے علماء کی ایک مجلس قائم کرنی پڑی تھی۔ ؎۲

غرض یہ تفسیر اپنی نوعیت کے لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتی ہے، اس میں ان کے پیشِ نظر اسلامی عقائد کی معنویت مسخ کرنے والے جدید دور کے زنادقہ کو بے نقاب کرنے کا مقصد رہا ہے، خاص طور پر قادیانیت، دہریت اور انکارِ حدیث جیسے فتنے ان کی دوربیں نگاہ کی زد سے باہر نہیں رہتے ہیں۔

تفسیر القرآن: مولانا سید ابوالقاسم حائری کشمیر سے تعلق رکھنے والے ممتاز شیعہ علماء میں اپنی جلالت قدر اور توسّع و

؎۱ تفسیر القرآن بکلام الرحمن ص ۲۸۲ ؎۲ تفصیل کیلئے "حیاتِ ثنائی" ملاحظہ کیجا سکتی ہے

عالمی ظرفی میں بڑی شہرت اور احترام کے مالک تھے۔ عمر رضا کحالہ
نے اِن الفاظ سے آپ کا تذکرہ شروع کیا ہے:

"ابو القاسم بن الحسین بن التقی الرضوی الیزدی
القمی، الحائری الهندی الکشمیری فقیہ ومفسر"۔[1]

منشی محمد الدین فوق نے انہیں چند گنے چنے علمائے کشمیر
میں شامل کیا ہے[2] اسی طرح العاملی اور التبریزی نے بھی
انہیں جلیل القدر کشمیری عالم ہی کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔[3]

مولانا ابوالقاسم کے والد بزرگوار سید حسین القمی ایران
کے مشہور ومعروف شہر قم سے کشمیر وارد ہوئے تھے اور انہوں نے
کشمیر ہی کو اپنا مستقل وطن بنایا تھا، وہ تاجر پیشہ تھے
اور پشمینہ کا کاروبار کرتے تھے۔ اُن کی تجارت کشمیر ہی تک
محدود نہیں تھی، بلکہ پنجاب اور لکھنو تک پھیلی ہوئی تھی۔ لکھنو
میں انہیں نواب واجد علی شاہ کے دربار میں تقرب حاصل
ہوا تھا کشمیر میں اُن کے فرزند مولانا ابوالقاسم کی ولادت
۱۲۴۹ھ میں ہوئی تھی۔ والد نے اُن کو تجارت ہی کی طرف راغب
کرنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہوئے تھے کیونکہ ان کی طبیعت
شروع ہی سے تحصیل علم کی طرف مائل تھی۔ جب تعلیم کی طرف
متوجہ ہوئے تو جلد ایک بڑے عالم کی حیثیت سے مشہور ہوئے

---

[1]: معجم المؤلفین، ج ۸، ص ۹۸۔
[2]: مشاہیر کشمیر، ص ۱۰۸ تا ۱۱۲؛ ظفر برادرس لاہور، طبع دوم ۱۹۳۰ء
[3]: اعیان الشیعہ، ج ، ص ۱۰۶۔

اسی زمانے میں اُن کو لکھنؤ کے نامور عالم سلطان العلماء آقا سید محمد سے فاضل ابو القاسم کا لقب عطا ہوا۔ پھر نواب علی رضا خان قزلباش کے زمانے میں وہ اپنے والدین اور بھائیوں کے ساتھ لاہور منتقل ہوئے۔ تھوڑی سی مدت بعد نواب علی رضا خان اور نواب ناصر علی خان نے حج کا ارادہ کیا اور معلّم کی حیثیت سے مولنا ابو القاسم کو اپنے ہمراہ لیا اس طرح انہیں حجاز اور کربلا کے نامور علماء سے ملنے کا بھی موقع ملا۔ کہتے ہیں اس زمانہ میں عراق اور عرب میں مولنا ابو القاسم کے علم و فضل کا چرچا بھی ہوا، اور فاضل ہندی سے مشہور ہوئے۔ وہ یہاں سے ایران آئے اور مشہد، شیراز، قم، کرمان اور اصفہان کے مقتدر علماء سے ملاقاتیں کیں نیز ان کے درس میں شریک ہوئے واپسی پر دونوں نوابوں نے انہیں کشمیر کا ارادہ ترک کر اور لاہور کو اپنی مستقل قیام گاہ بنانے پر اصرار کیا، چنانچہ وہ لاہور منتقل ہوئے اور یہاں ایک بلند پایہ مدرسہ قائم کیا۔ اس کے بعد انہوں نے ایک مسجد کی بنیاد ڈالی جس میں نماز پنجگانہ کے علاوہ جمعہ و عیدین کی نمازوں کی ادائیگی کا اہتمام مُدّت دراز تک جاری رہا۔ غرض حج کے بعد اپنی بقیہ زندگی درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کے کاموں میں ہی بسر کی، یہاں تک کہ ۱۴ محرم ۱۳۲۴ھ کو انتقال کیا، اس وقت ان کی عمر ۷۵ سال تھی انہیں لاہور کے امام باڑہ گامے شاہ میں سپرد خاک کیا گیا۔ ان کے معاصر اور ہم وطن مورخ محمد الدین فوق لکھتے ہیں۔ "وفات کے دن لاہور میں عام تعطیل ہوئی، لاہور کی دکانیں بند ہو گئیں

لکھنو، کشمیر، کلکتہ، حیدرآباد اور دوسری ریاستوں میں تعزیتی مجلسیں منعقد ہوئیں۔" — ان کے بعد ان کے نامور فرزند مولانا سید علی حائری اپنے والد کی وصیت کے مطابق مسندِ درس و تدریس، تبلیغ و اصلاح اور تصنیف و تالیف پر بیٹھے۔ وہ بھی بڑے با صلاحیت شخص تھے اور شمس العلماء کا خطاب بھی پایا تھا۔

سید ابوالقاسم حائری وسیع المشرب شیعہ عالم تھے، وہ اپنی مجالس درس و تبلیغ میں تعصب و تنگ نظری سے دور رہنے میں بڑی شہرت رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی ایسی مجلسوں میں حنفی، اہلحدیث، جدید تعلیم یافتہ نوجوان، یہاں تک کہ عیسائی اور آریہ سماجی بھی شریک ہوتے تھے۔ وہ عربی، فارسی اور اردو کے برگزیدہ عالم تھے۔ انہوں نے ان تینوں زبانوں میں کتابیں لکھی ہیں جن کی مجموعی تعداد باسٹھ ۶۲ ہے ان میں ایک کتاب شق القمر کے معجزے پر "برہان شق القمر" سے موسوم ہے۔ مگر ان کی جو کتاب سب سے زیادہ اہمیت اور مقبولیت حاصل کر گئی، وہ ان کی تفسیر لوامع التنزیل و سواطع التاویل ہے۔ یہ تفسیر اگرچہ شیعہ نقطۂ نگاہ سے لکھی گئی ہے مگر تعصب اور مذہبی غلو سے بہت حد تک پاک و صاف سمجھی جاتی ہے چونکہ مولانا ابوالقاسم حائری اس تفسیر کو خود پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچا سکے۔ اس لئے ان کے انتقال کے بعد ان کے فرزند مولانا علی حائری نے اسے اپنے والد کی وصیت پر عمل کر کے مکمل کیا مولانا عبدالحی حسنی (م۔ ۱۹۲۳ء) لکھتے ہیں:

لوامع التنزیل و سواطع — فارسی زبان میں لوامع التنزیل

یا الفارسی ...... فی اثنی عشر مجلدا او زیادۃ الی قولہ تعالیٰ "یا بنیّ اذھبوا فتحسسوا من یوسف واخیہ" للسید ابی القاسم بن الحسین الشیعی الکشمیری لاھوری ولم یوفق بتکملۃ: اعتنیٰ بذالک ابنہ السید علی بن ابی القاسم الحائری وھو فی صدد التکمیل [1]

و سواطع العاویل کے نام سے بارہ [12] جلدوں سے بھی زیادہ حصوں پر مشتمل تفسیر سید ابوالقاسم حائری کشمیری لاہوری کی ہے انہوں نے خود آیت "یا بنیّ اذھبوا فتحسسوا الخ" یوسف تک لکھی ہے اور اس طرح وہ اسے مکمل نہیں کر سکے۔ ان کے بعد ان کے بیٹے سید علی بن ابوالقاسم حائری نے اس کی تکمیل کا بیڑا اٹھایا اب یہ مکمل ہونے کے قریب ہے۔

انہوں نے انتقال سے پہلے اپنے بیٹے کو جو چند خاص وصیتیں کی تھیں ان میں اس تفسیر کی تکمیل کی طرف خصوصی طور متوجہ کیا تھا [2]۔ شیعہ علماء میں اس تفسیر کو غیر معمولی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی اور عراق و ایران اور ٹرکی و ہندوستان کے علماء نے اس پر بیش بہا تقریظیں لکھیں [3]۔

---

[1]: الثقافۃ الاسلامیۃ فی الھند، ص ۱۶۷، المجمع العلمی العربی دمشق سنہ ۱۹۵۸ء

[2]: مشاہیر کشمیر، ص ۱۱۲۔

[3]: اعیان الشیعۃ، ج ۷، ص ۱۹؛ ج ۸، ص ۵۰۶-۵۰۷؛ ج ۱۷، ص ۲۷۴-۲۷۵۔

علم حدیث

اور

محدثین

علمِ حدیث

علمائے کشمیر نے اگرچہ جملہ اسلامی علوم و فنون میں دلچسپی لی ہے تاہم تصوّف اور حدیث میں اُن کا مرتبہ کافی بلند ہے اور ان میں بڑی مہارت اور لیاقت کا ثبوت پیش کیا ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ کشمیری سلاطین کے عروج و ترقی کے زمانے میں وسط ایشیاء اور شرقِ اوسط کے کچھ بلند پایہ صوفیاء اور محدّثین یہاں وارد ہو کر ان علوم کے بڑے معلّم اور مبلّغ ہوئے تھے اور آگے جب مغلوں نے کشمیر کو مملکت ہندوستان میں ضم کیا تو یہاں کے علماء کو ہندوستان اور ہندوستان سے باہر بہت سے اہم علمی مراکز دیکھنے اور ان سے فیوض حاصل کرنے کا موقعہ ملا تھا اور یقیناً علمی ترقی کے لحاظ سے یہ دَور کشمیر کی اسلامی تاریخ کا سنہری دَور ثابت ہوا۔ اسی دَور میں بہت سے سربرآوردہ علماءِ کشمیر نے شیخ ابن حجر مکّی، مُلّا علی قاری، شیخ عبدالحق محدّث دہلوی، شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی وغیرہ ایسے جلیل القدر علماء کے حلقہ درس میں بیٹھکر دینی علوم بالخصوص علمِ حدیث کی تحصیل کی اور آگے خود ان علوم کے ممتاز مدرس و محقق بن گئے اور ہندوستان کے مُقتدر علماء ان کے علمی فیوض سے فیضیاب ہوئے۔ حضرت مجدّد الف ثانی شیخ

احمد سرہندی رح کی علمی پرداخت میں جامع کمالات حضرت شیخ یعقوب صرفی عاصمی کشمیری رح اور حضرت مولانا محمد کمال رح کا بڑا حصہ رہا ہے۔ مکتوبات میں حضرت مجدد صاحب رح نے حضرت شیخ صرفی رح سے اپنے تلمذ پر فخر ظاہر کیا ہے۔[۱] مولانا کمال ہی سے مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی اور نواب سعد اللہ خان علامی نے بھی تعلیم حاصل کی تھی۔[۲] ڈاکٹر محی الدین صوفی نے مولانا کمال کشمیری کی عظمت و فضیلت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ بجا طور پر کشمیر کے امام موفق کہلانے کا حق رکھتے ہیں، جس طرح امام موفق کی عظمت میں اُن کے تین ممتاز شاگردوں عمر خیام۔ حسن بن صباح اور نظام الملک طوسی نے اضافہ کیا ہے اسی طرح مولانا کمال کے فضل و کمال کا ایک روشن ثبوت یہ ہے کہ حضرت مجدد صاحب، علامہ سیالکوٹی اور نواب سعد اللہ ان کے مخصوص تلامذہ رہے ہیں۔[۳] اسی طرح حضرت شاہ ولی اللہ صاحب اور اُن کے فرزندان گرامی سے بہت سے اہلِ کشمیر مستفید ہوئے ہیں جن میں سے اکثر کے نام تاریخ و تراجم کی کتابوں میں مذکور ہی نہیں ہیں تاہم جو اصحاب علمی دنیا میں مشہور ہوئے انہوں نے اپنے ساتھ اپنے اساتذہ کرام کا تعارف بھی کرایا انہی میں مولانا محمد امین کشمیری بھی ایک تھے جنہیں اگر ایک طرف حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کا شاگردِ رشید

۱: ملاحظہ ہو: الفرقان بریلی مجدد الف ثانی نمبر میں مولانا سید مناظر احسن گیلانی صاحب مرحوم کا مقالہ
۲: کشمیر میں فارسی ادب کی تاریخ، عبدالقادر سروری، ص ۱۰۱
۳: KASHIR: Dr. G. M. D. Sufi, Vol 2, P. 373

ہونے کا فخر حاصل تھا تو دوسری طرف حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی کو اس نامور کشمیری فاضل کا شاگرد رہنے کا امتیاز حاصل تھا۔ متأخرین میں علامہ محمد انور شاہ کشمیری آئے جو اگرچہ جملہ اسلامی علوم میں بحرِ ذخار کی حیثیت سے مشہور ہوئے مگر فنِ حدیث میں اپنے دور کے بے مثال محدث تسلیم کئے گئے اور قرونِ اولیٰ کے سربرآوردہ محدثین کی صف میں شمار کئے گئے۔ مشہور مصری محقق اور مصنف علامہ زاہد الکوثریؒ انہیں ان القاب سے یاد کرتے ہیں،

"العلامۃ فقیہ الاسلام المحدث المحجاج"[1]

نفحۃ العنبر پر تبصرہ کرتے ہوئے علامہ سید سلیمان ندویؒ نے لکھا تھا:

"حضرت مولانا انور شاہ کشمیری جملہ مذہبی علوم خصوصاً علمِ حدیث و رجال کے بحرِ ذخار تھے"[2]۔

مولانا عبدالماجد دریا بادیؒ نے انوار الباری پر اپنے تبصرے میں یہ رائے ظاہر کی ہے:

"حنفیوں میں علامہ انور شاہ کشمیری علم و فضل، خصوصاً علمِ حدیث میں اپنی نظیر بس آپ ہی تھے"[3]۔

براعظمِ ایشیا، بالخصوص برصغیر ہند و پاک میں دورِ حاضر میں جن محدثین احناف نے درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کے ذریعہ

---

[1]: مقالات الکوثری، مطبوعہ مصر، ص ۳۵۹۔

[2]: معارف، فروری ۱۹۳۸ء۔

[3]: صدق جدید لکھنؤ، بحوالہ انوار الباری حصہ دوم، ص ۲۹۲۔

علم حدیث کی غیر معمولی خدمت انجام دی ہے وہ سب علامہ کشمیری کے ارشد تلامذہ رہ چکے ہیں۔ حضرت مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی، مولانا صدیق نجیب آبادی (صاحب انوار المحمود شرح سنن ابی داؤد) مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی، علامہ محمد یوسف صاحب بنوری، ابوالمآثر مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی وغیرہ جو اس دور کے سربرآوردہ محدثین میں شمار ہوتے ہیں علامہ انور شاہ کشمیری کے خاص شاگردوں میں شامل ہیں۔

حضرت میر سید علی ہمدانیؒ کی خدمات حدیث

کشمیر میں جملہ اسلامی علوم و فنون کے ساتھ علم حدیث کی بنیاد بھی مبلغ اسلام حضرت سیّد علی ہمدانیؒ کے ہاتھوں ہی پڑی ہے اور کشمیر ہی سے یہ علم شریف ہندوستان کے دور دراز علاقوں تک پہنچا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان میں علم حدیث کا کوئی خاص چرچا نہیں تھا۔ تمام علماء اور باذوق امراء فقہ اور معقولات میں گہری دلچسپی رکھتے تھے اور ان دو علوم سے ہٹ کر خالص حدیث کا پرچار کرنا عام علمی مزاج کے ناموافق تھا۔ سلطان محمد تغلق نے معقولات کی سرپرستی میں جو گہری دلچسپی لے لی تھی اس سے بھی ہندوستان میں علم حدیث کی ترویج و اشاعت رک گئی تھی۔ فقہ حنفی کی تقلید میں اس قدر جمود پیدا ہوا تھا کہ بڑے بڑے علماء بھی اس سے ذرا ہٹنا گوارا نہ کرتے تھے۔ حضرت شیخ نظام الدین اولیاءؒ اور مولانا شمس الدین ترک کے مابین سماع کے مسئلہ نے جو کشیدگی اختیار کی تھی اس سے بھی یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اس زمانے

میں حدیث کی خدمت کرنے کے لئے تمام راستے مسدود تھے۔ شیخ نظام الدین اولیاءؒ کا وہ ارشاد پڑھنے کے قابل ہے جو انہوں نے سلطان غیاث الدین تغلق کے محضرِ سماع میں علمائے احناف سے مخاطب ہو کر کہا تھا:

"وہ ملک کیونکر آباد رہے گا جس میں لوگوں کی رائے کو احادیثِ نبویؐ پر ترجیح دی جاتی ہو۔"[1]

مگر اچانک انہی ایام میں قدرت نے ہندوستان میں علم حدیث کی اشاعت کے اسباب پیدا کئے۔ حضرت شیخ نظام الدین اولیاءؒ کی

---

(۱) سیر الاولیاء: سید مبارک امیر خورد "باب نہم" چرنجی لال ایڈیشن۔ بعض غیر مقلد اہلِ قلم نے فقہ بالخصوص فقہ حنفی کی عظمت گھٹانے کیلئے حضرت شیخؒ کے اس ناصحانہ قول کو من پسند معنی پہنانے کی کوشش کی ہے جو تحقیق اور علمی دیانت کے خلاف ہے۔ حضرت شیخ خود بھی فقہی مسائل میں حنفی مسلک کے مقلد تھے۔ ان کے ارشاد کا مطالعہ تاریخی پس منظر میں کرنا چاہیے۔ مولانا سید مناظر احسن گیلانی نے "ہندوستانی مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت" میں اس پر مفصل روشنی ڈالی ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ بعض اہلِ علم نے دعویٰ کیا ہے کہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور شاہ ولی اللہ صاحب سے پہلے ہندوستان حدیث اور محدثین سے تقریباً خالی تھا مگر اس کے پیچھے کوئی دلیل نہیں ہے۔ علمائے محققین نے علمی اور تاریخی دلائل سے اسے رد کر دیا ہے۔ ملاحظہ ہو ڈاکٹر اسحٰق کی مذکورہ بالا انگریزی تصنیف۔ نیز حیات شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ از پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامی، مطبوعہ ندوۃ المصنفین دہلی۔ "مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت" از مولانا سید مناظر احسن گیلانی، مطبوعہ ندوۃ المصنفین دہلی ۱۹۶۵ء۔ (۲) "معارف" اعظم گڑھ، مقالہ "ہندوستان میں علم حدیث" از مولانا سید سلیمان ندوی، اکتوبر تا دسمبر ۱۹۲۸ء۔

اظہارِ ناپسندیدگی سے خاموش سمندر میں تلاطم پیدا ہوا۔ تین جلیل القدر صوفیائے محدثین نے حدیث کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا اور اسے ہندوستان کے کونے کونے میں پہنچایا۔ ان تین بزرگوں کے اسمائے گرامی یہ ہیں: [۱]

(۱) حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیری (۲) میر سید علی ہمدانی (۳) شیخ زکریا ملتانی۔

غرض ایک معقول مدت کے تعطل کے بعد حضرت شیخ نظام الدین اولیاء اور مذکورہ بالا تین صوفیائے عظام نے ترویج حدیث کی تحریک میں ایک نئی روح پھونک دی۔ ان بزرگوں کی سرگرمیوں کا مقام شمالی ہندوستان تھا۔ نویں صدی ہجری تک شمالی ہندوستان میں علم حدیث کی جو وسیع اشاعت ہوئی اس کا تمام سہرا انہی چار بزرگانِ دین کے سر جاتا ہے۔ ہم یہاں موضوع کے حدود مدنظر رکھ کر صرف حضرت میر سید علی ہمدانی رحمتہ اللہ علیہ کی خدمات حدیث پر روشنی ڈالیں گے۔ کیونکہ ان کے فیوض و برکات سے شمالی ہندوستان میں سب سے زیادہ مستفید کشمیر ہوا ہے اور خود حضرت میر سید علی ہمدانی کی علمی اور فکری سرگرمیوں کا اہم ترین مرکز صرف کشمیر ہی رہا ہے، اور یہیں سے ان کے علوم و افادات کا فیضان اطراف و آفاق میں پہنچا۔

شیخ ہمدانی کی تالیفات حدیث

حضرت میر سید علی ہمدانی کی چھوٹی بڑی کتابوں کی تعداد ڈیڑھ سو سے بھی تجاوز کرتی ہے اور ان میں سے بیشتر کتابیں احادیث و

[۱] India's Contribution to the Study of Hadith Literature: By: Mohd. Ishaq, Dacca 1955, Page 54-56

آثار سے بھری ہیں، تاہم چند کتابیں کچھ اہم خصوصیات کی بنا پر صرف احادیث ہی کی روشنی میں تالیف کی گئی ہیں اور عصرِ حاضر کے محققین نے ان کا ذکر حدیث ہی کے زیرِ عنوان کیا ہے۔ یہاں ہم ایسی چار کتابیں انتخاب کرکے اُن کا تعارف پیش کرتے ہیں۔

۱۔ ذخیرۃ الملوک اس کتاب کے بارے میں ڈاکٹر محمد اسحٰق لکھتے ہیں کہ یہ کتاب اس حقیقت کا کافی ثبوت ہے کہ اس کا مصنّف علم حدیث کا ماہر کامل ہے۔[۱] ذخیرۃ الملوک کا موضوع سیاستِ شرعیہ ہے۔ اگرچہ اس موضوع پر الماوردی، ابن خلدون، ابن طقطقی وغیرہ ماہرینِ فن نے ماہرانہ بحث و تحقیق کرکے اس کے تمام گوشوں کا احاطہ کیا ہے۔ تاہم شیخ ہمدانی کی یہ کتاب بھی اپنی نوعیت کے اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ انہوں نے اس میں سیاست کو اخلاق اور روحانیت کے تابع بنانے کی کامیاب کوشش کی ہے اور دُنیاوی مملکت کے ساتھ باطنی مملکت کے حدود و نقوش بھی عمدہ طریقے پر کھینچے ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے درج ذیل شعر میں اسی کتاب کی طرف اشارہ کیا ہے ؎

مُرشدِ معنیٰ نگاہاں بودہ — معنیٰ اسرارِ شاہاں بودہ (جاوید نامہ)

اس کی اہمیت اور افادیت ماضی میں بھی اسی طرح مسلّم تھی جس طرح آج ہے، مشرق و مغرب میں اس کا مطالعہ دلچسپی سے کیا

---

[۱] :- India's Contribution to the Study of Hadith Literature
Dr. M. Ishaq, The University of Dacca, 1955, P. 54-56

جاتا تھا۔ بلکہ ماضی میں علمائے اسلام سے زیادہ مستشرقین نے اس کتاب کی اشاعت اور دوسری علمی زبانوں میں منتقل کرنے میں دلچسپی لی تھی۔ اس کا ترجمہ لاطینی زبان میں ریزن مولر Ernest. Freidrick Rosenmular. نے ۱۸۲۵ء میں کیا۔ پھر اسی سال سی۔ سالوینت .C. Salvent نے اسے فرانسیسی زبان میں منتقل کیا[1]۔ حاجی خلیفہ لکھتے ہیں کہ مولی مصطفیٰ بن شعبان المتخلص سروری نے ترکی زبان میں اس کتاب کا ترجمہ کیا ہے[2]۔ جہاں تک اردو زبان کا تعلق ہے تو اس میں آج تک اس کے دو ترجمے ہوئے ہیں۔ ایک ترجمے کا نام منہج السلوک ہے اور یہ متن کے بغیر ۱۳۳۴ھ میں پہلی بار لاہور سے شائع ہوا۔ دوسرا ترجمہ مولانا سید محمد قاسم شاہ صاحب بخاری کے قلم سے ہے اور بالکل ادھورا شائع ہوا ہے۔ دس میں سے صرف تین ابواب شائع ہو چکے ہیں۔ اس ترجمے کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس کے ساتھ متن بھی شامل رکھا گیا ہے اور حدیث کی تشریح و تخریج کی جانب بھی توجہ کی گئی ہے۔

ذخیرۃ الملوک حسب ذیل دس ابواب پر مشتمل ہے:

(۱) الایمان، (۲) العبودیۃ، (۳) مکارم الاخلاق، (۴) حقوق الوالدین، (۵) احکام السلطنۃ الصوریۃ

---

[1]: Kashmir: A History of Kashmir, Dr. M.D. Sufi Vol. 2

[2]: کشف الظنون، بحوالہ الذریعۃ الیٰ تصانیف الشیعۃ: آغا بزرگ طہرانی، مطبوعہ طہران ۱۹۵۰ء، جلد ۱۰، ص ۲۱۔

(۶) السلطنة المعنويّة، (۷) الامر بالمعروف والنھی عن المنکر، (۸) الصبر علی المصائب، (۹) ذم الکذب والغضب، (۱۰) حقائق الشکر وافضال اللہ۔

انہی دس عنوانات کے تحت اخلاق و الٰہیات کے جملہ مسائل و مباحث جمع کئے گئے ہیں۔ مصنّف نے ہر فصل کی ابتداء احادیث سے کی ہے پھر تشریح کرکے ان کا لُبِّ لباب درج کیا ہے۔ مثلاً باب دوم "العبودیّة" میں مصنّف نے چالیس حدیثیں تفہیم و تشریح کے لئے چن لی ہیں اور آگے اپنی تشرح کی تائید میں بھی مزید بیسوں احادیث نقل کی ہیں۔ کتاب کا اہم ماخذ مصدر امام غزالی رح کی مشہور و معروف کتاب احیاء العلوم الدین ہے، اس لئے ذخیرة الملوک میں کچھ ایسی حدیثیں بھی منتقل ہوئی ہیں جو ضعیف اور غریب کے درجے کی ہیں۔ کتاب کے اردو شارح نے ان پر کچھ تنبیہی کلمات بھی لکھے ہیں، یہاں ہم ایک حدیث بطور مثال پیش کرتے ہیں۔

مصنّف حکمرانوں کو نصیحت کرتے ہیں کہ وہ مریضوں، غریبوں اور زیادہ عیال رکھنے والوں کی معیشت ٹھیک کرنے کے لئے ہر سال ان کی مدد کیا کریں۔ پھر تائید میں یہ حدیث پیش کی ہے:

"کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یعطی العطا علی قدر عیالہ۔"

یہاں ذخیرة الملوک کے شارح (والد محترم مولانا بخاری صاحب) نے تنبیہاً حسب ذیل الفاظ عربی میں لکھے ہیں:

" قلت انّ حدیث کان یعطی العطا علیٰ قدرِ عیالہ مذکورٌ فی احیاء العلوم الدین۔ وفیہ مکان علیٰ قدرِ عیالہ علیٰ مقدارِ العیلۃ۔ وقال العلامہ العراقی فی المغنی لم اَرَ لہٗ اصلاً۔ ثم قال و لِاَبی داؤد من حدیث عوف بن مالک انّ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلّم کان اذا أتاہُ الفیٔ قسمہٗ فی یومہٖ واعطی الآھل حظّین واعطی العزب حظاً قلتُ : وقد ثبت بھذا انّ لھذا الحدیث اصلاً صحیحًا معنیً و حکمًا۔ "[۱]

میں کہتا ہوں کہ حدیث کان یعطی۔۔۔ الخ " احیاء العلوم میں مذکور ہے۔ البتہ وہاں علیٰ قدرِ عیالہ کی جگہ علیٰ مقدارِ العیلۃ آیا ہے۔ علامہ عراقی نے المغنی میں لکھا ہے کہ میں نے اس حدیث کی اصل نہیں پائی ہے مگر ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے کہ ابوداؤد میں عوف بن مالک سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جب فے آتا تھا تو آپ اسی دن اسے تقسیم بھی کرتے تھے۔ عیالدار کو دو حصے اور بغیر عیال لوگوں کو ایک حصہ دیتے تھے " تو میں کہتا ہوں کہ اسی سے یہ ثابت ہوا کہ یہ حدیث حکم اور معنی دونوں اعتبار سے اصلِ صحیح پر قائم ہے۔

---

۱ : بصیرۃ الملوک شرح ذخیرۃ الملوک : باب دوم، ص ۸ ۔

غرض یہ کتاب میر سید علی ہمدانی رحمتہ اللہ علیہ کی اہم ترین کتابوں میں سے ایک ہے۔ اس کتاب میں ہزاروں احادیث نبوی ؐ تصوف، اخلاق، سیاست اور معیشت کے عنوانات کے تحت درج ہوئی ہیں جن سے حدیث کی امہات الکتب پڑھنے اور پڑھانے کی ترغیب ملتی ہے۔ مزید برآں اس کتاب کو بڑی تاریخی اہمیت بھی حاصل ہے۔ اس سے اُن کے عہد کی عام سیاسی، سماجی، اقتصادی اور مذہبی حالات پر بھی اچھی روشنی پڑتی ہے اور خود اُن کا طریقِ اصلاح و تربیت اور فکر و بصیرت اُجاگر ہوتی ہے۔ انہوں نے اپنے آپ کو اس کتاب میں فروعی اختلافات میں الجھنے سے کمال بالغ نظری سے بچایا ہے، خود وہ فروعات میں امام شافعیؒ کے مقلد تھے مگر تبلیغ عام مزاج اور حالات کے مطابق کرتے تھے۔ برصغیر میں انہوں نے حنفی مسلک ہی کے مطابق تبلیغ و تربیت کی، یہی وجہ ہے کہ حنفیوں میں بھی حد سے زیادہ مقبول ہوئے اور علماء احناف نے بھی اُن کی کتابوں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ اعتنا کیا ہے۔ قاضی نوراللہ شوستری نے ذخیرۃ الملوک ہی کی روشنی میں شیخ ہمدانیؒ کو شیعہ ثابت کرنے کی کوشش کی مگر کتاب کا ایک ایک لفظ اس کوشش کو فضول اور بے مقصد ثابت کرتا ہے۔ وہ اس کتاب میں جگہ جگہ حکمرانوں کو خلفائے راشدین کی پیروی کرنے پر زور دیتے ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے عزت و احترام کے ساتھ احادیث روایت کرتے ہیں، اور شیعی سبائیت کی کوئی اصطلاح تک استعمال نہیں کرتے۔

۲- الاوراد یہ یہ رسالہ اوراد واذکار کے فضائل، خصائص اور آداب سے متعلق ہے اور ایک مقدمہ اور تین ابواب پر مشتمل ہے باب اوّل : فی فضیلۃ الاوراد ۔ باب دوّم : فی بیان احتیاج الطالب الیھا ۔ باب سوّم : فی توزیع الاوقات فی وظائف الاوراد والاذکار ۔

مصنّف نے یہ تینوں ابواب قرآنی آیات کے بعد احادیث وآثار سے مؤیّد کیے ہیں۔ احادیث درج ذیل اصحاب کرام رض سے مروی ہیں:
حضرت ثوبان، حضرت مغیرۃ بن شعبہ، حضرت ابوہریرۃ، حضرت عبداللہ بن زبیر، حضرت ابو امامہ، حضرت انس، حضرت عبداللہ بن بشیر، حضرت ضبرہ، حضرت ابو ایوب انصاری، حضرت ابوموسیٰ اشعری، حضرت ابوسعید خدری، حضرت عائشہ رضوان اللہ تعالیٰ عنہما اجمعین۔

باب اوّل میں اوراد واذکار کے فضائل و برکات بیان کیے گئے ہیں، جبکہ باب دوّم میں اخلاق کی پاکیزگی اور قلب و فکر کی اصلاح اور تذکیہ یقینی بنانے کے لئے اوراد واذکار کی اہمیت واضح کی گئی ہے۔ آخری باب ذکر بالجہر اور ذکر بالسّر کے آداب و فضائل سے متعلق ہے۔ مؤلف نے دونوں طرح کے اذکار احادیث سے مؤیّد کرکے جائز ثابت کیے ہیں اور اپنی لطیف تشریح سے اپنی فقاہت کا بھی ثبوت دیا ہے۔ مثلاً ذکر بالسّر کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اس کی فضیلت میں حسب ذیل احادیث مروی ہیں:

۱۔ "قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الجاھر بالقرآن

کالجاہر بالصدقۃ والمسرّ بالقرآن کالمسرّ بالصدقۃ"۔
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اونچی آواز سے قرآن پڑھنے والے کی مثال اس شخص کی ہے جو اعلانیہ خیرات کرتا ہے اور پست آواز سے قرآن پڑھنے والا پوشیدگی میں خیرات کرنیوالے شخص کے مانند ہوتا ہے۔

۲۔ "فضل قراءۃ السرّ علی العلانیۃ کفضل صدقۃ السرّ علی صدقۃ العلانیۃ" اونچی آواز سے پڑھنے پر خاموشی کے ساتھ پڑھنے کی فضیلت اسی طرح ہے جس طرح خاموش خیرات کرنے کو کھلے عام خیرات کرنے پر ہے۔

آگے مصنف لکھتے ہیں کہ قرآن سے بھی ذکر بالسرّ کی فضیلت پر روشنی پڑتی ہے۔ تاہم اس سے ذکر بالجہر کی افادیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا ہے۔ وہ مزید لکھتے ہیں کہ مذکورہ دو احادیث سے صرف اتنا ثابت ہوتا ہے کہ بالجہر احسن اور بالسر حسن ہے۔ جائز اور ناجائز والی بات نہیں ہے۔ جس نے ایسا سمجھا،

"فقد کابر العقل وخالف النقل۔"	اس نے عقل سلیم کا انکار کیا اور قرآن وحدیث کی مخالفت کی

رہے وہ نقول جن سے بجہر ذکر کرنا مستحب ثابت ہوتا ہے تو ان میں سے چند درج ذیل ہے۔

"انّ رسول اللہ صلی اللہ وسلّم سمع جماعۃ من اصحابہ یجہرون القراءۃ	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ اپنے اصحاب میں سے ایک جماعت کو رات میں اونچی آواز

"فی اللیل فصوب ذلك"

سے کچھ پڑھتے سنا آپؐ نے اسے درست قرار دیا۔

۲۔ "رُوِیَ انہ سمع ذات لیلۃ قراءۃ ابن مسعودؓ معہ ابوبکرؓ و عمرؓ فوقفوا طویلاً ثم قال من اراد ان یقرأ القرآن کما انزل فلیقرأ علی قراءۃ بن ام عبد۔"

روایت کی جاتی ہے کہ آپؐ نے ایک مرتبہ رات میں عبداللہ بن مسعودؓ کو قرآن پڑھتے سنا ان کے ساتھ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ بھی تھے۔ یہ تینوں دیر تک بیٹھے رہے۔ پھر آپؐ نے فرمایا جو شخص قرآن کو اسی طرح پڑھنا چاہتا ہے جیسا کہ اسے اتارا گیا ہے تو اسے ابن ام عبد (عبداللہ بن مسعودؓ) کی طرح پڑھنا چاہئے۔

ایسی ہی چند اور احادیثِ مبارکہ نقل کرنے کے بعد شیخ ہمدانیؒ نے ذکر بالجہر پر عقلی طور بحث کی ہے اور اس کے دس فائدے گنے ہیں جو مختصراً یوں ہیں:

(۱) ذکر بالجہر میں زیادہ مشقت اٹھانا پڑتی ہے اور اجر بھی مشقت کی کمیت کے مطابق ملتا ہے۔ (۲) ذکر بالجہر سے قاری خوابِ غفلت سے بیدار ہوتا ہے۔ (۳) ذکر کی حقیقت اور مقصد کی طرف کان متوجہ ہوتے ہیں۔ (۴) اس سے نیند اور کاہلی دور ہو جاتی ہے (۵) ذاکر شادمانی اور انبساط محسوس کرتا ہے اور سستی و کہالت سے

پہنچ جاتا ہے۔ (۶) ذکرِ جہر سے دوسرے بھی مستفید ہوتے ہیں، اس لئے خیر لازم سے خیر متعدی ہی بہتر ہے۔ (۷) اس سے دوسرے خوابیدہ اشخاص کے بیدار ہونے اور عبادتِ خدا کی طرف مائل کرنے کی امید کی جاتی ہے۔ (۸) جہر کے سرور و سرود سے ایک غافل اور متحجر بھی عبادت کی طرف راغب ہوتا ہے۔ (۹) اس سے قاری کا دل نرم پڑتا ہے جس سے اس کی عاجزی اور نیستی میں اضافہ ہوتا ہے۔ (۱۰) بجہر ذکر سے خوش الحانی اور ترنم و غنائیت کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور قرأت میں خوش الحانی سنّت ہے، جیسا کہ حدیث میں آیا ہے:

"لیس منّا من لم یتغنّ بالقرآن۔"

وہ شخص ہم سے نہیں ہے جو قرآن کی خوش الحانی سے تلاوت نہ کرے۔ (۱)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں فرمایا:

"لقد اوتی مزمارا من مزامیر داؤد"

انہیں حضرت داؤدؑ کے گیتوں والی دعاؤں میں سے کچھ گیت عطا کئے گئے ہیں۔

غرض یہ رسالہ بلحاظ کہتر مگر بقیمت انتہائی بہتر و بزرگ تر ہے۔

چہل حدیث حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلویؒ نے

---

(۱): راقم کے پیش نظر ریسرچ لائبریری سرینگر کے شعبۂ مخطوطات عربی و فارسی کے نسخے ہیں۔

حدیث کی کتابیں چھ قسموں میں تقسیم کی ہیں۔ یعنی: جوامع، مسانید، معاجم، اجزاء، رسائل اور اربعینیات[1]۔ ان میں چھٹی قسم یعنی اربعینیات کے انتخاب و ترتیب میں محدثین کے علاوہ صوفیاء اور فقہاء نے بھی دلچسپی لی ہے۔ مشہور اربعینیات میں حضرت عبداللہ بن مبارک رض، شیخ محی الدین نووی اور محدث ملا علی قاری کی کافی مشہور ہیں۔ ہندوستان کے کئی سرکردہ علماء نے بھی اربعینیات ترتیب دیئے ہیں جن میں حضرت شیخ عبدالحق صاحب محدث اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے نام قابل ذکر ہیں۔ تاہم ہندوستان میں حضرت میر سید علی ہمدانی رح کی اربعین (چہل حدیث) کو بھی ماضی قریب میں بڑی شہرت حاصل تھی۔ مولانا سید عبدالحی صاحب حسنی مرحوم لکھتے ہیں:

"اما الاربعینات فهی ایضاً کثیرة اشهرها الاربعین للسید علی بن الشهاب الحسنی الهمدانی المتصل الی انس بن مالک رضی الله عنه"[2]

اربعینات میں سب سے مشہور سید علی بن الشہاب الحسنی الہمدانی کی اربعین ہے جس کی سند کا سلسلہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مل جاتا ہے۔

---

[1] تفصیل کے لئے ان کی کتاب "بستان المحدثین" ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

[2] الثقافة الاسلامیة فی الهند، مولانا عبدالحی حسنی، المجمع العلمی العربی دمشق ۱۹۵۸ء ص ۱۰۸۔

۴۱۔ **السبعین فی فضائل امیر المومنین** یہ رسالہ حضرت میر سید علی ہمدانی رحمتہ اللہ علیہ نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ تعالی عنہ اور اہل بیت رضی کے فضائل و محامد میں لکھا ہے اور اس میں ستر "احادیث" جمع کئے ہیں۔ ڈاکٹر محمد اسحاق لکھتے ہیں کہ مؤلف نے یہ سارے احادیث فردوس الدیلمی کی مسند سے لئے ہیں جو محدثین کے نزدیک قابل اعتبار نہیں ہے۔[1]

ان چار تالیفات کے سوا بھی حضرت شیخ ہمدانی رح نے اپنی بیسوں کتب و رسائل میں احادیث کا اچھا خاصا ذخیرہ چھوڑا ہے جن سے اہل علم نے استفادہ کیا ہے۔ تاہم یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ حضرت شیخ رح نے علم حدیث کو ایک مستقل فن کے طور پر نہیں اپنایا ہے وہ مختلف دینی اور عقلی علوم کے عالم تھے مگر تصوف اور باطنی علوم کے فاضل تھے۔

حضرت میر سید علی ہمدانی رح کے بعد حضرت شیخ ہمدانی رح جب کشمیر وارد ہوئے تو اپنے ساتھ علماء کی ایک کثیر تعداد بھی اپنے ساتھ لائی تھی پھر کچھ مدت بعد ان کے فرزند میر سید محمد ہمدانی رح بھی اکابر علماء کی ایک اور بڑی جماعت کے ساتھ یہاں تشریف لائے۔ ان سارے بزرگوں نے کشمیر میں مساجد و مدارس کا جال بچھایا جن میں تعلیم و تدریس کا سلسلہ شروع ہوا۔ ان علماء میں کچھ بلند پایہ محدثین بھی تھے۔ مثلاً ایک عالم محمد الشامی تھے جن کے بارے میں شیخ عبدالوہاب نوری لکھتے ہیں:

---

[1]: ڈاکٹر محمد اسحق، ص ۷۰۔ ۷۱

"از علماء و اولیاء عصر بود، در علوم عربیہ از فقہ و حدیث دستی تمام داشت۔"[۱]	اپنے وقت کے اولیاء اور علماء میں سے تھے۔ عربی علوم جیسے فقہ و حدیث میں مہارت رکھتے تھے۔

انہیں میں حضرت سید جمال الدین محدّث بھی تھے وہ رشتہ کے لحاظ سے حضرت شیخ ہمدانیؒ کے خال تھے۔ سلطان قطب الدین کے التماس پر کشمیر تشریف لائے اور فتحکدل کے متصل "عُروۃُ الوثقیٰ" کے نام سے ایک دارالعلوم قائم کیا جہاں حدیث کا درس خود دیتے تھے علم حدیث میں اتنی بصیرت رکھتے تھے کہ محدّث کے نام سے معروف تھے[۲] اسی طرح میر سید محمد ہمدانیؒ کے ایک ساتھی سید محمد خاوریؒ کے بارے میں، شیخ عبدالوہابؒ لکھتے ہیں:

"در علوم فقہ و تفسیر و احادیث وحید الدہر و عدیم المثال بود"[۳]	فقہ، تفسیر اور حدیث میں بے مثال اور یکتائے روزگار تھے۔

مولانا حسین نامی اور احادیث رتنیہ حضرت میر محمد ہمدانیؒ ہی کے ساتھیوں میں مولانا حسین نامی بھی کشمیر وارد ہوئے تھے کشمیر کی تاریخ و تراجم کی کتابوں میں قاضی حسین شیرازی کے نام سے مذکور ہیں، شیراز میں کچھ مدّت تک قاضی بھی رہ چکے تھے۔ آخر کار میر سید محمد ہمدانیؒ کے ساتھ کشمیر آئے اور یہاں سلطان سکندر نے ان کی بڑی عزت کی اور کئی گاؤں بطور جاگیر عطا کئے۔ ان کے علم

۱: فتوحات کبرویہ (قلمی)۔ ۲: تاریخ سید علی (قلمی)۔
۳: فتوحات کبرویہ (قلمی)۔

فضل بالخصوص علم حدیث میں بصیرت کے بارے میں شیخ عبدالوہاب نوری لکھتے ہیں:

"در علومِ فقہ وحدیث نظیر و ہمتا نداشت و سندِ حدیث باسنادِ معتبرہ در خزانۂ حافظہ داشت۔"[1]

انہوں نے اُس وقت کے مشہور ہندو مکّار بابا رتن ہندی کی حدیثیں جمع کی تھیں[2]۔

بابا رتن پنجاب کے مشہور شہر بھٹنڈا کا رہنے والا ایک سادھو نما مذہبی جعلساز شخص تھا۔ وہ اگرچہ ساتویں صدی ہجری — یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے چھ سو سال بعد — پیدا ہوا تھا، تاہم اس نے اس بات کا دعوی کیا کہ اس نے آپؐ کو دیکھا، تین بار حجاز میں ملاقات سے مشرف ہوا اور اسلام قبول کیا۔

علامہ شمس الدین ذہبی (م ۷۴۸ھ) کے عہد تک اس شخص کا کہیں کوئی تذکرہ نہیں ملتا ہے۔ علامہ ذہبیؒ نے ہی سب سے پہلے "تجرید" میں اس کے حالات لکھے اور باباجی کو کذّاب اور افترا پرداز کہا۔ اس کے بعد علامہ موصوف نے اپنی دوسری کتاب "میزان الاعتدال" میں بھی اس کی تکذیب کی[4]۔ آگے حافظ

---

[1]: انتخاب نیر دیہ، ترجمہ مولانا حمیلون ناحمی

[2]: تاریخ کشمیر، ملک حیدر (قلمی)

[3]: نزھۃ الخواطر وبہجۃ المسامع والنواظر، ج ۱، ص ۱۴۷

[4]: میزان الاعتدال، ج ۱، ص ۲۹۹، مطبوعہ لکھنو۔

ابن حجر عسقلانی[1] اور علامہ ابن اثیر جزری[2] نے بھی اس کے دجل و فریب کا پردہ چاک کیا۔

مولانا حسین نامی کشمیر تشریف لائے تو یہ باباجی کا زمانہ تھا، آثار و قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ بابا نے اپنے دعوے سے مسلمانوں میں ایک بڑے فتنے کا بیج بو دیا ہوگا۔ پنجاب ہمیشہ سے اس قسم کے بیجوں کے لئے زرخیز رہا ہے۔ باباجی نے بہت سی خود ساختہ باتوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرکے مشتہر کیا جس طرح ہمارے اس دور میں اسی خطے سے مرزا غلام احمد قادیانی نے نبوّت کا جھوٹا دعویٰ کرکے اپنے وسوسوں اور سیاسی حیلوں کو وحی آسمانی کے نام سے شہرت دے دی۔ مولانا حسین نامی نے باباجی کے ان نام نہاد احادیث کو "احادیث رتنیہ" کے نام سے جمع کرکے مسلمانوں کو اس کی فریب کاری سے خبردار کیا تھا انہوں نے اس مجموعے کو حضرت میر سید محمد ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ کو بھی دکھایا تھا۔[3] ممکن ہے انہی کے ایماء پر انہوں نے یہ کام انجام دیا ہو۔ اگرچہ یہ رسالہ اب نایاب ہے مگر اس زمانے میں یہ رسالہ لکھ کر مرتب نے بڑی اصلاحی خدمت انجام دی تھی۔

۱: الاصابہ فی تمییز الصحابۃ، ابن حجر، ج ۲، ص ۲۲۵ - ۲۳۰۔

۲: اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ، ابن اثیر جزری، ج ۲، ص ۲۴۶ اور Broclemann Supplement, Vol II, P625-26

۳: تاریخ حسن، ج ۲، ص ۷۶، سرینگر ۱۹۶۰ء۔ مؤرخ حیدر ملک کی تحقیق کے مطابق رسالے کا نام "احادیث رتنیہ" تھا اور مرتب نے اسے میر سید علی ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ کو دکھایا تھا۔ مگر دونوں باتیں خلاف تحقیق ہیں، یا راقم کے سامنے تاریخ ملک حیدر کا جو نسخہ ہے ممکن ہے کہ اس کے کاتب ہی سے سہو ہوا ہو۔

اسی رسالے نے محدثین بالخصوص ائمۂ جرح و تعدیل کو باباجی کی جعلی حدیثوں کی قلعی کھول دینے کی طرف متوجہ کیا تھا اور مسلمان اس فتنہ سے محفوظ رہے تھے۔

مولانا حسین کا مقبرہ محلہ نربد ستان (فتح کدل سرینگر) میں آج بھی موجود ہے اور مقبرہ "قاضی ولی" کے نام سے مشہور ہے۔

عہد مغلیہ | شاہمیری سلاطین کے طویل دورِ حکومت میں ہمیں مذکورہ بالا کتابوں کے سوا کسی دوسری کتاب کا سراغ نہیں ملتا ہے۔ جس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ کشمیر کا ماحول تصنیف و تالیف یا شرح و تفسیر کے لئے سازگار نہیں تھا۔ اکثر و بیشتر لوگ نومسلم تھے اور ابھی ابتدائی اصلاح و تعلیم کے محتاج تھے جہاں علمی مباحث اور مسائل سمجھنے اور سمجھانے کی ضرورت پڑتی تھی تو علماء و مبلغین درسگاہوں اور تربیتی خانقاہوں میں اس کو پورا کرتے تھے۔

۱۵۸۶ء میں مغلوں نے کشمیر کو مملکتِ ہندوستان میں شامل کیا اور یہیں سے کشمیر میں جملہ اسلامی علوم و فنون بالخصوص علم حدیث کی سرگرمی شروع ہوئی۔ یہ دور ہندوستانی باشندوں بالخصوص مسلمانوں، جو اقلیت میں ہونے کے باوجود صاحبِ اقتدار اور سیاہ و سپید کے مالک تھے، کے لئے خوشحالی اور فارغ البالی کا دور تھا۔ اور یہی چیز ابن خلدون اور ڈاکٹر احمد امین کے مطابق علمی اور فکری ترقی کا ضامن ہوتی ہے۔ اب کشمیر کے مسلمان علوم کی تحصیل کے لئے وسیع و عریض ہندوستان آنے لگے اور آگے یہاں سے

بیرونی اسلامی ممالک جانے لگے۔ ان میں سے بعض علماء حصولِ علم کے بعد اپنے وطن واپس لوٹے اور یہاں اس کی نشر و اشاعت کرتے تھے اور کچھ ہمیشہ کے لئے ہجرت کر کے مختلف ممالک میں ہی مستقل اقامت کرتے تھے۔ جن علماء نے وطن لوٹ کر علم کی خدمت کا بیڑا اُٹھایا ان میں کچھ بزرگ حدیث و رجال کے سربرآوردہ علماء تھے۔ مشہور کشمیری محدث علامہ داؤد مشکواتی کو حدیث کی مشہور و متداول کتاب "مشکوٰۃ المصابیح" زبانی یاد تھی۔[1] مولانا محمد سعید گندسو (المتوفی ۱۲۰۸ھ) بخاری بند سے مشہور تھے انہیں صحیح بخاری ازبر تھی۔[2] شیخ محمد تقی (المتوفی ۱۱۸۵ھ) نے قاضی عیاض مالکی کی "شفا" اور محدث حسن صغانی کی "مشارق الانوار" فارسی میں نظم کی تھی اسی طرح علامہ ابن حجر مکیؒ، شیخ ابو الحسن سندھی، شیخ عبد الحق محدث دہلوی، علامہ علی قاری ہرویؒ، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، شاہ عبد العزیز صاحب وغیرہم اکابرِ محدثین کے علمی فیوض ان کے کشمیری شاگردوں کے ذریعہ کشمیر بھی منتقل ہوئے اور یہاں کے تشنگانِ علم عرصۂ دراز تک ان سے متمتع اور مستفیض ہوئے۔

اگرچہ محدثین کشمیر کی فہرست طویل ہے اور اس طرح سب کا تذکرہ کرنا ناممکن ہے تاہم کچھ ممتاز علماء کا یہاں تعارف پیش کیا جاتا ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر یہ باب ادھورا رہنے کا احتمال ہے۔

---

[1]: تاریخ اعظمی، ص ۱۲۰، مطبوعہ لاہور۔
[2]: تاریخ حسن، ج ۳

شیخ یعقوب صرفی کشمیری

شیخ صرفی کے اسلاف کسی زمانے میں باہر سے آکر کشمیر وارد ہوئے تھے۔ اس خاندان کے ایک فرد میر بایزید نے سلطان زین العابدینؒ کے دربار میں رسائی حاصل کی، اور اپنے فضل و کمال سے "رئیس القوم" کا خطاب پایا۔ ان کا سلسلۂ نسب حضرت عاصم رضؓ بن حضرت عمر رضؓ پر پہنچتا ہے اس لئے عاصمی فاروقی بھی کہلاتے ہیں۔ آپ "گنائی" عرف سے بھی مشہور رہے اور یہ عرف اس زمانے میں بڑا معزز و محترم تھا اور صرف اصحاب علم و فضل کے لئے مخصوص تھا۔ مورخ محمد اعظم لکھتے ہیں:

"گنائی در عرف آں وقت نویسندہ را مے گفت"[1]

شیخ صرفی ۹۲۸ھ میں سرینگر میں پیدا ہوئے تھے اُن کے والد کا نام میر حسن تھا جو عالم بھی تھے اور عابد بھی۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد ہی سے حاصل کی۔ سات سال کی عمر میں قرآنِ حکیم حفظ کیا، پھر مزید تعلیم مولانا عبدالرحمان جامی کے شاگرد ملا آفی سے پائی۔ ملا آفی خورد سال طالبِ علم کی ذہانت و فطانت سے بڑے متاثر ہوئے اور اس کی وسیع النظری دیکھکر "صرفی" سے پکارنے لگے۔ حضرت صرفی کے قدیم اور مستند ترین سوانح نگار حضرت خواجہ حبیب اللہ نوشہریؒ لکھتے ہیں:

عاقبت آں محمد آنی کرنمود است جامیٔ ثانی
شیخ راگفت واسع النظرفی زاں تخلص نمراسز و صرفی[2]

---

[1] : تاریخ اعظمی، ص ۹۶ -
[2] : احوال و مقامات حضرت ایشاں (قلمی)

ان کے ایک اور استاد مولانا رضی تھے جن سے مختلف علوم کی تحصیل کی۔ شیخ نوشہری فرماتے ہیں:

نقل دارم کہ شیخ ما بعلوم — شدہ مشغول پیش آں مخدوم
کہ مسمیٰ بود باسم رضی — رضی اللہ عنہٗ بالمرضی [1]

تحصیل علم کے بعد شیخ صرفی زیارت بیت اللہ اور تربیت باطنی کے خاطر سفر کے لئے تیار ہوئے اور آگے دو مرتبہ کئی اہم اسلامی ممالک کی سیاحت کی۔ پہلی مرتبہ لاہور سے کابل، بدخشاں، بلخ، غور ہوتے ہوئے سمرقند گئے۔ یہاں شیخ کمال خوارزمی اور شیخ حسینی کی صحبت میں کچھ وقت گزارا اور فیوض حاصل کئے، اس کے بعد سیدھے کشمیر لوٹے۔ پھر کچھ مدت بعد دوبارہ حج کی نیت سے روانہ ہوئے۔ اس زمانے میں شیخ ابن حجر مکی کا درسِ حدیث مشہور تھا۔ شیخ صرفی درس میں شامل ہوئے اور سند حاصل کی۔ اس کے علاوہ شیخ محمد حسن شافعی سے فصوص الحکم اور شیخ عبدالعزیز سے ترمذی شریف کا درس لیا۔ شیخ نوشہری اپنے مرشد کی زبان سے لکھتے ہیں:

پیش آں شیخ دیں امام بشر — سند اندر حدیث ابن حجر
جامع ترمذی بکردم حل — پیش عبدالعزیز اعز ازل
حل نمودم ہم نکات فصوص — از حسن نام شیخ دیں بخصوص
ہم مشائخ دگر بسی دیدم — فیض ہائے زہر کسی دیدم [2]

واپسی پر ایران سے ہو آئے۔ یہاں شیعہ علمائے سے مناظرے بھی

---

[1] و [2]: احوال و مقامات حضرت ایشاں (قلمی)

گئے اور شیخ نے اپنے علم و فضل سے شاہ طہماسپ کو بھی متاثر کیا۔ اگرچہ دربارِ شاہی میں حاضری دینے کی کوئی نیت نہیں تھی، تاہم حالات ہی کچھ ایسے پیش آئے کہ خود بخود دربار میں پہنچ گئے:

صحبتِ شہ نبود مقصودم لیک راضی بایں قضا بودم[1]

مشہور ہے کہ دربار میں حدیث "انتَ منی بمنزلۃِ ھارون من موسیٰ الّا انہ لا نبیّ بعدی" زیرِ بحث تھی اور حضرت شیخ صرفی نے پوری جرأت اور اعتماد سے علمائے اہلِ سنت کی ترجمانی کی اور جو معنیٰ شیعہ علماء اسے پہناتے ہیں اُسے رد کر دیا۔ شاہ طہماسپ حضرت شیخ کے علم و فضل اور حق گوئی سے متاثر ہوا۔ وہ یہاں سے تبریز پھر بغداد سے ہوتے ہوئے روم گئے اور پھر روم سے سیدھا ہندوستان کی طرف رُخ کیا۔ وہ گجرات پہنچے اور کچھ وقت تک یہاں حدیث کا درس دیا۔

نقل دارم کہ شیخ در گجرات شدہ مشغول در حدیث و رُواۃ[1]

اس دوران شیخ سلیم چشتی سے تین بار ملاقات کی۔ خود فرماتے تھے کہ اس زمانے میں ہندوستان صلحاء اور علماء سے معمور تھا۔ ملتان، ٹھٹھہ، لاہور، پانی پت، اور تھانیسر مرکزِ علم و ارشاد تھے۔

ہیچ شہرے نماند نادیدہ دیدہ مردم نکو بسی دیدہ
ہند و ملتان و تتہ و لاہور پانپت، و تانسر پُر از نور[1]

جب لاہور پہنچے تو قاضی صدر الدین جلندری (جالندھری) نے جو بڑے بزرگوں میں سے تھے، خواب میں حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ

---

[1] تاسہ: احوال و مقامات حضرت ایشاں (قلمی)۔

منتظر ہی کو دیکھا۔ فرمایا "فوراً نکل جاؤ اور کشمیر کے بادشاہ کا استقبال کرو۔"[۱]

گفت اے صدرِ دین برو فی الحال۔ شاہِ کشمیر را باستقبال
قاضی صاحب کہتے ہیں کہ جب میں بیدار ہوا تو پریشان ہوا۔ میں نے تاجروں سے دریافت کیا، کہ کیا کوئی بزرگ کشمیر سے آیا ہے؟ انہوں نے کہا ہاں! میر یعقوب نامی ایک شخص آیا تھا:

گفتہ اند آری آمد یک میر یعقوب نام او بے شک
میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا، علامات سے ہی مطلوب پایا اور فوراً بیعت کی۔[۱]

یہ زمانہ مسلمانانِ کشمیر کی انتہائی بدقسمتی کا دور تھا۔ شیعہ ملک برسرِ اقتدار تھے اور سُنی مسلمان اُن کے معتوب بنے ہوئے تھے۔ ملک میں طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا۔ نظم و نسق کے ذمہ دار راہزن اور جیب کترے تھے اور تو اور خود حکمرانِ کشمیر یعقوب خان کو اُس کی بھنگ نوشی نے دل و دماغ کا ستیاناس کر دیا تھا۔ اکثر علمائے دین اور مشائخ کبار ایک ایک کر کے ہجرت کر رہے تھے اور جو سفر کے قابل نہیں تھے وہ روپوش تھے۔ کچھ ممتاز اور سرکردہ علماء زہر دیکر مارے گئے، اس اُتھل پتھل اور عام خلفشار کی حالت میں کچھ مقتدر علماء نے اکبرِ اعظم کو، جو کافی وقت سے کشمیر کو ہندوستان کا جزو بنانے کے لئے تیاری کر رہا تھا، تسخیرِ کشمیر کے مشن میں اپنے تعاون

---

[۱]: احوال و مقاماتِ حضرت ایشاں (قلمی)۔

کی پیش کش کی۔ حضرت شیخ یعقوب صرفی ؒ ان میں ایک تھے۔ کشمیر نے جغرافیہ عالم پر اپنی سیاسی انفرادیت کھو ڈالی تاہم یہاں فوراً امن و اطمینان کی فضا قائم ہوئی، اور بازارِ علم کو تقریباً پچاس سال بعد پھر رونق لگ گئی۔ حضرت شیخؒ نے خود بھی اس رونق کو یقینی بنانے میں غیر معمولی حصہ ادا کیا اور اسی شغل و انہماک میں ۱۳ ذوالقعدہ ۱۰۰۳ھ میں انتقال کیا۔

شیخ یعقوب صرفی ؒ، علامہ محمد انور شاہ کشمیری ؒ کو مستثنیٰ کر کے، صحیح معنوں میں کشمیر الاصل علماء کے پیشوا کہلانے کا حق رکھتے ہیں۔ وہ یقیناً مجمع الصفات بزرگ اور جامع الکمالات عالمِ دین تھے، وہ بیک وقت محدّث، مفسر، فقیہہ، صوفی صافی، مبلغ اور مدرس تھے۔ خود انہیں بھی اپنے کمالات کا احساس تھا۔ ایک جگہ اپنے فرزند سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں،

بے تامل بگویمت سخنے ۔۔۔۔ در دو عالم کجا رسد بچو منے[1]

سلاطینِ وقت کے ہاں انہیں تقرب حاصل تھا مگر انہوں نے ذاتی طور پر زہد و استغنا کی زندگی گزاری۔ اُن کی علمی عظمت و جلالت کا واضح ثبوت یہ ہے کہ حضرت مجدد الفِ ثانی ؒ ان کے شاگرد تھے۔ فیضی اور عبدالقادر بدایونی نے اُن کے علم و فضل کا اعتراف کیا ہے۔ حضرت شیخؒ نے اپنے پیچھے مریدوں اور شاگردوں کی ایک بڑی جماعت چھوڑ دی ہے جس نے اپنے فاضل مرشد کے بعد اُن کے علمی و باطنی فیوض و افادات کو جاری و ساری رکھا۔ جن ممتاز کشمیری بزرگوں

---

[1] : دیوانِ صرفی، مرتبہ سید حبیب اللہ کاملی مرحوم، مقدمہ ص ۲ مطبوعہ سرینگر

نے ان سے فیض حاصل کیا، ان میں خواجہ حبیب اللہ نوشہری، مولانا حسن آفاقی اور شاہ قاسم حقانی کے نام قابلِ ذکر ہیں:

نخل جانم بہار از تو رسید　　باغ من میوہ دار از تو رسید

نامِ من زندہ مے کند نلعت　　کامِ من کام یابد از جاہت [۱]

حضرت شیخ صرفی نے نظم و نثر میں کتب و رسائل کا ایک بڑا ذخیرہ چھوڑا ہے جو مختلف مذہبی اور ادبی موضوعات سے تعلق رکھتا ہے اور عربی و فارسی دونوں زبانوں میں لکھا ہے ان میں تین کتابوں کا تعلق حدیث سے ہے جن کا اجمالی تعارف پیش کیا جاتا ہے:

شرح صحیح بخاری ہندوستان کے جملہ تذکرہ نگاروں نے اس شرح کا ذکر کیا ہے۔ عمر رضا کحالہ نے اس شرح کا ذکر کرتے ہوئے شیخ صرفی کے لئے محدث، مفسر، مورخ اور بعض علوم کا شناسا لکھا ہے [۲]۔ آج یہ شرح نایاب ہے۔ جن علماء نے اس شرح کا مطالعہ کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ شارح نے ہر حدیث ترجمۃ الباب میں محدثانہ طرز اختیار کیا ہے شرح میں روحانی علوم سے بھی مدد حاصل کی ہے۔

شرح ثلاثیات بخاری اسناد کے اقسام میں سندِ عالی کو محدثین کے نزدیک بڑی اہمیت اور خصوصیت ہے۔ صحیح بخاری میں کچھ ایسی روایات بھی ہیں جنکی سند میں صرف تین راوی ہیں اور یہی ثلاثیات بخاری سے مشہور اور ممتاز ہیں۔ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کی تحقیق کے مطابق ان کی تعداد بائیس ہے اور ان میں

---

[۱] : احوال و مقامات حضرت ایشان (قلمی) — [۲] معجم المؤلفین، ج ۱۳، ص ۲۴۷، مطبعۃ الترقی دمشق ۱۳۸۱ھ/۱۹۶۱ء۔

بعض ثلاثیات ایسی ہیں جن کے شیوخ حنفی ہیں جبکہ دو کے متعلق تحقیق نہیں ہے[۱]۔ انہی ممتاز ترین روایات کی حضرت شیخ یعقوب صرفی کشمیری نے شرح لکھی ہے جو محدثانہ طرز کی ہے[۲]۔

اربعین | حضرت شیخ کے تذکرہ نگاروں کے مطابق انہوں نے دو اربعین لکھے تھے، ایک حضرت علیؓ کے فضائل پر مشتمل ہے جبکہ دوسرے اربعین میں اہلِ بیت کے فضائل و محامد پر مشتمل احادیث جمع کئے ہیں۔ مؤخر الذکر اربعین کو ۹۷۲ھ میں مکمل کیا ہے اور خود اس قطعہ سے دونوں اربعین کی تاریخ اخذ کی ہے۔

در مدحِ اہلِ بیت بود ایں دو چہل حدیث
فد اطبق الثقات علی کل ما رویت
تو خوب صرفی از خردِ خوردہ دل شنید
تاریخ ایں رسالہ احادیثِ اہلِ بیت[۳]

حاجی محمد الکشمیری | آپ شیخ یعقوب صرفیؒ کے ہمعصر اور خواجہ تاشی تھے۔ اگرچہ متعدد کتابوں کے مصنف اور سرکردہ عالم وقت تھے تاہم مؤرخین کشمیر ان کے بارے میں خاموش ہیں۔ "مہر جہانتاب" کے مطابق آپ کے اسلاف میر سید علی ہمدانیؒ کے ساتھ ہمدان سے کشمیر وارد ہوئے تھے۔ آپ کی ولادت کشمیر میں ہوئی تھی اور یہیں ابتدائی نشوونما بھی پائی۔ تحصیل علم کے لئے دہلی گئے اور علماء وقت سے استفادہ کیا پھر حج کے لئے حرمین گئے، جہاں سرکردہ محدثین

۱؎ : لامع الدراری، مقدمہ، ص ۳۰ –
۲؎ : حالاتِ حضرت صرفی، مفتی محمد شاہ سعادت مرحوم، ص ۷ (حاشیہ) ۳؎ ایضاً

بالخصوص علامہ ابن حجر مکی سے تدریس حدیث کی سند حاصل کی علاوہ ازیں شیخ محمد باقی نقشبندی سے روحانی فیوض حاصل کیے۔ بالآخر کشمیر لوٹے اور تبلیغ و تدریس اور تصنیفی کاموں میں باقی زندگی گزاری۔ ۱۹ ؍صفر ۱۰۰۶ھ جمعرات کے دن انتقال کیا۔[۱]

حاجی محمد فقہ اور حدیث کے جید عالم تھے۔ مولانا عبدالحی حسنی نے ان کے بارے میں لکھا ہے "احد علماء المبرزین فی الفقہ والحدیث"[۲] یعنی فقہ اور حدیث کے مقتدر علماء میں سے ایک تھے۔ انہوں نے کم و بیش اٹھارہ کتابیں لکھی ہیں جن میں چار کا تعلق حدیث سے ہے۔

۱۔ شرح شمائل النبی ؐ شیخ کی یہ کتاب امام ابوعیسیٰ ترمذی کی مشہور و مقبول تالیف سنن ترمذی کے اس حصے کی شرح ہے جس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عادات اور خصائل مقدسہ کا ذکر ہے اور یہ حصہ عموماً "شمائل ترمذی" کے نام سے مشہور ہے۔ حاجی محمد نے یہ شرح خانقاہ معلیٰ سری نگر میں جمادی الاولیٰ ۹۸۸ھ مطابق جون ۱۵۸۰ء میں مکمل کی تھی۔ اس کے متعدد نسخے آج بھی مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں ایک نسخہ کتب خانہ ندوۃ العلماء میں[۳] دوسرا بانکی پور میں زیر نمبر ۱۱۸۳[۴]

---

[۱]: تذکرۂ علمائے ہند، رحمان علی مرحوم طبع دوم لکھنؤ ۱۹۱۴ء، ص ۲۰۶؛ ڈاکٹر محمد اسحٰق، ص ۱۳۴-۱۳۵۔

[۲]: نزھۃ الخواطر، مولانا عبدالحی حسنی، ج ۵، ص ۱۲۹-۳۰؛ ڈاکٹر محمد اسحٰق، ص ۲۲۵

[۳]: Catalogue of Arabic & Persian Manuscripts, Bankipara. I

اور تیسرا نسخہ پروفیسر محمود خان شیرانی کے کتاب خانے میں موجود ہے[1] پروفیسر شیرانی کا ذخیرۂ کتب اب پنجاب یونیورسٹی لاہور منتقل ہوگیا ہے۔

شرح حصن حصین | یہ کتاب الجزری کی مقبول کتاب "حصن حصین" کی فارسی شرح ہے۔ حاجی محمد کشمیری نے اسے بھی خانقاہ معلی (سرینگر) میں مکمل کیا ہے۔ اس کا ایک نسخہ کتب خانہ بانکی پور میں زیر نمبر ۱۱۹ موجود ہے۔ اس کے آخر میں مصنف کا نام اس طرح درج ہے۔

"حاجی محمد الکشمیری ثم المکی ثم المدنی ثم الکشمیری"

مذکورہ بالا دو کتابوں کے علاوہ ان کی مزید دو ایسی کتابوں کا پتہ بھی ملتا ہے[2] جن کا اب صرف نام باقی رہ گیا ہے۔

۱۔ شرح مشارق الانوار ۲۔ خلاصۃ الجامعۃ فی جامع الحدیث

محدث جوہر نانت | مولانا جوہر کشمیر کے مقتدر عالم اور مدرس تھے۔ شیخ عبدالوہاب نوری نے ان کا تذکرہ ان الفاظ میں درج کیا ہے:

"وحید الدھر فرید العصر اخون ملا جوھر نانت علامہ است کہ در سلک حدیث خاتم المحدثین بود"[3]

آپ بھی شیخ صرفی اور حاجی محمد کے معاصر اور استاد بھائی تھے

---

[1] : فہرست مخطوطات شیرانی مرتبہ ڈاکٹر محمد بشیر حسین، مجلہ "اردو تحقیقات پاکستان" بابت جون ۱۹۶۷ء

[2] : جواہر انتاب (قلمی)۔ [3] : فتحات کبرویہ (قلمی)۔

اس عہد کے ممتاز روحانی بزرگ سلطان العارفین حضرت شیخ حمزہ کشمیری قدس اللہ سرہٗ کے ساتھ بھی آپ کے عقیدتمندانہ تعلقات تھے۔[۱] یہ انہی کی صحبت کا اثر تھا کہ مدرسۂ سلطان قطب الدین کے شیخ الحدیث اور صدرِ مدرس ہونے کے باوجود پشم کی تجارت سے پیٹ پالتے تھے۔[۲] باقاعدہ روحانی تربیت حضرت شیخ حمزہؒ کے مریدِ رشید علامہ داؤد خاکیؒ سے حاصل کی۔ مولانا جوہر نے اگرچہ جہانگیر کی ولیعہدی سے پہلے نشوونما پائی تھی، مگر علمی ترقی کے منازل جہانگیر کے عہد میں ہی طے کئے۔ ابتدائی تعلیم اس وقت کی مشہور دینی درسگاہ مدرسۂ سلطان قطب الدین میں حاصل کی[۳] جس کے وہ بالآخر صدرِ مدرس بھی ہوئے۔ علم حدیث کے ساتھ بے حد شغف رکھتے تھے اور اس میں رسوخ ومہارت حاصل کرنے کے لئے حرمین بھی گئے جہاں فریضۂ حج ادا کرنے کے ساتھ ساتھ علامہ ابن حجر مکی اور ملا علی قاری کے درسِ حدیث میں شامل ہوئے۔ دونوں بزرگوں سے سندِ حدیث حاصل کرنے کے بعد وطن واپس لوٹے اور پوری یکسوئی کے ساتھ درس وافادہ اور فکر و ذکر میں مشغول ہوئے۔ مورخ محمد اعظم دیدہ مری لکھتے ہیں :

"بعد ادای حج اسلام تحصیلِ — فریضۂ حج ادا کرنے کے بعد مکہ

---

[۱] : تاریخ حسن، ج ۳، ص ۲۱۸۔

[۲] : تاریخ اعظمی، ص ۱۰۴، لاہور ۱۳۰۳ھ۔

[۳] : فتوحات کبرویہ (قلمی)۔ [۳]: Koshur : Dr. G.M.D. Sufi: Vol. 2, Page 346

سند و اجازتِ حدیث از فحول و اکابرِ علماء و محدثین مکہ معظمہ کردہ و خدمت دریافت۔ بلکہ بصحبتِ حضرت شیخ ابن حجر مکی ہم رسید و اجازتِ سندِ معنعن حاصل ساخت۔"[1]	معظمہ کے ممتاز ترین علماء اور محدثین سے سند اور اجازت حاصل کی۔ یہاں تک کہ مُلّا علی قاری کی خدمت تک بھی رسائی حاصل کی، بلکہ شیخ ابن حجر کی خدمت میں بھی پہنچے اور ان سے بھی سند معنعن کی اجازت حاصل کی

سعد اللہ صاحب شاہ آبادی اپنی منظوم تاریخ میں لکھتے ہیں:

ہست از آں جملہ مولوی جوہر	نقش نازت ثبت در دفتر
دیدہ اربابِ فضل را بسفر	گردہ از ہر بزرگ کسبِ ہنر
ہم بملّا علی کہ قاری دید	دانش صحبت چو فیضِ جاری دید
ہم ز ابن الحجر سند دو کف	در احادیث داشت بہرہ شرف[2]

سنہ ۱۰۲۶ھ/سنہ ۱۶۱۷ء میں کشمیر میں ایک خوفناک وبا پھوٹ گئی جس میں بہت سی جانیں تلف ہوئیں۔ مولانا جوہر بھی اسی کے نذر ہوئے۔ اُن کا مدفن سرینگر کے مشہور تاریخی مقبرہ شاعر واری متصل گوجوارہ میں ہے۔

---

[1]: تاریخ اعظمی، ص ۱۰۴۔

[2]: باغ سلیمان (قلمی)، نسخہ ریسرچ لائبریری سرینگر نمبر ۱۰۵۹، ورق ۷۸ (ب)۔

درمغاجاتِ عام رفت از دہر   مدفنش گو جہوارہ ہست از شہر
روضۂ او کہ صاحبِ راز است   قربِ ملا حسین خبا ز است[۱]

مؤرخ محمد اعظم نے آج سے دو سو سال پہلے لکھا ہے کہ ان کی قبر بڑی سادگی کی حالت میں ہے۔

"مزارِ عالیشاں طرفِ شرقی مقبرہ حضرت آخوند ملا حسین خباز بہ کمال بے تکلفی واقعست"[۲]

مولانا جوہر کی کسی کتاب کا پتہ نہیں چلتا ہے، تاہم اتنا تو معلوم ہے کہ انہوں نے اپنے شاگردوں کی ایک بڑی جماعت اپنے پیچھے چھوڑ دی تھی جنہوں نے اپنے اُستاذ کے علوم بالخصوص تدریسِ حدیث کشمیر میں جاری و ساری رکھا۔ ان میں مولانا محمد ٹونکی اور مولانا حیدر بن فیروز خاص طور پر مشہور رہے ہیں۔ موخر الذکر شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے خاص تلامذہ میں سے تھے۔ اسی طرح مولانا جوہر کے خاندان نے بھی مدت دراز تک علم کی شمع فروزاں رکھی۔ محمد اعظم مرحوم لکھتے ہیں:

"بعض اولادِ امجادش بکمالِ صوری و معنوی فائز شدند"[۳]

ان میں ان کے فرزند مولانا یعقوب نانت بھی شامل ہیں جو حضرت شاہ قاسم حقانی کے صاحبِ کمال خلیفوں میں درجۂ اوّل کے بزرگ شمار کئے جاتے تھے۔[۴]

۱؎: باغ سلیمان (قلمی)۔ ۲؎: تاریخ اعظمی، ص ۱۰۲۔ ۳؎: ایضاً
۴؎: تاریخ حسن، ج ۳، ص ۲۴۰۔ نیز ملاحظہ ہو حدائقِ حنفیہ ص ۴۰۳، تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۵۵۔

مولانا شنگرف کشمیری | مشہور شیخ طریقت بابا عثمان گنائی رح کی اولاد سے تھے۔ مولانا فیروز مفتی ان کے برادر زادہ تھے۔ مولانا شنگرف نے کشمیر میں تعلیم کی تکمیل کی اس کے بعد حرمین کا رخ کیا، وہاں دوسرے کشمیری اور ہندوستانی طالب علموں کے ساتھ یہ بھی علامہ شہاب الدین احمد بن حجر ہیتمی کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے اور اجازتِ حدیث حاصل کی۔ کشمیر لوٹ کر درس و ارشاد میں مشغول ہوئے، اپنے وقت کے اکابر علمائے دین میں شمار ہوتے تھے۔ مولوی رحمان علی لکھتے ہیں:

"از علمائے کشمیر محدث و فقیہ جامع علوم عقلی و نقلی بود" [۱]

مؤرخ اعظمی، جس کے مولانا شنگرف جدّ مادری تھے، لکھتے ہیں: کہ مولانا شنگرف کے ہاتھ کا لکھا ہوا شمائلِ نبوی صلعم کا ایک نسخہ میرے پاس موجود ہے اس کی پشت پہ علامہ ابن حجر مکی کے مبارک ہاتھ کا لکھا ہوا اجازت نامہ بھی مرقوم ہے" [۲]

شیخ زین الدین علی تبور | پہلے شیخ یعقوب صرفی اور مولانا شمس الدین پال جیسے سربرآوردہ علماء سے علم حاصل کیا۔ روحانی تربیت حضرت شیخ حمزہ مخدوم رحمۃ اللہ جیسے شیخ وقت سے پائی۔ پھر علامہ ابن حجر مکی رح سے حدیث کی تحصیل کر کے اجازت حاصل کی اس کے بعد وطن لوٹے اور درس و تدریس میں آخری دم تک مشغول رہے۔

---

[۱]: تذکرۂ علمائے ہند، ص ۸۹، حدائق حنفیہ، ص ۲۲۵۔

[۲]: تاریخ اعظمی، ص ۸۵۔

"بتدریسِ علوم معارف الاوقات بود"[۱]

شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے کشمیری شاگرد

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی (م ۱۰۵۲ھ) وہ پہلے عالم دین ہیں جنہوں نے ہندوستان میں ایک طویل مدت کے بعد علم حدیث کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا اس میں مستقل کتابیں تالیف کیں، شروح و حواشی لکھے اور وسیع پیمانے پر اس کے درس و تدریس کا کام سنبھالا۔ مولانا غلام علی آزاد بلگرامی (م ۱۲۰۰ھ) لکھتے ہیں:

"نشر العلوم لاسیما الحدیث الشریف بحیث لم یتیسر مثلہ لاحد من العلماء السابقین والاحقین فی دیار الھند"[۲]

انہوں نے جملہ اسلامی علوم بالخصوص علم حدیث کو جس قدر پھیلایا کہ اگلے، پچھلے علمائے ہند میں اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔

حضرت شیخ نے اپنے شاگردوں کا، جن میں ان کے جلیل القدر فرزند اور دوسرے اخلاف بھی شامل تھے، ایک وسیع حلقہ چھوڑا جو علم حدیث کی نشر و اشاعت میں مشغول ہوئے یہاں تک کہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب آئے تو ان کے ذریعہ اس مقدس علم کی جو آبیاری ہوئی وہ اظہر من الشمس ہے۔

تعیین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ حضرت شیخ دہلوی سے کشمیر کے کتنے علماء نے علم حدیث کی تحصیل کی تھی، راقم کو صرف تین بزرگوں کے نام ملے ہیں، جنہوں نے حضرت شیخ سے علمی و

۱: تذکرۂ علمائے ہند، ص ۹۶۔
۲: سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان، ص ۵۲، بمبئی ۱۳۰۳ھ

فکری استفادہ کیا تھا۔ یقیناً ان کی تعداد صرف تین تک محدود نہیں ہوگی، کیونکہ مغلوں کے کشمیر کا اقتدار سنبھالنے کے ساتھ ہی ہندوستان کے اس وقت کے مشہور علمی مراکز کشمیر کے تشنگانِ علم کے محور بن گئے تھے۔ تاہم ہمیں حضرت شیخؒ کے تینوں ہی کشمیری تلامذہ کے نام ملے ہیں، اس لئے ہمیں بھی انہی تک محدود رہنا پڑے گا ان تین علمائے کے نام یہ ہیں :

۱۔ خواجہ حیدر بن فیروز ۲۔ مولانا معین الدین بن خواجہ خاوند محمود نقشبندی ۳۔ شیخ عبد الرحیم۔

خواجہ حیدر بن فیروز چرخی | ان کا تعلق نتنو یا منٹو خاندان سے تھا، والد کا نام خواجہ فیروز تھا (اور موصوف خواجہ فیروز مفتی گنائی سے جُدا دوسرے بزرگ تھے) وہ چار بیٹیوں کے باپ تھے اور عیالدار اور تنگ دست رہتے تھے۔ وہ حضرت خواجہ عبد الشہید احراری نقشبندی کے مخلص مرید تھے اور ان کی دعاؤں سے ان کے ہاں خواجہ حیدر جیسا "پسر عالی گوہر" پیدا ہوا۔ خواجہ حیدر نے پہلے کشمیر کے نامور علمائے سے اکتساب فیض کیا جن میں علامہ ابن حجر ہیتمی مکی کے شاگرد مولانا جوہر ناتھ محدث کا نام سرِ فہرست ہے، اسی طرح انہیں مشہور روحانی پیشوا حضرت شیخ نصیب الدین غازی کی صحبت کیمیا اثر میں بھی وقت گزارنے کا موقع ملا، اس کے بعد وہ دہلی گئے جہاں شاہجہان آباد میں حضرت شیخ عبد الحق صاحب کے حلقۂ درس اور تربیت گاہ میں داخل ہوئے[۱]۔ اگرچہ اس وقت اُن کی عمر عام طالبعلمو

۱؎ : تاریخ کشمیر اعظمی ، لاہور ۱۳۰۳ھ ، ص ۱۴۳۔

کے سن و سال سے بہت ہی تجاوز کر گئی تھی اور اپنے اُستاد کے تقریباً ہم عمر ہو چکے تھے مگر جن میں طالب علمانہ رجوع ہوتا ہے اُن کے ہاں سن و سال کی قید بے معنی چیز ہوتی ہے۔ وہ حافظِ قرآن بھی تھے اور سات سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کیا تھا۔ ایک مرتبہ خود شیخ عبدالحق صاحب دہلوی نے اپنے سعادت مند شاگرد کی اقتدا کی اور رات بھر قرآن سُنا۔ خود فرماتے ہیں کہ کسی جگہ بھی لقمہ دینے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ اُستاد نے یہ کہہ کر حوصلہ افزائی کی، "بسیار خواندی و ضبط بہ نہایت داری"۔ اس کے بعد ہمیشہ یہ عادت رہی کہ ہر سال پورا قرآن تراویح میں تلاوت کرتے تھے۔[1]

شیخ حیدر کشمیر لوٹے تو ترویجِ علم میں مصروف ہوئے اُن کا درس اس شان کا ہوتا تھا کہ کشمیر کے اکابر علماء دور دور سے آکر مستفید ہوتے تھے اور مدت دراز تک ان کا گھر کشمیر کی مستقل درسگاہوں میں شمار ہونے لگا۔ شیخ حیدر عالم و مدرس ہونے کے ساتھ ساتھ بڑے متقی اور پرہیزگار بزرگ بھی تھے۔ کشمیر کے حکام نے انہیں قضا کا محکمہ سونپنے کی بڑی کوشش کی اور اس سلسلے میں منت سماجت بھی کی، مگر انہوں نے نہ صرف یہ کہ اسے قبول نہیں کیا بلکہ شہر ہی چھوڑ کر چلے گئے اور اپنے فرزندوں کو بھی اس منصب سے دور رہنے کی تاکید کی۔ وہ اس وقت شہر واپس لوٹے جب ایک دوسرے عالم نے اسے قبول کیا۔[2] شیخ حیدر کے بعد اُن کے فرزند مولانا طاہر

۱: ہندوستان میں علومِ حدیث کی تالیفات، مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی، محدث "برہان" دہلی ۱۹۵۲ء۔ ۲: تاریخ اعظمی، ص ۱۲۲۔

اور مولانا افضل اپنے والد کے صحیح جانشین ثابت ہوئے۔ انہوں نے دینی علوم کی خدمت کرکے علمائے کشمیر میں معزز و محترم مقام حاصل کیا۔ ان کا انتقال شیخ عبدالحق صاحب دہلوی کے انتقال کے[2] پانچ سال بعد سرینگر میں ہوا اور اپنے محلہ (گوجوارہ) میں سپرد خاک ہوئے اور کشمیری روایت کے برعکس ان کی قبر میں کسی قسم کی تعمیر یا تزئین نہیں کی گئی۔[2]

شیخ معین الدین نقشبندی رح تفسیر کے باب میں ہم نے قدرے تفصیل سے ان کے حالات لکھے ہیں۔ انہوں نے بھی علم حدیث شیخ عبدالحق صاحب دہلوی رح سے حاصل کیا اور کافی وقت تک اُن کی صحبت و تربیت سے مستفید ہوئے۔ جب کشمیر لوٹے تو فقہ، تفسیر اور عقائد کے ساتھ علم حدیث کی نشر و اشاعت کی طرف بھی توجہ کی۔ انہوں نے اپنی جملہ تصانیف میں سرمایۂ حدیث سے بھرپور استفادہ کیا۔ اس کے علاوہ سعیدیہ لائبریری ٹونک میں ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا صحیح بخاری کا ایک نسخہ موجود ہے اس کے ۱۳۱ ورق اُن کے اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں باقی حصہ شیخ حیدر محدث کے کسی شاگرد کا لکھا ہوا ہے۔ مولانا معین الدین صاحب نے اپنے ہاتھ سے اول سے آخر تک اس پر حاشیہ لکھا ہے اور اس تحشی میں متعدد شروح بخاری اور لغت و رجال کی کتابوں سے استفادہ کرکے ان کا حوالہ بھی دیا ہے۔

لہ: ان کے حالات کے لئے دیکھئے "نزہۃ الخواطر" ج ۵، ص ۳۶۵، ۳۸۲۔

ٹہ: حدائق حنفیہ، ص ۴۰۸، خزینۃ الاصفیاء، ج ۲، ص ۸۵ و ۸۶، اعظمی، ص ۱۰۱۔

ابتداء میں اپنے اُستاد شیخ عبدالحق صاحب دہلوی کا رسالہ "تحقیق الاشارۃ الی تعمیم البشارۃ" بھی شامل کیا ہے۔ کتاب کے خاتمے پر یہ الفاظ لکھے ہیں:

"قد وقع الفراغ بعون اللہ الکریم وفضلہ العمیم من تسوید ھذہ الرسالۃ الشریفۃ المبارکۃ المیمونۃ فی سلخ ربیع الاول یوم الاثنین فی وقت الضحیٰ فی شہور سنۃ الف وتسع وخمسین بید الاحقر عباد اللہ واضعف عبید اللہ معین الدین بن خاوند، حضرت ...... خواجہ خاوند محمود نور اللہ مرقدہٗ۔"

اس کے بعد اس پر مہر ثبت ہے جس میں حسب ذیل عبارت درج ہے:

"چو نامم در ازل کردی معین الدین بفضل خود معین دین بگردان الٰہی۔"

مولانا معین الدین صاحب نے یہ خوشخط اور مجلّٰی ومطلّٰی نسخہ مدینہ طیبہ میں ہدیہ کے طور پر لینے کی نیت کی تھی مگر نامعلوم وجوہ کی بنا پر ان کا ارادہ پورا نہیں ہو سکا تھا۔ اس طرح یہ عظیم ذخیرہ ہندوستان کی مختلف شاہی کتاب خانوں ہی کا زینت رہا اور علماء وفضلاء کے زیر مطالعہ رہا۔[۱]

---

[۱] یہ معلومات ہم نے قاضی محمد عمران خاں صاحب کے ایک مضمون سے ملخصاً اخذ کی ہیں۔ ملاحظہ ہو "معارف" اعظم گڈھ بابت مارچ ۱۹۶۷ء۔

شیخ عبدالرحیم | مورخ غلام حسن کھویہامی مرحوم ان کے بارے میں لکھتے ہیں ؛ "توفیق الٰہی شیخ عبدالحق دہلوی" سے تربیت پاکر طریقت کے راستے پر گامزن ہوئے، عبادت و ریاضت میں تن دمن سے لگ گئے۔ آخر پر بابا عثمان قادری سے خط ارشاد بھی حاصل کیا۔"[1]
دوسرے مورخین ان کے بارے میں خاموش ہیں۔ ان کی کسی تحریر یا تلمیذ کا بھی سراغ نہیں ملتا ہے۔ اس کی دو وجہیں ہو سکتی ہیں یا تو انہوں نے کشمیر سے ہجرت کی ہوگی یا خاص اسباب کی بنا پر گوشہ نشینی اختیار کی ہوگی، ورنہ محدث دہلوی" جیسے عالم کے کسی شاگرد کے لئے خدمت علم سے دامن بچانا ممکن نہیں تھا۔ شیخ عبدالرحیم صورہ (موجودہ شیر کشمیر میڈیکل انسٹیچوٹ کے قرب و جوار) میں دفن ہیں۔

کچھ اور محدث | گیارہویں صدی ہجری میں کشمیر میں علم حدیث کی مشعل فروزاں رکھنے میں مذکور الصدر علماء بالخصوص شیخ حیدر چرخی منتو اور خواجہ معین الدین صاحب کا اہم ترین حصہ رہا ہے دونوں بزرگوں کی قیام گاہیں مستقل دینی مدارس میں تبدیل ہوئیں جہاں عرصۂ دراز تک دینی علوم کی تبلیغ و تدریس اور نشر و اشاعت ہوتی رہی۔ شیخ حیدر کے اپنے دو فرزند ملا افضل چرخی اور ملا طاہر چرخی اپنے باپ کے صحیح جانشین ثابت ہوئے اور خدمت علم کی تاریخ میں اپنا علیحدہ مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ یہی حال خواجہ معین الدین صاحب کی خانقاہ کا بھی ہے جو روحانی اور تربیتی مرکز کے ساتھ ساتھ نشر و اشاعت کا اہم ادارہ بھی ثابت ہوا، تاہم یہ

---

[1] تاریخ حسن، ج ۳

ایک تاریخی حقیقت ہے کہ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے مذکورۃ الصدر شاگردوں کے سوا بھی کشمیر میں اس زمانے میں کچھ ایسے علماء موجود تھے جو علمِ حدیث کی خدمت میں مشغول تھے، بلکہ ان میں کچھ ایسے بزرگ بھی تھے جن کا علمی تبحر مذکورہ بزرگوں سے کسی طرح بھی کم نہیں تھا اسی وجہ سے وہ وطن سے باہر نکلنا ضروری نہیں سمجھتے تھے یا اگر کسی وجہ سے کبھی نکلتے تھے تو وہ یقیناً اپنے ہندوستانی معاصرین سے مرعوب کی حد تک متأثر نہیں ہوتے تھے۔ اس میں شک نہیں ہے کہ کشمیر کے ان متبحر محدثین نے تصنیف و تالیف کے میدان میں کوئی غیر معمولی کارنامہ انجام نہیں دیا ہے جس کے کچھ علیٰحدہ وجوہ ہیں جن کی طرف ہم نے مقدمۂ کتاب میں اشارہ کیا ہے۔

بایں ہمہ جہاں تک حدیث فہمی اور تدریسِ حدیث کا تعلق ہے تو وہ اس میں تمام ضروری صلاحیتوں کے مالک تھے۔ علامہ عنایت اللہ شالی محدث (م ۱۱۲۵ھ) کے بارے میں ان کے ہمعصر مؤرخ خواجہ محمد اعظم دیدہ مری مرحوم لکھتے ہیں:

"در علمِ حدیث و حفظِ طرق و اسانید آں لاثانی، درسِ بخاری نظیر نداشت۔ مے گویند سی و شش بار مذاکرۂ صحیح بخاری من اولہ الی آخرہ کردہ بود"[۱]

علم حدیث و اسانید کی یادداشت نیز صحیح بخاری کی تدریس میں خصوصاً اپنی مثال نہیں رکھتے تھے۔ کہتے ہیں کہ صحیح بخاری اول سے آخر تک چھتیس ۳۶ مرتبہ دھرائی تھی۔

لہ: تاریخِ اعظمی: ص ۲۱۹ - و تذکرہ علماء ہند، ص ۱۵۲ -

اُن کے ایک اور ہم عصر عالم شیخ داؤد مشکواتی (م ۱۰۹۷ھ) کے بارے میں مشہور ہے کہ انہیں حدیث کی مشہور کتاب مشکوٰۃ المصابیح ازبر یاد تھی۔[1] ان کی کتاب "اسرار الابرار" کو جو اصل میں چند مشہور صوفیائے کرام کے حالات اور احوال و افادات سے متعلق ہے مولانا سید سلیمان ندوی رح نے بعض خصوصیات کی بنا پر حدیث کی کتابوں میں شمار کیا ہے۔[2] ایسے ہی ایک اور فاضل جلیل مولانا محمد امین گنائی (م ۱۱۰۹ھ) تھے، انہوں نے عربی دینی علوم کے چند ایسے فاضل پیدا کئے جو یقیناً اپنی مثال آپ تھے اور علمی گہرائی اور اخلاص و للّٰہیت میں اپنے دور کے کسی بھی ممتاز محدّث و مفکر سے کچھ کم مرتبہ نہیں رکھتے تھے۔ ان کے شاگردوں میں مولانا محمد محسن کھشو، محدّث عنایت اللہ شال اور مولانا عبدالرشید زرگر اپنے زمانے کے جلیل القدر علماء میں سے تھے اوّل الذکر کے علمی مرتبہ کا اندازہ لگانا ہو تو صرف اُن کی ایک عربی کتاب "ردّ الشیعۃ" کا مطالعہ کافی ہوگا، تردیدِ شیعیت میں اس دور کے اکابر علماء ہند نے بہت سی علمی کتابیں لکھی ہیں جن میں حضرت مجدّد صاحب کی ردِّ شیعہ بھی ایک ہے۔ تاہم تقابلی مطالعہ کے بعد ہی مولانا محمد محسن کھشو کی وسعتِ نظر، فکر کی گہرائی، اخلاص و اعتدال اور قلم کی جولانی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے

---

[1] خزینۃ الاصفیاء، ج ۱، ص [illegible] ۲۱۴۔ تاریخ حسن، ج ۳، ص ۵۵۲

[2] ایسی کتاب میں [illegible] کے حوالے نظر آتے ہیں" ہندوستان میں علم [illegible]، ص ۲۷۰۔

مولانا محمد امین گانی اور علم حدیث میں ان کا ایک منظوم رسالہ:

جیسا کہ بیان کیا گیا کہ مولانا محمد امین گانی گیارھویں صدی ہجری کے نصف آخر کی ایک مقتدر علمی شخصیت تھی۔ وہ شہر سرینگر میں پیدا ہوئے تھے اور عسرت کی زندگی گزاری تھی، مگر ان کی تنگدستی ان کی خدمت علمی کے جذبے کو مٹا نہیں سکی۔ درس و تدریس اور مفید علمی تصانیف و حواشی سے علم کے باغ کو آخری دم تک سیراب کرتے رہے، بڑے متوکل اور پرہیزگار تھے تاہم طبیعت میں ظرافت تھی ان کے ایک قدیم دوست ملا عبدالکریم کشمیر کے قاضی بن کر آئے۔ مولانا محمد امین ان کی ملاقات کو گئے مگر قاضی صاحب شاید طویل مدت کی مفارقت کی وجہ سے انہیں پہچان نہ سکے۔ مولانا نے اپنا تعارف کرایا تو قاضی صاحب نے معذرت مانگی، مولانا نے معذرت قبول کرتے ہوئے کہا: اذا جاء القضاء عمی البصر ۔۔۔ سخت علمی انہماک سے صبر آزما آزمائشوں میں بھی مبتلا ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ دو بالغ لڑکیوں کی شادی بیاہ کے لوازم و مصارف پورا کرنے کے لئے ہندوستان جانا پڑا، ادھر دونوں بیٹیاں گھر میں بیمار ہوئیں اور دوا کے بدلے غذا [illegible] ہو گئیں، دہلی میں خواب دیکھا کہ کسی کہنے والے نے [illegible] بار مذاکرہ صحیح بخاری [illegible]

"مہم ترا الٰہ الٰی آخرہ کردہ بود، بہ کشمیر برو مشغول باش" (تمہاری مہم آسان کر دی، گھر جاؤ اور علم پڑھانے [میں مشغول] ہو جاؤ)

۱۔ تاریخ اعظمی: ص ۲۱۹ - و تذکرہ علماء [illegible]

اعظمی ان کے علم وفضل کے بارے میں لکھتے ہیں:

"از مہرۂ علمائے محققین بود ...... اوقات شریفہ در قناعت وتوکل بدرس وبحث علوم مصروف داشت۔"[۱]

علم حدیث میں ان کا ایک مختصر منظوم فارسی رسالہ راقم کے سامنے ہے جس کا نام "رسالہ فی اصول الحدیث" ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ میں نے اصولِ حدیث میں ایک عجیب وغریب رسالہ دیکھا ہے اور ارادہ کیا کہ اسے منظوم فارسی میں منتقل کر دوں، تاکہ طالب علموں کو سمجھنے اور یاد کرنے میں آسانی ہو سکے۔ ابتدا میں ۱۸ اشعار پر مشتمل ایک مناجات اور ۲۵ اشعار پر مشتمل ایک نعت ہے۔ پھر سلطان محی الدین اورنگ زیب عالمگیر کی علمی اور اصلاحی خدمات کو خراج عقیدت ادا کیا، اس کے ساتھ ہی کتاب کا اصلی مضمون شروع ہوتا ہے۔

میرساند بعرض اہل یقین	بندۂ احقر الحقیر امین!
کہ اصولِ حدیث عالی شاں	باشد از اشرف علوم جہاں
کہ بود زاں بصیرت افہام	در سماعِ حدیث خیر انام

۱۔ در بیانِ تعریفِ حدیث

۲۔ تقسیم حدیث باعتبار کثرتِ رواۃ

۳۔ در بیانِ حکم مقبول و تقسیم آں بجانب صحیح للذات وصحیح لا للذات وحسن للذات وحسن لا للذات

۴۔ در بیانِ تقسیم سند

۵۔ در تقسیم حدیث مقبول باعتبار آنکہ معمول است یا متروک العمل

---

[۱] : تاریخ اعظمی، ص ۱۹۱۔

۶۔ در تقسیم حدیثِ مردود باعتبار محلّ سقوطِ اسناد بجانبِ مُعلّق و مرسل و موصل و منقطع الخ

۷۔ در بیانِ بدعت کہ یکی از فروعِ طعن در عدالتِ رُواۃ است

۸۔ در بیانِ سوءِ حفظ کہ یکی از فروعِ طعن در ضبطِ رُواۃ است۔

..... وغیرہ وغیرہ

اِس عربی رسالے کو، جو ایک نہایت مشکل علمی موضوع سے متعلق ہے، منظوم فارسی میں منتقل کرکے مترجم نے ان دو زبانوں میں اپنے بھرپور رسوخ و کمال کا ثبوت پیش کیا ہے۔ الفاظ نہایت سہل اختیار کیے ہیں اور غنائیت سے لبریز ہے مگر علمی وقار اوّل سے آخر تک چھایا ہوا ہے، مناجات سے چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں جن سے کتاب کے نفسِ مضمون کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے:

اے حدیثِ تو برزبانِ ہمہ	زندہ از ذکر تُست جانِ ہمہ
نطق را بر زباں حکایتِ تُست	لفظ را در بیاں روایتِ تُست
از ازل ہرچہ تا ابد باشد	جملہ سوئے تو مستند باشد
بتواتر رسیدہ نعمایت	نبود منقطع کرمہایت
بام ہائے تو بر رسُلِ مُرسَل	بر تو مرفوع نامہائے عمل
کارت از علتی معلل نیست	ہیچ مصنوعِ تو مُعلّل نیست

کتاب کے آخری اشعار بھی نقل کیے جاتے ہیں جن میں فاضل مترجم نے

اسے فارسی نظم میں منتقل کرنے کی غرض و غایت واضح کی ہے ،

ہمچنیں دان طریقۂ تصنیف — تا پسندیدہ باشدت تالیف
ہر کتابی کہ اندریں ما است — برسانید ما بُراَلنوال است
تا بود بر عِلَل ورا تالیف — ما بر اطراف کردہ شد تصنیف
ہم سبب در حدیث دانستی — آمدہ از لوازم ایں فنون
اکثر ایں مطالب عالی — کامدہ در بیان اجمالی
شد بتفصیل در کتب مشروح — جاں شناں یک بیک بیافت وضوح
شکر للّٰہ کہ در اخیر کلام
یافت ایں نظم صورت اتمام[1]

شیخ ابوالحسن سندھی کا کشمیر میں علمی فیضان

سندھ ماضی میں دینی علوم بالخصوص علم حدیث کا مشہور مرکز رہا ہے اور دہلی کے بعد سندھ ہی کے علماء نے فنِ حدیث میں اپنی مہارت اور اس کی نشر و اشاعت میں امتیاز حاصل کیا ہے۔ یہ شیخ ابوالحسن نور الدین سندھی (م ۱۱۳۹ھ) شیخ ابوالطیب سندھی مدنی (م۔ ۱۱۴۰ھ) شیخ محمد معین سندھی (م ۱۱۶۱ھ) شیخ محمد حیات سندھی (م ۱۱۶۳ھ) شیخ محمد ہاشم سندھی (م ۱۱۷۲ھ) شیخ ابوالحسن بن محمد صادق سندھی (م ۱۱۸۷ھ) اور شیخ عابد سندھی (م ۱۲۵۷ھ) وغیرہ جیسے اکابر محدثین بلادِ سندھ سے ہی تعلق رکھتے تھے۔

ان میں سرِ فہرست مولانا ابوالحسن نور الدین محمد بن الہادی سندھی حنفی (م ۱۱۳۸ھ) کا نام آتا ہے جنہوں نے سندھ کے مشائخ

---

[1] : رسالہ فی اصول الحدیث (قلمی)۔

سے علوم و فنون حاصل کرنے کے بعد مدینہ طیبہ ہجرت کی، حرم نبویؐ میں درس حدیث دینے لگے اور اس کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کے کاموں میں بھی مصروف ہوئے۔ حدیث میں صحاح ستہ اور مسند امام احمد پر ان کے حواشی مشہور ہیں اور علماء محققین ہر دور میں ان سے مستفید ہوتے آئے ہیں۔ آپ کی مقبولیت اور عزت و احترام کا اندازہ صرف اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب مدینہ طیبہ میں آپ کا انتقال ہوا تو جم غفیر نے آپ کے جنازہ میں شرکت کی جس میں علماء اور حکام وقت بھی شامل تھے اور مدینہ شریف کا بازار بند رہا۔[۱]

انہی شیخ ابوالحسن سندھی کے فیض یافتگان میں دو بزرگوں کا تعلق ہندوستان سے رہا ہے۔ علامہ سید سلیمان ندویؒ لکھتے ہیں:

"حضرت شیخ ابوالحسن سندھیؒ کے تلامذہ میں سے دو کا تعلق ہندوستان سے ہے، حاجی عبدالولی طرخانی کشمیری اور شیخ محمد حیات سندھی۔"[۲]

حاجی عبدالولی طرخانی کشمیری | یہ شیخ طرخانی اصلاً ترکستان کے علاقے طرخان یا طرخال کے رہنے والے تھے۔ دینی علوم و فنون بالخصوص علم حدیث حرمین میں حاصل کئے۔ ان ایام میں وہاں شیخ ابوالحسن نورالدین سندھی مدرسہ دارالشفاء میں درس دیتے تھے

۱۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۶۔ نیز ملاحظہ ہو
۔ انوار الباری (مقدمہ) حصہ دوم، مولانا احمد رضا بجنوری، ص ۱۹۱۔
۲۔ معارف، بابت دسمبر ۱۹۲۷ء۔

شیخ طرخانی نے ان سے اکتساب علمی کر کے سند و اجازت حاصل کی۔ وہ یہاں سے سیدھے کشمیر آئے اور اس وقت کے برگزیدہ کشمیری عالم اور مفتی مولانا قوام الدین کے ہاں قیام کیا، یہیں پر شیخ طرخانی نے درس کا سلسلہ بھی شروع کیا اور مفتی قوام الدین استفید ہونے والوں میں پیش پیش رہے تھے۔ اس زمانے میں پنجاب اور کشمیر سے مغلوں کی حکومت کا خاتمہ ہو رہا تھا اور افغان شمالی ہندوستان پر چھا رہے تھے۔ احمد شاہ درانی کا دست راست عبداللہ خان اشک اقاصی تھا۔ خان اقاصی کے قابلِ اعتبار ساتھیوں میں ایک پنجابی کھتری سوکھ جیون مل تھا، اسی خان اقاصی کی حمایت سے احمد شاہ درانی نے سوکھ جیون مل کو کشمیر کا صوبیدار مقرر کیا۔ کشمیر کے مورخین اس کی ابتدائی دور کی عدل پروری، علم دوستی، علماء نوازی، سیر چشمی و فیاضی اور مذہبی رواداری کی بڑی تعریف کرتے ہیں۔[1]

تاہم موصوف کا انجام اس کے حق میں افسوسناک ثابت ہوا اس کی بڑی وجہ، حالات کا تجزیہ کر کے یہ دکھائی دیتی ہے کہ اسے سکھوں اور مرہٹوں نیز افغان مخالف دوسری ہندوستانی قوتوں کے بڑھتے ہوئے اثر و نفوذ سے دھوکہ ہوا۔ اُسے ان قوتوں کی کامیابی کا پورا یقین ہوا تھا اور جلد بازی سے درانیوں سے ٹکر لیکر، جنہوں نے اس پر اعتماد کر کے اسے کشمیر کی صوبیداری سونپی تھی، کشمیر کا مالک و مختار بن بیٹھا اور اس کے ساتھ ہی وسیع پیمانے پر

---

[1] خزانۂ عامرہ، غلام نبی آزاد بلگرامی، لونکشور ۱۸۷۱ء، ص ۱۱۵-۱۱۵ و تاریخ حسن، ص ۶۵۳-۶۵۶، ج ۳

کشمیر میں "اصلاحات" کا بیڑا اُٹھایا۔ اس نے مہانند پنڈت در کو رئیس الملک اور مدار المہام کے عہدے پر سرفراز کیا۔ ان دونوں نے مل کر مسلمانوں پر بڑی سختیاں کیں، گاؤکشی اور اذان پر پابندی لگا دی، کشمیری پنڈتوں کو، جو انتہائی قلیل اقلیت میں تھے اور مسلمان اُنکے عزائم سے شروع سے غیر مطمئن تھے، بلند مناصب عطا کیے۔ انہوں نے سُکھ جیون مل کی پشت پناہی پر۔ اکثریتی طبقے پر سخت زیادتیاں کیں۔[1] چنانچہ کشمیر کے مسلمان، جنہوں نے سُکھ جیون مل کو ابتدا میں سر آنکھوں پہ بٹھایا تھا، اس سے متنفر ہوئے۔ اس ظلم و زیادتی میں کئی سرکردہ علمائے ناکردہ گناہوں کی پاداش میں قتل کیے گئے جن میں شیخ عبدالولی ظرخالی حنفی بھی شامل ہیں۔ چنانچہ یہی مذہبی تعصب سُکھ جیون مل کی بربادی کا باعث بن گیا۔ شمالی ہندوستان میں سکھوں اور مرہٹوں کو احمد شاہ ابدالی کے ہاتھوں شکست ہوئی۔ اب سُکھ جیون مل کی باری آئی۔ احمد شاہ درانی نے نورالدین خان بامزے کو اس کی سرکوبی کے لئے روانہ کیا، سُکھ جیون مل نے اگرچہ درانیوں کا مقابلہ کرنے کے لئے تیاریاں کی مگر پسپا ہوا۔ اُسے اس کے بیٹے کے ساتھ گرفتار کیا گیا۔ پہلے انہیں نابینا کیا گیا، پھر سُکھ جیون مل کو لاہور روانہ کیا گیا جہاں احمد شاہ درانی نے اُسے افغانی طریقۂ انتقام (نہ کہ اسلام کے قانونِ جنگ) کے مطابق قتل کروایا۔

لہ: تاریخ حسن، ج ۳، ص ۶۵۹۔

غرض شیخ عبدالولی محدث ۱۱۷۰ھ میں قتل کئے گئے۔ کہتے ہیں کہ قتل کے بعد صبح تک ان کی زبان پر "صمد" کا ذکر جاری تھا۔ وہ پٹن میں دفنائے گئے جو ضلع بارہمولہ سے وابستہ مشہور قصبہ ہے۔[1]

شیخ طرخانی کی کسی تصنیف کا پتہ نہیں ملتا ہے تاہم انہوں نے مُلّا قوام الدین مفتی کی صورت میں ایک مشہور شاگرد چھوڑا جنہیں کشمیر میں اپنے زمانے میں تدریس و افتا اور سیاست و امارت میں خاص کردار رہا ہے۔ شیخ الاسلام کا منصب، جسے مشہور شاہمیری حکمران سلطان سکندر (۱۳۸۹ء تا ۱۴۱۴ء) نے وجود میں لایا تھا اب ناپید ہو چکا تھا۔ احمد شاہ ابدالی نے اسے دوبارہ زندہ کیا، اور انہی مفتی قوام الدین کو اس منصب پر سرفراز کیا۔ اس طرح وہ درانی دور کے پہلے سرکاری شیخ الاسلام بن گئے۔[2] وہ بلند پایہ مدرس بھی تھے اور خانقاہ سید محمد اویسی میں دینی علوم کا درس دیتے تھے۔ اسی طرح ان کی تحریری یادگار میں "الصحائف السلطانیۃ" کا نام ملتا ہے جس میں انہوں نے رائج علوم سے متعلق انوادات قلمبند کئے تھے۔ بدقسمتی سے یہ کتاب اب ناپید ہے اگر موجود ہوتی تو مفتی صاحب کا علمی مقام متعین کرنے میں ہمیں بڑی مدد ملتی۔ مفتی صاحب کا انتقال ۱۲۱۹ھ میں ہوا۔

سندھ کے ایک اور سربرآوردہ محدث شیخ محمد عابد سندھی مدنی (م ۱۲۵۷ھ) تھے۔ ہندوستان کے اکابر علماء ان کے شاگرد رہ چکے

[1] : تاریخ حسن، ج ۳، ص ۳۴۸۔ [2] : ایضاً، ج ۲، ص ۲۴۴۔

[3] : حدائق الحنفیہ، ص ۴۶۳؛ تذکرہ علمائے ہند: مولوی رحمان علی صاحب، ص ۱۶۱

ہیں، جن سے حضرت مولانا انور شاہ کشمیری نے بھی بالواسطہ فیض حاصل کیا تھا۔ علامہ کشمیری ایک جگہ فخر کے ساتھ کہتے ہیں:

"الشیخ عابد سندی من شیوخی بواسطتین لان الشیخ محمود الحسن رحمہ اللہ قد استجاز من الشاہ عبدالغنی وھو من تلامذۃ سندھی۔"[۱]	شیخ عابد سندھیؒ دو واسطوں سے میرے اُستاد ہیں، کیونکہ مولانا محمود الحسن (شیخ الہند) کو شاہ عبدالغنی سے حدیث کی اجازت تھی اور شاہ عبدالغنی صاحب، حضرت شیخ عابد سندھی کے شاگردوں میں سے تھے۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی کے کشمیری تلامذہ

بارہویں صدی ہجری، جیسا کہ ہم نے مقدمے میں تفصیل سے بیان کیا ہے، ہندوستان بالخصوص کشمیر کے لئے انتشار اور اضمحلال کا دور تھا۔ مغلیہ سلطنت کا تنزل، باغی قوتوں جیسے مرہٹوں، جاٹوں اور سکھوں کا عروج اور علم و ثقافت سے محروم درانیوں کی پے در پے یلغار سے جب ہندوستان کا امن و سکون درہم برہم ہوا تو لازماً علم و ادب اور فکر و فن کو بے حد نقصان پہنچا جس سے کشمیر بھی براہِ راست متاثر ہوا۔ اس دور کی زندہ جاوید علمی شخصیت حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی تھی انہوں نے اس آندھی میں علم کا چراغ فروزاں رکھنے میں اپنی پوری زندگی وقف کی۔ آگے اسی واحد چراغ سے ہندوستان کے مسلمان صدیوں تک روشنی حاصل کرتے رہے۔

---

[۱] : فیض الباری علی صحیح البخاری، ج ۲، ص ۲۷۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے مختلف جہات سے اور وسیع پیمانے پر علم حدیث کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا ان کی علمی جامعیت دیکھتے ہوئے کسی خاص فن میں ان کے تخصص کا دعوی کرنا اگرچہ مشکل ہے تاہم یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ علم حدیث کی خدمت ان کی دوسری خدمات پر حاوی رہی۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے اپنے ملفوظات میں اپنے والد بزرگوار کا یہ قول نقل کیا ہے کہ جب میں مدینہ طیبہ سے اپنے اساتذہ سے الوداعی ملاقات کے لئے گیا تو عرض کیا:

"ہرچہ خواندم فراموش کردم إلاّ علم دین[1]" جو کچھ میں نے پڑھا، اسے بھول چکا۔ صرف علم دین یعنی علم حدیث یاد ہے۔

چنانچہ وطن واپس لوٹ کر انہوں نے اس فنِ شریف کی تحقیق و اشاعت کی ذمہ داری اس خوبی سے انجام دی کہ بالآخر علمی دنیا میں محدث دہلوی سے مشہور ہوئے۔

تیقن کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ کشمیر کے کتنے علماءٔ نے حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ سے کسب فیض کیا تھا۔ اگرچہ وہ کشمیر کے اندرونی حالات سے واقف اور یہاں کے بعض اکابر سے متعارف تھے مگر پھر بھی کشمیر کے بہت کم طلباءٔ ان کے درس سے مستفید ہوئے تھے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ کشمیر میں اب بھی بہت سے مقتدر علماءٔ موجود تھے۔

---

(۱): ملفوظات شاہ عبدالعزیز، میرٹھ، ص ۹۳۔

اور تشنگانِ علم اُنہی سے علم حاصل کرتے تھے۔ تاہم تین بزرگوں کے نام تاریخ اور تراجم کی کتابوں میں ملتے ہیں جنہوں نے شاہ صاحب کے حلقۂ درس میں داخل ہو کر علمی فیض حاصل کیا تھا۔ بالخصوص خواجہ محمد امین کشمیریؒ نے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے تلامذہ میں ایسا امتیاز حاصل کیا تھا کہ حضرت شاہ صاحب کے خاندان کے ایک فرد سمجھے جانے لگے اور "ولی اللہی" سے مشہور ہو گئے۔

خواجہ محمد امین کشمیری | جمال الدین شاہ محمد امین، کشمیر کے ایک تاجر تھے۔ تجارت کی وجہ سے دہلی میں اکثر قیام رہتا تھا دینداری اور پرہیزگاری سے شروع سے آراستہ تھے۔ بزرگانِ دین اور اصحابِ دل علماء کی مجلسوں میں بھی شریک ہوتے تھے۔ ان میں حضرت ولی اللہ صاحبؒ کی بابرکت صحبت اس طرح گرویدہ کر گئی کہ دوسری محفلوں اور مجلسوں سے بے نیاز کر دیا۔ فکرِ ولی اللہی کے ایسے ماہر کامل تھے کہ کوئی اس میں ان کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتا تھا۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کو ان سے ایسی مناسبت تھی کہ علمی کاموں میں انہیں اپنا دستِ راست بنایا بلکہ اپنی کئی کتابیں اسی فاضل شاگرد کے لئے تالیف کیں۔ اکثر ان کے بارے میں حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے تھے:

شما اے شیر جوارح خود — بلاشبہ میں تم کو اپنے جسمانی اعضاء کے مانند سمجھتا ہوں۔
می دانم[۱]

۱۔ القول الجلی و اسرار الخفی، شیخ محمد عاشق پھلتی، بحوالہ "برہان" دہلی جولائی

خواجہ صاحب کو بھی اپنے اُستاد سے بے حد عقیدت و محبت تھی۔ اپنی ایک مناجات، جس کا عنوان "اعتصام الاحلین بحبل اللہ بتوسل ولی اللہ" میں خواجہ صاحب کمالِ عاجزی سے دعا کرتے ہیں:

امام و مقتدا و قبلہ گاہم — ولی اللہ شاہِ دیں پناہم
تنم را خاکِ راہِ ایں حرم کن — سرم زیں خاکساری محترم کن
مرا مہجور مفگن از درِ او — کہ تا چوں حلقہ باشم بر درِ او

مولانا عبدالحی حسنیؒ نے چند واقعات پر غور و فکر کرکے ان کا سالِ وفات (اغلباً) ۱۱۸۷ھ متعین کیا ہے۔ خواجہ صاحب مصنف بھی تھے اور مدرس بھی۔ ان کے ممتاز شاگردوں میں حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ بھی ایک تھے، کیونکہ انہوں نے اپنے والد کے بعد خواجہ صاحب ہی سے علوم کی تحصیل اور تکمیل کی تھی جس کا انہوں نے خود بھی اعتراف کیا ہے۔[۱] خواجہ صاحبؒ حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کو تصنیف و تالیف کے کام میں علمی معاون کے طور پر ہاتھ بٹاتے تھے، خاص فنِ حدیث میں انہوں نے شاہ صاحب کی مشہور شرحِ مؤطا "مصفیٰ" کی تصحیح اور درستی کی تھی مولانا عبدالحی حسنیؒ لکھتے ہیں:

"صححہ" و هذبہ بعد — اُن کی وفات کے بعد ان کے

---

[۱]: القول الجلی، دا اسرار الخفی، شیخ محمد عاشق پھلتی "برہان" دہلی، جولائی ۱۹۴۸ء۔

[۲]: فوائد جامعہ بر عجالہ نافعہ، مولانا عبدالحلیم چشتی، کراچی، ص ۲۔

وَفاتِه صاحبهٔ الشیخ محمد امین ولی اللّٰهی"[1] شاگرد محمد امین ولی اللّٰهی نے اس کی تصحیح و تہذیب کا کام انجام دیا۔

شیخ محمد عثمان چشتی عرف "رادھو"

یہ شیخ محمد عثمان ایک ایسے گھرانے سے تعلق رکھتے تھے جو علم و ادب اور اصلاح و تبلیغ کا مرکز تھا۔ ان کے دادا شیخ محمد چشتی ایک عالمِ دین اور شیخِ طریقت تھے۔ وہ علامہ شیخ یعقوب چرخی (تلمیذ شیخ عبد الحق محدث دہلوی) کے مدرسے کے فارغ التحصیل تھے۔ ان کے زمانے میں موئے مقدس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کشمیر لایا گیا۔ شیخ محمد چشتی "کمر خمیدہ و برہنہ پا اس کے استقبال کے لئے نکلے۔ فرطِ شوق اور شدتِ مسرت و انبساط سے ان کی خمیدگی، جو بڑھاپے کی وجہ سے پیدا ہو چکی تھی، دور ہو گئی۔ انتقال کے وقت تک آپ ہی مقررہ اجتماعات میں موئے پاک کی نشاندہی کر کے زیارت کرواتے تھے۔ وہ بلند پایہ عالم اور مصنف بھی تھے۔ نثر و نظم میں کتابیں لکھی ہیں۔ تصوف میں ایک لاکھ سے زیادہ اشعار ان کے طبع زاد ہیں۔[2] "عُدّۃ اللقا" کے نام سے ان کا ایک منظوم رسالہ شائع بھی ہوا ہے، جو لا اِلٰہ اِلّا اللّٰہ کی فضیلت میں ہے۔ اس کا خطبہ عربی میں ہے۔[3] حدیث میں ان کے دو مستقل رسالے ہیں، دو احادیث مبارکہ کی تشریح و توضیح میں ہیں۔ ان میں حدیث "الفقر سواد الوجہ" اور دوسری "المؤمن مرآۃ المؤمن" ہے۔ پوری زندگی

[1]: الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند، ص ۱۵۰۔

[2]: تاریخ حسن، ج ۳۔ [3]: عُدّۃ اللقا، امرتسر ۱۳۲۷ھ

مسلمانوں کی تربیت و اصلاح میں صرف کی۔ بلند پایہ صوفی اور عابدِ شب زندہ دار تھے۔ ۱۱۲۶ھ میں انتقال ہوا تھا۔

شیخ محمد چشتی کے کئی فرزند تھے جو اپنے نامور باپ کے صحیح جانشین اور ان کے روحانی و علمی ورثے کے سچے امین ثابت ہوئے مؤرخ محمد اعظم مرحوم نے، جو شیخ محمد چشتیؒ کے معاصر اور عقیدتمند تھے، جہاں اُن کے اخلاص، تقویٰ اور خشیت کا دقیق الفاظ میں ذکر کیا ہے وہاں ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے:

"فرزندانِ صالح و طالبِ علم نیک اور جویائے علم فرزند
بجائے خود گزاشت۔"[۱] کو اپنے پیچھے چھوڑ گئے۔

اُن فرزندوں میں شیخ محمد صدیقؒ اور شیخ محمد فاروق مشہور ہوئے۔ انھی شیخ محمد فاروق کے فرزند شیخ محمد عثمان تھے جنہیں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کا شاگرد ہونے کا فخر حاصل تھا۔ مؤرخ حسن لکھتا ہے:

" دہلی جاکر حضرت شاہ ولی اللہ سے علم حدیث اور شریعت کی کتابوں کی سند حاصل کی اور طریقت میں بھی اُن سے رہبری پائی۔"[۲]

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلویؒ کی خدمت میں جانے سے قبل وہ اپنے خاندان کے اکابر اور کشمیر کے سرکردہ علماء سے علوم کی تحصیل کر چکے تھے۔ خواجہ سعد الدین صادق، مولانا محمد مقیم اور شیخ سلیمان (فرزند مُلا ابو الفتح کلو مؤلف سیف السابلین) اُن کے وہ

---

[۱] تاریخ اعظمی، ص ۲۲۰۔ [۲] تاریخ حسن، ۲۵

معتبر اساتذہ تھے جن سے وہ درس حاصل کر چکے تھے[1] شیخ محمد عثمان کی کسی تصنیف کا سراغ نہیں ملا، تاہم مورخ حسن نے لکھا ہے کہ وہ انشاء اور شاعری میں فطری ذوق اور صلاحیت کے مالک تھے اور بے نظیر مقرر بھی تھے[2]

ملا اکبر خاں موصوف ایک صاحبِ منصب شخص کے فرزند تھے۔ علوم کی تکمیل ملا سلیمان کی خدمت میں کی تھی جو سلطان قطب الدین کے قائم کئے ہوئے دارالعلوم کے مشہور اُستاد تھے۔ والد نے انہیں جاگیر کے اسناد درست کرنے کے لئے دہلی بھیجا تھا مگر وہ سیدھے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی کی خدمت میں پہنچے اور ان کے حلقۂ درس میں شامل ہو کر اُن سے سند و اجازت حاصل کی۔ درس سے فارغ ہونے کے بعد انہوں نے کشمیر لوٹنے کا ارادہ کیا کہ اچانک دلی میں ہی پیغام اجل آپہنچا۔ مورخ حسن لکھتے ہیں:

"دینی اور دُنیاوی علوم میں کمال حاصل کر کے لوگوں کو فائدہ پہنچانے میں مصروف ہوئے، درسی کتابیں تقریباً زبانی یاد تھیں اور سارا وقت علمی باتوں میں گزارتے تھے۔"[3]

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کے کشمیری تلامذہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے بعد ان کے گرامی قدر فرزندوں سے بھی کشمیر کے تشنگانِ علم نے فیض حاصل کیا ہے بالخصوص مہاجر کشمیر نونا نے اُن کے شاگردوں میں بڑی شہرت حاصل کی بحوالہ رشید الدین دہلوی

[1] : تاریخ حسن، ج ۲۔ [2] : ایضاً۔ [3] : ایضاً۔

اور مفتی صدر الدین خاں آزردہ دہلوی ان کے مخصوص شاگردوں میں تھے اور دونوں کا تعلق کشمیر سے تھا۔ ہم مولانا رشید الدین دہلوی کشمیری کے حالات "علم کلام" کے باب میں تفصیل سے بیان کریں گے۔ یہاں صرف مولانا زکریا صاحب شیخ الحدیث کے یہ چند الفاظ نقل کرتے ہیں جو انہوں نے مولانا رشید الدین کے علمی تبحر اور دینی خدمات کے سلسلے میں لکھے ہیں:

"المقدام فی المعقول و المنقول حاوی الفروع والاصول .... کان ماهرًا فی رد الروافض مشهور النکایة فیهم حتیٰ یضرب به المثل فی الرد علیهم۔ کان حسن العبارة دائب الذب عن حمی السنة ذکیًا نظارًا فصیحًا، اشتغل بالعلوم فبرع فی کثیر منها وصار رأس الناس فی العلوم والجدل۔"[1]

معقول و منقول کے فاضل اور اصول و فروع پر چھائے ہوئے تھے .... روافض کی تردید میں ماہر کامل اور انہیں مغلوب کرنے میں مشہور تھے۔ یہاں تک کہ تردیدِ روافض میں وہ ضرب المثل بن گئے اُن کی تحریر عمدہ ہوتی تھی۔ اہل سُنّت والجماعت کی حمایت و نصرت ان کی طبیعت تھی۔ بڑے ذہین، بلند پایہ مناظر اور فصیح البیان تھے۔ دینی و عقلی علوم میں مشغول و منہمک ہو کر بہت سے علوم میں پوری مہارت حاصل کی علوم اور مباحثے میں لوگوں کے

---

[1] اوجز المسالک الیٰ مؤطا مالک: مقدمہ، الطبعۃ الثانیۃ، لکھنؤ ص ۹۶، ۹۷

مولانا رشید الدین بلند پایہ مصنف بھی تھے۔ ان کے استاد حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب اُن کی تحریر سے اس حد تک متاثر تھے کہ فرماتے تھے، "میری تقریر اسماعیل نے لی، تحریر مولوی رشید الدین نے لی۔ اور تقویٰ محمد اسحاق نے لیا۔[۱]" مگر اُن کا سارا تحریری سرمایہ تلف ہوا ہے۔ البتہ راقم ان کی مشہور کتاب "الشوکۃ العمریۃ" کا ایک نسخہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوا ہے چونکہ اس کا تعلق کلامی مباحث سے ہے اس لئے اس کتاب کے تفصیلی تعارف کیلئے کتاب کے دوسرے حصے کا انتظار کرنا ہوگا۔

<u>مفتی صدر الدین خاں آزردہ دہلوی کشمیری</u> | کشمیر الاصل علماء میں جلیل القدر عالم دین تھے۔ منشی محمد الدین فوق نے "مشاہیر کشمیر" میں سب سے پہلے مفتی صدر الدین خاں کے حالات اور کمالات بیان کئے ہیں۔[۲] فوق لکھتے ہیں کہ مولانا لطف اللہ کشمیری نے، جو کشمیر کے اکابرین شہر میں سے تھے شاہ عالم ثانی کے زمانے میں کشمیر سے ہجرت کی اور دہلی وارد ہوئے تھے۔[۳] مفتی صدر الدین صاحب کی ولادت دہلی ہی میں ہوئی۔ یہاں، علومِ عقلیہ کی تحصیل مولانا فضل امام خیرآبادی اور دینی علوم کی تکمیل شاہ رفیع الدین صاحب، شاہ عبدالعزیز صاحب اور شاہ محمد اسحٰق صاحب سے کی، جلد ہی علوم و فنون میں بے مثال جامعیت کے مالک بن گئے اور وقت کے اُن چند فضلائے میں شمار ہونے لگے جن میں "ریاست امارت اور علم و فضل کے ساتھ زاہدوں کا زہد، عابدوں کی

۲: مشاہیر کشمیر، محمد الدین فوق، لاہور ۳: ایضاً
۱: قصص الاکابر از مولانا اشرف علی تھانوی، ص ۱۸، کتب خانہ جمیلی لاہور

سرگرمی، طالب علموں کا انہماک اور شوق مطالعہ اور سپاہیوں کی چستی جمع تھی۔[1] وہ مدرسہ دارالبقاء کے سربراہِ اعلیٰ تھے اور اپنی جیب سے پچاس طلبہ کو وظیفہ دیا کرتے تھے۔ اُن کا ایک عظیم الشان کتب خانہ بھی تھا جنہیں فرنگیوں نے نیلام کیا تھا۔

مفتی صدر الدین صاحب سے ہزاروں علمائے شاگردوں کی حیثیت سے علوم کی تکمیل کی۔ ان میں مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا احمد مظہر نانوتوی اور مولانا خیر الدین (والد مولانا ابوالکلام آزاد) جیسے فضلاء شامل تھے۔ غالب، شیفتہ اور سرسید نے بھی، زمرہ تلامذہ میں شامل نہ ہونے کے باوجود ان سے استفادے کئے ہیں۔ سرسید نے ان کے حالات اس شعر سے شروع کئے ہیں۔

ہزار بار بشویم دہن بمشک گلاب
ہنوز نامِ تو گفتن کمال بے ادبی ست

آگے دعوے کے ساتھ لکھتے ہیں:

"بے شائبہ تکلف و بے آمیزش مبالغہ ایسا فاضل اور ایسا کامل کہ جامع فنونِ شتی و مجمع علوم بے منتہی ہو، جناب سوا اُن کے علمائے روزگار کے بساطِ عالم پر بارہ گر نہیں۔"[2]

وہ اس دور میں صدر الصدور کے معزز منصب پہ سرفراز تھے اور

---

[1] نئی دنیا پہ مسلمان کے عروج و زوال کا اثر، ص ۲۸۱۔
[2] آثار الصنادید، سنٹرل بک ڈپو، اردو بازار ص ۵۲۴۔

خلقِ کثیر کو اخلاص و دیانت سے عدل و انصاف مہیا کیا۔ بغاوتِ ہند (۱۸۵۷ء) میں انہیں بھی خروج و بغاوت کے الزام میں دیگر علماء کے ساتھ قید کیا گیا۔ ان کے املاک ضبط اور کتابخانہ نیلام کیا گیا بعد میں جب رہا کئے گئے تو کچھ املاک لوٹائی گئی مگر انتہائی قیمتی کتابخانہ نہیں ملا جس کا آخر دم تک افسوس رہا۔ ۲۴ ربیع الاوّل ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۵ جولائی ۱۸۶۸ء انتقال کیا[1]۔

مفتی صدر الدین کا تحریری سرمایہ اکثر و بیشتر مفقود ہے۔ اس میں ان کے فتاویٰ تک شامل ہیں۔ پروفیسر محمد شفیع لاہوری مرحوم و مغفور کو ان کا ایک فتویٰ دستیاب ہوا تھا وہ بھی ایک نحوی مسئلے سے متعلق ہے۔ استادِ محترم پروفیسر مختار الدین احمد کو مفتی صاحب کے ایک رسالے "تذکرۂ شعرائے ریختہ" کا ایک حصہ کورپس کرسٹی کالج کیمبرج (انگلینڈ) سے دستیاب ہوا تھا[2]۔ اسی طرح انہوں نے دو دینی مسائل پر دو قابلِ قدر رسالے لکھے ہیں۔ ایک کا نام "الدرّ المنضود فی حکم امرأۃ المفقود" ہے تا حال یہ رسالہ تحقیق کرنے والوں کو حاصل نہیں ہوا مگر راقم کو اس کا ایک نسخہ دستیاب ہو گیا۔ رسالے کا تعلق ایک فقہی مسئلے سے ہے اس لئے اس کا تعارف فقہ کے باب میں پیش کیا گیا۔

---

[1]: نزھۃ الخواطر، ج ۷، ص ۲۲۱ و حدائق حنفیہ، ص ۴۸۱ تا ۴۸۴، گلشنِ بے خار، ص ۱۰ تا ۱۱۔

[2]: اورینٹل کالج میگزین، فروری ۱۹۱۹ء۔ ۳: "تحریر" نمبر ... ۱۹۰۰ء

منتہی المقال دوسرے رسالے کا نام "منتہی المقال فی شرح حدیث لا تشد الرحال" ہے۔ اس رسالے کا موضوع بحث زیارت قبور بالخصوص قبر مبارک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے جواز اور عدم جواز سے ہے۔۔۔ صحیحین میں ایک حدیث جسے حضرت ابوہریرہ اور حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہما جیسے اصحاب رسول روایت کرتے ہیں، ان الفاظ میں وارد ہوئی ہے:

"لا تشد الرحال الا الیٰ ثلاثۃ مساجد، مسجد الحرام و مسجدی ھٰذا والمسجد الاقصیٰ"	تین مسجدوں کے سوا کسی دوسری مسجد کی طرف سفر کا کجاوہ نہ باندھا جائے۔ مسجد حرام، میری مسجد اور مسجد اقصیٰ۔

حافظ ابن تیمیہؒ نے تجدید و اصلاح کے جذبے میں اور علامہ ابن حزم نے اپنی ظاہریت کے زیر اثر اس حدیث سے زیارتِ قبور حرام ٹھہرایا جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مرقدِ مقدس بھی شامل ہے۔ بے شمار علماء نے اس انتہا پسندی کو نامناسب اور نامبارک قرار دے کر زیارتِ قبور کو جائز اور مرقدِ مبارک کی زیارت عینِ سعادت ثابت کیا۔ مفتی صدر الدین صاحب بھی انہی علماء میں شامل ہیں اگرچہ ان کی کتاب میں ابن تیمیہؒ کے تئیں ان کا حسنِ ظن بھی ملتا ہے مگر اس مسئلے میں کتاب کی ابتدا ہی میں ان کے موقف پر اپنی سخت ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔ جب وہ مرقدِ مطہر کی زیارت کا ذکر کرتے ہیں تو محسنِ انسانیتؐ

اور خلاصۂ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا اسمِ گرامی انتہائی عقیدت بھرے الفاظ میں لیتے ہیں:

" اما سفر برائے زیارتِ مرقدِ مطہر منور نبینا افضل الاوّلین والآخرین سید المرسلین امام المتقین حامل لواء الحمد المحجلین رحمۃ للعالمین شفیع المذنبین اول شافع واوّل مشفع یوم الدین علیہ الصلوٰۃ والسلام الیٰ بقاء السماوات والارضین افضل مندوبات بل قریب واجبات ست۔"

ان کی تحقیق کے مطابق ان دونوں بزرگ علمائے نے حدیث کا معنیٰ اور منشا سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ مفتی صاحب کے مطابق اس حدیث کا تعلق نماز سے ہے نہ کہ زیارتِ قبور سے۔ انہوں نے اپنی تحقیق کو احادیث ہی سے مؤید کیا ہے جو صحیح بخاری، صحیح مسلم، نسائی، مسند احمد بن حنبل وغیرہم میں موجود ہیں اور یہ احادیث مذکورہ بالا حدیث کے لئے ایسی تشریح و تفسیر کا درجہ رکھتی ہیں جو دوسرے علمائے کے شروح و تاویلات سے بے نیاز کر دیتی ہیں: " ای تفسیر احسن من تفسیر الحدیث بالحدیث "۔ آگے لکھتے ہیں: کہ حدیث کے جلیل القدر علمائے نے بھی اسے فضیلتِ نماز ہی سے متعلق تسلیم کیا ہے، جن میں امام ابوجعفر طحاوی، علامہ بدر الدین عینی، حافظ ابن حجر عسقلانی، محدث نور الحق بن شیخ عبد الحق محدث دہلوی، ملا علی قاری وغیرہم شامل ہیں

آگے لکھتے ہیں کہ اس حدیث، سے زیارتِ قبور کی حرمت کا معنی اخذ کرنے والے فقرہ، عربیت اور محاوراتِ اہلِ زبان کے مسلم الثبوت اصول و قواعد کی کھلی مخالفت کرتے ہیں۔ حافظ قسطلانی نے اسے نادرست، ابن حجر عسقلانی نے باطل اور نووی نے خطائے فاحش ٹھہرایا ہے۔ زیارتِ قبور کے جائز ہونے کے سلسلے میں انہوں نے مشہور حدیث "انی قد نھیتکم عن زیارۃ القبور فزوروھا" پر نفیس بحث کی ہے۔ جہاں انہوں نے اس حدیثِ پاک کو زیارت قبور کے جائز ہونے پر ایک حکمِ ناطق کی حیثیت رکھنے کا دعویٰ کیا ہے، وہاں بے اعتدال زائرین پر بھی روک لگائی ہے۔

"مقصودِ ما از زیارتِ قبور زیارتی کہ وارد شد بآں سنتِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم یعنی الدعاءُ للاموات والاستغفار لھم وایصال النفع الیھم بالدعاء وتلاوۃ القرآن۔"

مفتی صاحب نے واضح کیا ہے کہ اولیاء کاملین کے فتوح و فیوض حاصل ہونے سے انکار کرنا بھی درست نہیں ہے جو صوفیائے کرام کے نزدیک مشاہدات و محسوسات کی چیزیں ہیں تاہم عوام اور جاہل لوگ جو کچھ زیارت قبور کے دوران کرتے ہیں وہ مذموم اور پایۂ اعتبار سے ساقط ہے۔ مگر ان کی غلط حرکات سے اصل حقیقت کا انکار نہیں کیا جا سکتا ہے انہوں نے ثابت کیا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا یہ معمول تھا کہ جب بھی سفر سے لوٹتے

تو سب سے پہلے مرقدِ انورؐ پر حاضری دیتے تھے، ان میں حضرت عمر اور حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہما بھی شامل ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ کسی بھی قابلِ اعتماد عالم نے اسے ناجائز نہیں ٹھہرایا ہے بلکہ جو لوگ اس کے ناجائز ہونے کے قائل ہیں اور اس پر اصرار کرتے ہیں انہیں ابنِ حجر نے دائرۂ اسلام سے خارج قرار دیا ہے۔

مفتی صاحب کا یہ رسالہ اگرچہ بقامت کہتر ہے مگر ان کے علمی تبحرّ اور جامعیت پر ایک سند کی حیثیت رکھتا ہے اس میں بیسیوں کتابوں کا حوالہ ملتا ہے جن کا تعلق متون اور شروح حدیث، ادب و معانی، تاریخ و تراجم اور منطق و اصول فقہ سے ہے۔ رسالے کے شروع ہی میں استثنا اور استثنا منقطع، قیاس اور اس کے شروط اور جنس کی تعریف میں علمائے اصولِ فقہ اور علمائے منطق کے مابین اختلافات پر ایک ماہر اور مستند فاضل کی طرح بحث کی ہے۔

یہ رسالہ نایاب تھا صرف اس کے کچھ اقتباسات مفتی صاحب کے بعض تلامذہ اور عقیدتمند علماء نے اپنی کتابوں میں نمونے کے طور پر درج کیے تھے۔ اس کا ایک مکمل نسخہ سب سے پہلے عبدالرحمان پرواز اصلاحی صاحب کو دستیاب ہوا تھا، پھر اُستادِ محترم پروفیسر مختار الدین احمد صاحب (سابق صدر شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڈھ) کو بھی اس کا ایک نسخہ حاصل ہوا تھا۔ جس زمانے میں راقم سطور اُن کی نگرانی میں اپنا تحقیقی مقالہ مرتب کر رہا تھا وہ اس رسالے کا تحقیقی متن تیار کر رہے تھے، تاہم وہ ابھی تک یہ اہم علمی کارنامہ شائع نہیں کر سکے۔

محمد بن عنایت دہلوی کشمیری	حضرت شاہ عبد العزیز صاحب دہلوی

کے کشمیری شاگردوں میں شیخ محمد بن عنایت اس اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں کہ اپنی ساری زندگی اپنے ہی اُستاد کی مخالفت میں گزاری، اگرچہ ان کی تعلیم و تربیت سراسر سُنّی علماء کی رہین احسان ہے مگر تحصیل علم کے بعد اپنی ساری صلاحیتیں انہی سُنّی اساتذہ اور سُنّیت کی مخالفت میں صرف کیں اور شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ کے اس مشہور شعر کے صحیح مصداق قرار پائے:

کس نیاموز علم تیر زمن کہ مرا عاقبت نشانہ نکرد

فقہ کے باب میں ہم تفصیل سے اُن کے حالات بیان کر چکے ہیں یہاں صرف اُن کتابوں کے نام درج کئے جاتے ہیں جو انہوں نے علم حدیث میں لکھی ہیں۔ اگرچہ اُن کے تذکرہ نگاروں نے مستقل کتابوں کے علاوہ ضخیم کتابوں کے شروح، حواشی اور تلخیصات اُن کی طرف منسوب کی ہیں مگر اُن کا وجود صرف ناموں تک محدود ہے۔ ان کے تحریری سرمائے سے کہیں کوئی چیز نہیں ملتی ہے۔

(۱) تنبیہ اہل الکمال والانصاف علی اختلاف رجال اہل الخلاف	اس رسالے میں مُصنّف نے صحاحِ ستہ

کے اُن راویوں کو جمع کیا ہے جو جھوٹ، جعل، وضع، ناصبیت، مُرجیت اور قدریت سے متہم ہیں[۱]۔ اس رسالے کے لکھنے سے مصنف کا مقصد حدیث کی اہم ترین کتابوں کو ناقابلِ اعتبار

(۱) معجم المؤلفین، ج ۱۱، ص ۹۹؛ مصفی المقال، ص ۳۶۴-۴۲۷؛ اعیان الشیعۃ ص ۱۷۸؛ نجوم السماء، ص ۳۵۶۔

ثابت کرنا ہے۔

(۲) منتخب کنز العمال | یہ کتاب شیخ علی متقی برہان پوری حنفی (متوفی ۹۷۵ھ) کی مشہور تالیف کنز العمال فی سنن الاقوال والافعال سے اخذ کی ہوئی اُن احادیث کا مجموعہ ہے جو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور اہلِ بیت کے محامد پہ مشتمل ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ اُن احادیث کو بھی چُن چُن کر اکٹھا کیا ہے جن میں مؤلف کے نزدیک اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے معایب و مثالب کی نشاندہی ہوتی ہے۔

اِن دو مستقل کتابوں کے علاوہ صحیح بخاری کی دو مشہور و معروف شرحوں (فتح الباری مؤلفہ شہاب الدین ابو الفضل احمد بن علی معروف بہ حافظ بن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ) اور ارشاد الساری الیٰ شرح البخاری (مؤلفہ حافظ شہاب الدین احمد بن محمد بن ابی بکر قسطلانی مصری متوفی ۹۲۳ھ) ___ اسی طرح شیخ حمیدی کی "الجمع بین الصحیحین" اور امام احمد بن حنبل کی "مسند" کی تلخیصات اُن کی طرف منسوب کی جاتی ہیں، اُن کے خاص عقیدتمند تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ ___ "اُن کی تالیفات و تلخیصات میں سے چند میری نظروں سے گذری ہیں مگر بالآخر نا اہل لوگوں کے ہاتھوں تلف ہو گئیں۔" (۱)

حضرت شاہ عبد العزیز صاحب کے شاگردوں کے شاگرد | حضرت شاہ عبد العزیز صاحبؒ اور اُن کے ممتاز تلامذہ بالخصوص شاہ محمد اسحاق

(۱) : نجوم السماء، ص ۳۶۰۔

دہلوی، مولانا صدر الدین آزردہ دہلوی، مولانا رشید الدین خان دہلوی وغیرہ علماء سے بھی کشمیر کے جویائے علم اپنے اپنے دور میں مستفید ہوتے رہے اور شاہ صاحب کے شاگردوں نے اپنے استاد سے جس قسم کا رنگ اختیار کیا ہوتا تھا اُس سے بھی کشمیر کے یہ طلبار متاثر ہو کر وطن لوٹتے تھے اور اسی کے مطابق دین کی خدمت انجام دیتے تھے۔ حضرت شاہ عبد العزیز صاحب کی علمی اور فکری زندگی کے بہت سے پہلو تھے۔ وہ ٹھیٹھ حنفی، رافضیت کے کٹر مخالف، سلوک و تصوف کے علمبردار اور رسوم و بدعات کے مخالف و معاند تھے۔ اُن کے شاگردوں نے اپنی علمی اور تبلیغی زندگی میں اپنے اُستاد کے اِن اوصاف کو اپنایا اور آگے بڑھایا، اُن سے کشمیر کے فیض یافتگان بھی متاثر ہوئے کشمیر اُس زمانے میں بدعات و خرافات اور رفض و مداہنت کی تاریکی میں گھرا ہوا تھا۔ اس تاریکی کو دُور کرنے میں اِن بزرگوں نے اہم رول ادا کیا، اِن میں حضرت شیخ احمد واعظ کی تبلیغی خدمات لائقِ احترام ہیں جنہوں نے وعظ و تبلیغ کے ذریعہ کشمیر میں فکری بے راہ روی اور مذہبی خُرافات کے خلاف زبان و قلم سے جہاد کا جھنڈا بلند کیا۔ پھر رفض و تشیّع کے دوش بدوش یہاں کی فضا اس دَور میں توحید کے نام پر صوفیائے اسلام سے عمومی بدظنی اور ان کی شان میں بدذہنی سے بھی آلودہ اور مُکدّر کی جاتی تھی۔ حضرت شیخ احمد واعظؒ نے اپنے علمی تبحّر، فکری اعتدال اور روحانی بصیرت سے

اس آلودگی کو دور کیا اور مسلمانوں کو بزرگانِ دین اور صحابۂ کرام کی شان میں گستاخ و جری ہونے کی بیماری سے محفوظ رکھا ان کی تبلیغی سرگرمی کا دائرہ کشمیر تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ کشمیر سے باہر پنجاب اور شمالی ہندوستان کے دوسرے مراکز تک پھیلا ہوا تھا۔ یہاں تک کہ واعظ ان کے نام کا خاص جزو ہی بن گیا۔

شیخ احمد نے فقہ، حدیث، تفسیر، عقائد اور تصوّف کے مختلف موضوعات پر عربی و فارسی میں اسّی سے زیادہ رسالے لکھے ہیں جن میں اب صرف دو چار ہی قلمی صورت میں ملتے ہیں۔ انہی بچے کھچے رسائل سے اُن کی عبقریت اور علمی فضل و کمال کا پورا پورا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کے تحریری سرمائے کا اتلاف یقیناً ایک بڑا علمی خسارہ ہے۔ خاص حدیث میں انہوں نے مُلّا علی قاری کی اربعین کی شرح لکھی ہے جس کا نام "عین الجاری فی شرحِ اربعین القاری" ہے۔ اسی طرح انہوں نے ایک موضوع حدیث پر مستقل رسالے کی شکل میں مفصّل بحث لکھی ہے، ہم نے فقہ کے باب میں اس کا تعارف کرانا مناسب سمجھا۔

شیخ احمد واعظ کے ہم عصر ممتاز ترین کشمیری علماءِ محدثین میں سید سعید اندرابی کا نام بھی قابلِ ذکر ہے۔ وہ شیخ احمد کے اُستاد بھائی بھی تھے۔ انہوں نے درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کے ذریعہ بیش بہا علمی خدمات انجام دی ہیں

عربی میں قرآنِ حکیم کی تفسیر اور خاص حدیث میں قاضی عیاض مالکی کی شفا کی شرح لکھی تھی۔ یہ شرح میرے محترم چچا سید محمد حسن بخاری کی نظر سے بھی گذری ہے، مگر افسوس ان کا سارا تحریری سرمایہ اب معدوم ہے۔ مولانا اندرابی ہی کے اخلاف میں مشہور دیوبندی فاضل مولانا میرک شاہ اندرابی (سابق استاد دارالعلوم دیوبند و اورینٹل کالج لاہور) تھے، جو اپنے علم و فضل میں دارالعلوم کے گنے چنے علماء میں شمار ہوتے تھے۔

حضرت شاہ اسحٰق صاحبؒ کے ایک اور کشمیری شاگرد شیخ احمد ترالی (م ۱۲۹۶ھ) تھے۔[۱] انہوں نے وعظ و تبلیغ کے ذریعہ خلقِ کثیر کو مستفید کیا تھا۔

مولانا عبدالرشید شوپیانی | موصوف شیخ احمد واعظ اور مولانا سید سعید اندرابی کے ہم عصر مگر غیر مقلد عالم تھے۔ اوپر تفسیر اور قرآنی علوم کے باب میں ہم نے ان کے حالاتِ زندگی اور علمی مقام کا قدرے تفصیل سے تعارف کرایا۔ یہاں فنِ حدیث میں اُن کی ایک علمی کتاب نُزُلُ من اتّقی کا تعارف پیش کیا جاتا ہے۔ خوش قسمتی سے اس دور کی علمی کتابوں میں جو چند ہی کتابیں زمانے کے دست و برد سے محفوظ رہ سکیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے؛

حافظ تقی الدین احمد ابن تیمیہ حرانی (م ۷۲۸ھ) کے جدِّ امجد حافظ مجد الدین ابن تیمیہؒ (م ۶۵۶ھ) بلند پایہ فقیہ اور

[۱]: تاریخ حسن، ج ۳، ص ۱۰۱۔

محدث تھے۔ ان کی کتابوں میں "المنتقیٰ من احادیث الاحکام"[1] بڑی اہمیت و وقعت کی حامل کتاب رہی ہے۔ اسی کتاب نے حافظ مجد الدین کو حنبلی مذہب کے ممتاز ترین فقہاء کے محققین کی صف میں شامل کیا ہے۔ شیخ محمد بن علی شوکانی یمنی (م ۱۲۵۰ھ) نے اس کتاب کی بسیط شرح نیل الاوطار کے نام سے لکھی جو پہلی مرتبہ مصر سے پانچ جلدوں میں شائع ہوکر مقبولِ عام ہوئی۔

نواب سید صدیق حسن خان نے ہندوستان میں المنتقیٰ شائع کرنے کا ارادہ کیا تو پہلے اپنے علمی معاون مولانا عبد الرشید شوپیانی کشمیری سے اس پر ایک مبسوط مقدمہ لکھوایا اس زمانے میں مولانا موصوف ابھی نواب صاحب کے عتاب کے شکار نہیں ہوئے تھے۔ مولانا نے یہ مقدمہ بڑی محنت سے لکھا اور علم حدیث میں اپنی اچھی صلاحیت کا ثبوت پیش کیا یہاں تک کہ علامہ عبد الحی حسنی نے ہندوستان میں طبقات العلماء پر لکھی ہوئی جیدہ کتابوں میں اس کو بھی شامل کیا ہے۔

یہ مقدمہ ایک فاتحہ، تین افادات اور ایک خاتمے پر مشتمل ہے۔ فاتحہ مسلکِ اہلِ حدیث کی اہمیت و عظمت، اس کے مدارج و مراتب اور اس کے سرچشمے کے تعین سے تعلق رکھتا ہے۔ اس میں انہوں نے اپنے مسلکی تعصب و تصلب سے کبھی پردہ اٹھایا ہے۔ وہ دوسرے مذاہب فقہیہ کو خاطر میں

(۱): فیض الباری علی صحیح البخاری، ج ۱، مقدمہ مولانا بنوری، مد ظلہ

نہیں لاتے ہیں، اور کچھ اس قسم کا تاثر دیتے ہیں کہ گویا دینی علوم پر صرف انہی کے ہم مسلک علماء کی اجارہ داری ہے۔

افادات ثلاثہ میں انہوں نے کتاب کی اہمیت، مصنف کے فضل و کمال، علم حدیث کی بزرگی، محدثین کی بے لوث خدمات اور کچھ فنی مباحث پر روشنی ڈالی ہے۔ یہی حصہ زیادہ مبسوط ہے اور بڑی محنت سے لکھا گیا ہے۔

خاتمے میں نواب صدیق حسن خاں کی علمی خدمات اور سرپرستی نیز اپنا مختصر تعارف کرایا ہے۔ آگے ۱۳۵ اشعار پر مشتمل ایک بسیط عربی قصیدہ لکھا ہے جو اُن کی عربی دانی اور عربی میں شعر گوئی کی صلاحیت کا واضح ثبوت ہے۔ یہاں اس قصیدے کے ابتدائی دو شعر نقل کیے جاتے ہیں:

حیا الالٰہ مرابع الجیران　　کنا بہا نلھو مع الغزلان

"خدا ہمسایوں کی جگہوں کو سیراب کرے جہاں ہم معشوقوں کے ساتھ کھیلا کرتے تھے۔"

ونقیل عند اباطح حصیاتھا　　ازدنت بدر فی نحور غوانی

"اور ہم نشیبی زمینوں کے سنگریزوں کے قریب قیلولہ کیا کرتے تھے ان کی چمک ایسی لگتی تھی گویا گانے والی حسیناؤں کے سینوں پر ہار۔"

میری کتاب (المنتقیٰ) اس مقدمے کے ساتھ ۱۲۹۷ھ میں مطبع فاروقی دہلی سے شائع ہوئی۔ مقدمہ بڑے سائز کے ۳۵ صفحات میں پھیلا ہوا ہے اگر اسے موجودہ دور کی متوسط

تقطیع کی کتابی صورت میں شائع کیا جائے تو کم از کم دو سو صفحات کی کتاب وجود میں آئے گی۔

بیسویں صدی کی ابتدا میں ہندوستان میں علم حدیث کی تدریس و تحقیق کے بڑے بڑے مرکز وجود میں آئے تاہم ان سب میں دارالعلوم دیوبند نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری اسلامی دُنیا میں ممتاز اور منفرد مقام حاصل کر گیا۔ دارالعلوم نے اپنے عروج اور مقبولیت عامہ کے زمانے میں جو نامی گرامی شخصیتیں پیدا کیں، ان میں علامہ محمد انور شاہ کشمیری رحمتہ اللہ علیہ کی شخصیت بھی تھی بلکہ شاہ صاحب اپنی بعض خداداد صلاحیتوں کے بدولت اپنی نظیر صرف آپ تھے۔ انہوں نے تیس سال تک حدیث کا درس دیا۔ صحیح بخاری، جامع ترمذی اور ابو داؤد پر اُن کی محققانہ تقریریں علمی حلقوں میں بہت ہی مشہور و مقبول ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے سینکڑوں احادیث کی تحقیق میں بیسں چھوٹے بڑے رسائل لکھے ہیں۔ وہ ہزاروں احادیث کے حافظ اور حفاظ حدیث کی تحقیقات کے امین تھے۔ انہوں نے ایسے سینکڑوں محدثوں کو تیار کیا جنہوں نے برِاعظم ایشیا میں اس فنِ شریف کی بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔ اس کی پوری تفصیل کے لئے ہماری کتاب "علامہ محمد انور شاہ کشمیری، شخصیت اور علمی کمالات" مطالعہ کی جائے۔

دارالعلوم دیوبند، بالخصوص علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ
سے بہت سے کشمیری طلباء نے فیض حاصل کیا ہے۔ ان میں
مولانا سید میرک شاہ اندرابی کشمیری، مولانا سیف اللہ شاہ
صاحب کشمیری، مولانا محمد یوسف شاہ صاحب میر واعظ
اور مولانا عبدالکبیر صاحب مشہور ہوئے۔ مولانا سیف اللہ
شاہ صاحب اور مولانا عبدالکبیر صاحب نے کوئی خاص تحریری
یادگار نہیں چھوڑی ہے۔ البتہ مولانا میرک شاہ اندرابی مدرس
کے ساتھ ساتھ صاحب قلم بھی تھے۔ انہوں نے بعض اہم علمی اور ادبی
موضوعات پر قابل قدر مضامین لکھے ہیں۔ حدیث میں امام مالک کی
موطا پر حاشیہ لکھا ہے جو غیر مطبوعہ ہے۔

مولانا یوسف شاہ صاحب اور ان کے رسائل | مولانا یوسف شاہ صاحب
میر واعظ نے بھی تدریسی اور تالیفی خدمات انجام دی ہیں۔ وہ
اورینٹل کالج نصرۃ الاسلام سرینگر کے صدر مدرس تھے اور یہاں
سنن ترمذی کا درس دیتے تھے انہیں عربی اور اردو میں
لکھنے کی صلاحیت بھی تھی۔ اگر وہ اپنی زندگی کو علم کی خدمت
تک ہی محدود رکھتے تو یقیناً قابل قدر خدمات انجام دیتے،
مگر افسوس وہ سیاست میں بھی داخل ہوئے اور اس خارزار
میں اس طرح الجھ گئے کہ ایک طرف علم کو بھی ہمیشہ کے لئے خیرباد
کہنا پڑا اور دوسری طرف سیاسی میدان میں بھی کوئی قابل ذکر کام
انجام نہ دے پائے۔

تنویر المصابیح | مولانا یوسف شاہ صاحب نے عربی زبان میں

رکعاتِ تراویح کی تحقیق میں "تنویر المصابیح" کے نام سے مختصر مگر علمی رسالہ لکھا ہے۔ اُن کے دور میں کشمیر قابلِ اعتماد علماء سے تقریباً خالی ہو چکا تھا اور غیر مقلد مبلغوں کے لیے میدان ہموار تھا۔ مستند علماء کشمیر دہلی، دیوبند، لاہور، لکھنو وغیرہ کے علمی اداروں کی زینت بنے ہوئے تھے۔ چونکہ مولانا یوسف شاہ صاحب کشمیر کے "موروثی واعظ" بھی تھے اس لئے انہیں لازماً کشمیر میں بھی ٹھہرنا پڑتا تھا۔ مولانا یوسف شاہ صاحب دیوبند کے فارغ التحصیل اور حضرت علامہ انور شاہ صاحب کے شاگرد بھی تھے۔ وہ اپنے اسلاف و اکابر کی طرح حنفی اور اسی مسلک کے مطابق تبلیغ دین کرتے تھے۔ چنانچہ "تنویر المصابیح" میں بھی انہوں نے احادیث و آثار اور فقہاء و محدثین کے نقول و تحقیقات سے اپنے مسلک کی ترجیحات کو مبرہن کیا ہے، انہوں نے یہ رسالہ اہلِ وطن کے لئے لکھا ہے اور اس سے یہیں کے غیر مقلدوں کی تنبیہ مقصود تھی تاہم انہوں نے کہیں بھی ان کا نام نہیں لیا ہے۔ بلکہ ایک جگہ انہوں نے "بعض غیر المقلدین من سکان الدھلی" ص ۵۲ لکھکر اپنے ہم وطن مخالفین کے ساتھ اُلجھنے سے اپنے آپ کو بچانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اس مختصر رسالے میں انہوں نے فقہ و حدیث کے متون و شروح کی چوٹی کی کتابوں کے نقول پیش کیے ہیں اور مسئلۂ تراویح کے تمام اہم گوشوں پر مفصل روشنی ڈالی ہے۔ انہوں نے تمام علماء کا نام ادب و احترام سے لیا ہے۔ یہاں تک کہ حافظ ابن تیمیہؒ کے لئے الامام اور شیخ الاسلام اور

اور علامہ ابن قیم کے لئے الحافظ المحقق کے القاب استعمال کئے ہیں۔ یہ وسعتِ قلبی انہوں نے اس ماحول میں دکھائی ہے جب عدم تقلید کا ہر ایک داعی اپنے آپ کو منبر و محراب پر امام ابوحنیفہ سے بزرگ تر ہونے کا کھلم کھلا مدعی تھا۔ اسی طرح انہوں نے ممتاز ترین غیر مقلد علماء جیسے قاضی شوکانی اور نواب صدیق حسن خان پر بھی عملاً اعتماد کیا ہے۔ رسالے کے آخر میں انہوں نے مخالفین پر زور دیا ہے کہ وہ تراویح کے مسئلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفاء اور اصحاب کی سنت پر عمل کریں، اور معاندانہ روش اختیار کرنے سے گریز کریں۔

واما من اتبع الھویٰ	اور جس نے خلفاء کی سنت
لغیٖ مخالفۃ سنۃ الخلفاء	کی مخالفت کرتے ہوئے خواہشات
فقد لھیٰ ولغیٰ وضل	کی پیروی کی اس نے کجروی،
وغویٰ، ولم یعمل بقول	گمراہی اور بے ہودگی اختیار
المصطفیٰ اقول لہٗ یا	کی اور ہرگز پیغمبر اسلامؐ کے
ایھا السالک بغیر بصیرۃ	ارشاد پر عمل نہیں کیا۔ ایسے
فی اللیل الحالک	ایسے شخص سے کہتا ہوں کہ
حفظت شیئاً غابت	اے تاریک رات کے نابینا
عنک أشیاء الا ترجع	مسافر! ایک چیز کیلئے تم نے
الی اختارہ الصحابۃ	کئی چیزوں کو کھو دیا کیا تم
والتابعون والمجتھدون	اس کی طرف نہیں دیکھ پاتا
والمحدثون والذین اتت	ہے جو صحابہ، تابعین،

من معاصر لهم مقلدون۔ اللّٰھم اجعلنا بسنّتہ و سنّۃ خلفائہ من العاملین و بھدیہ و ھدیھم من التابعین آمین یارب العالمین (ص ۲۳)

مجتہدین، محدثین نے اور ان لوگوں نے، جن کی تم اور تمہارے ساتھی پیروی کرتے ہیں، اختیار کیا ہے۔ اے اللہ ہمیں اپنے نبی اور ان کے خلفاء کی سنت پر عمل کرنے اور ان کی سیرت کی پیروی کرنے کی توفیق عطا فرما۔ آمین یارب العالمین

الضمیمہ اس رسالے کے آخر پر انہوں نے عربی زبان ہی میں ایک اور مختصر رسالہ شامل کیا ہے جس میں خطبۂ جمعہ کو عربی کے بجائے کسی دوسری زبان میں پڑھنے کو بدعت سیئہ ثابت کیا ہے اور اس کی زبردست مخالفت کی ہے۔ انہوں نے احادیث آثار صحابہ اور سلف و خلف کے تعامل کی روشنی میں عیدین اور جمعہ کے خطبے کے لئے صرف عربی زبان کا ہونا ضروری ثابت کیا ہے جن علماء کے نقول سے انہوں نے استشہاد کیا ہے ان میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور حضرت مولانا عبدالحی صاحب لکھنوی بھی شامل ہیں۔ انہوں نے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی مصفّیٰ شرح مؤطا کے درج ذیل اقتباس کو عربی میں منتقل کر کے پیش کیا ہے:

ولما لاحظنا خطب النبی صلی اللہ علیہ وسلم

جب ہم نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم آپ کے خلفاء اور

وخلفائه رضی اللّٰہ عنہم
وھلمّ جرّا فتتبعتھا
وجود اشیاء فیھا
الحمد، والشھادتین،
والصّلوٰۃ علی النبیّ صلّی
اللّٰہ علیہ وسلّم والامر
بالتقوٰی وتلاوۃ آیۃ
والدعا للمسلمین
والمسلمات وکون الخطبۃ
عربیّۃ ...... امّا کونھا
عربیّۃ فلاستمرار
عمل المسلمین فی المشارق
والمغارب مع انّ فی کثیر
من الاقالیم کان المخاطبون
اعجمیین۔" (ص ۹۷)

دوسرے اکابر کے خطبات
کا مطالعہ کرتے ہیں تو ان
میں کچھ چیزوں کا وجود
منقح ہو کر سامنے آتا ہے۔
ان میں حمد، شہادتین، نبی
پر درود، پرہیزگاری کا حکم،
قرآنی آیات کی تلاوت، مسلمان
مردوں اور عورتوں کے لئے
دعائے خیر اور خطبے کا عربی
میں ہونا شامل ہے......
جہاں تک خطبے کا عربی میں
ہونے کا تعلق ہے تو مشرق و
مغرب کے مسلمانوں کا اسی پہ
عمل رہا ہے حالانکہ اکثر سامعین
غیر عرب ہونے کی وجہ سے
عربی نہیں جانتے تھے۔

رسالے کے آخر میں بڑے تعجب کے ساتھ لکھتے ہیں کہ وہ لوگ جو بیس رکعت تراویح کا انکار کرتے ہیں جو ایک سنّت مؤکدہ ہے وہ خطبۂ جمعہ کا ترجمہ کرکے کیسی ہمت سے بدعت سیئہ کا ارتکاب کرتے ہیں۔

والعجب کل العجب من
الذین یھدیھم جہلھم

سب سے زیادہ تعجب ان لوگوں
پر ہے جنہیں ان کی جہالت

الى اتباع الهوى يعرضون
اداء صلوٰة التراويح
بعشرين ركعة مع كونها
سنة مؤكدة متوارثة
من السلف والخلف كما
اثبتناه بالدلائل القوية
من الاحاديث والآثار
الصحيحة ويترجمون
الخطبة مع كونها بدعة
سيئة مخترعة لا ثبوت لها
عند القرون المشهود
لهم بالخير والصلاح
كما بيّن مبرهنا بالدلائل-
فاوصيهم بتقوى الله
وترك الجهل والاتباع
بالسلف، لان الخير كله
في الاتباع لهم كما
قال الله تعالى والذين
اتبعوهم باحسان رضي
الله عنهم ورضوا عنه-
اللهم احشرنا معهم

خواہشات کی پیروی کرتے ہیں
یہ لوگ بیس رکعت تراویح
ادا کرنے سے منہ موڑتے ہیں
حالانکہ یہ سنت موکدہ ہے
اور جیسا کہ ہم نے احادیث
اور آثار سے ثابت کیا ہے
کہ سلف و خلف کا اسی پر
ہمیشہ سے عمل رہا ہے پھر دوسری
طرف یہی لوگ خطبے کا ترجمہ
سناتے ہیں جو ایک بدترین بدعت
ہے جس کا خیر و صلاح والے
ادوار میں کوئی ثبوت نہیں ملتا
ہے جیسا کہ براہین سے ہم نے
ثابت بھی کیا ہے، تو میں ایسے
لوگوں سے خدا سے ڈرنے،
جہالت چھوڑنے اور بزرگوں
کی پیروی کرنے کا مشورہ دیتا
ہوں کیونکہ ساری بھلائی
انہی کی پیروی میں ہے۔
جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد
ہے: "والذین

برحمتک یا ارحم الراحمین۔ (ص ۹۲-۹۳)

اتبعوھم باحسان رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ
اے خدا ہمیں انہی میں شامل کر اور انہی کے ساتھ اُٹھا۔

فقہ اور فقہی تالیفات

فقہ اور فقہی تالیفات

کشمیر میں نمایاں طور پر دو فقہی مکتب رائج ہیں، حنفی اور اثنا عشری۔ موقع و محل کی مناسبت سے یہاں پہلے کشمیر میں فقہ حنفی کی اشاعت کا سرسری جائزہ لیا جاتا ہے۔ اس کے بعد ان فقہی کتابوں کا تعارف پیش کیا جائے گا، جو کشمیر میں تالیف ہوئی ہیں۔

کشمیر کے مسلمان مؤرخین کی صراحت کے مطابق جو پہلے صوفی مبلغ کشمیر وارد ہوئے، وہ حضرت شیخ شرف الدین عبدالرحمن رح (عرف بلبل شاہ) تھے اور وہ مسلکاً حنفی تھے۔ انہوں نے حنفی مسلک ہی کے مطابق کشمیر کے نومسلموں میں عبادات و معاملات کی تعلیم و تلقین کی، ان کے انتقال کے تقریباً نصف صدی بعد مبلغ شہیر حضرت میر سید علی بن شہاب الہمدانی رح (م ۷۸۶ھ) وارد کشمیر ہوئے۔ ان کے بارے میں علماء اور مؤرخین متفق ہیں کہ مسلکاً شافعی تھے مگر جب انہیں اپنے پیش رو مبلغ سید شرف الدین عبدالرحمن کے بارے میں معلوم ہوا کہ انہوں نے حنفی مسلک کے مطابق کشمیر میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت کی ہے، تو انہوں نے بھی اسی کے مطابق اپنا مشن آگے بڑھایا۔ وہ بڑی کامیابی کے ساتھ شافعی مسلک کے مطابق اسلام کی تبلیغ و اشاعت کر سکتے تھے، مگر ان کی غرض و غایت فقہی اختلافات سے بلند و بالا ہو کر اسلام کی بے لوث خدمت کرنا

تھی۔ اس لئے انہوں نے اختلافات سے بڑی کامیابی کے ساتھ اپنا دامن بچایا اور اپنی چھوٹی بڑی سینکڑوں کتابوں میں ایک جگہ بھی کسی فروعی مسئلے کو نہیں چھیڑا۔ اس حکمت و فراست کا نتیجہ یہ نکلا کہ کشمیر کی سرزمین سالہا سال تک مسلکی نزاعات اور مخمصوں سے محفوظ و مصؤن رہی ــــ خود لارنس Wallar Lawrance نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے۔[۱] تاہم اس کا یہ قول صحیح نہیں ہے کہ کشمیر میں سلسلۂ کبرویہ سے تعلق رکھنے والے مشائخ شافعی ہیں۔ حضرت شیخ یعقوب صرفی رح کشمیر میں سلسلۂ کبرویہ کے مبلغ اور مجدد تھے، مگر وہ حنفی مسلک کے سخت مقلد تھے۔ ممکن ہے کہ قدماء میں کوئی ایسا بزرگ گزرا ہو جس نے سنت کے کمال اتباع میں چند مسائل میں شافعی مسلک پر بھی عمل کیا ہو گا۔ جیسا کہ ملا عبدالرزاق گوجواری کے بارے میں منقول ہے۔ مؤرخ محمد اعظم دیدہ مری جنہوں نے اپنے شیخ طریقت محمد مراد نقشبندی کی معیت میں ان سے ملاقات کی تھی، لکھتے ہیں: کہ اگرچہ کچھ لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ انہیں شافعی مذہب کی طرف کامل رغبت تھی مگر اکثر لوگ یہی کہتے ہیں کہ شدت احتیاط کی بناء پر بعض مسائل میں فقہ شافعی پر عمل کرتے تھے۔

"اکثرے مے گویند کہ بناء بر شدت احتیاط گاہے بعض اعمالِ شافعیہ مباشرت مے نمود"[۲]

---

[۱]: The Valley of Kashmir, P. 285

[۲]: تاریخ اعظمی، ص ۲۱۵ -

گویا اس کی مثال شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ یا شیخ نظام الدین اولیاءؒ جیسے بزرگوں کی ہے، جو مسلکاً حنفی تھے مگر قرأت خلف الامام پر بھی عامل تھے۔[1] پروفیسر ادیب الحسن صاحب نے مولانا جعفر بدخشی (مرید و مجاز حضرت سید علی ہمدانیؒ) کے حوالے سے لکھا ہے کہ وہ پہلے حنفی تھے، پھر شافعی مسلک اختیار کیا، تاہم اپنے مریدوں اور عقیدت مندوں کو اپنا مسلک ترک کرنے نہیں دیتے تھے۔[2] اس تبدیلی مسلک کی وجہ شاید یہ رہی ہوگی کہ حضرت سید علی ہمدانیؒ کو حضرت شیخ نجم الدین کبریٰؒ کی ذات سے والہانہ عقیدت تھی، اور وہ سلسلۂ کبرویہ کے ممتاز مبلغ بھی تھے۔ حضرت شیخ کبریٰ مسلکاً شافعی تھے۔[3] اس زمانے میں مرید اپنے مرشد کی پوری پوری متابعت میں ایسا کرتے تھے۔ چنانچہ اسی زمانے میں حضرت چلپی حسام الدینؒ نے بھی جو مذہباً شافعی تھے، اپنے مرشدِ نامدار حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ سے جو حنفی تھے حنفی مسلک اختیار کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی مگر مولانا نے انہیں ایسا کرنے سے روکا تھا۔[4]

جب حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانیؒ کشمیر تشریف لائے تو گویا اس

---

[1]: نزہۃ الخواطر، ج ۲، ص ۲۵۷۔

[2]: Kashmir under the Sultans, P. 57-58

[3]: حضرت شیخ کبریٰ خیوق، گاؤں کے رہنے والے تھے، اس گاؤں کے سارے باشندے شافعی تھے؛ معجم البلدان، یاقوت الحموی الرومی، ج ۳، عنوان "خیوق"۔

[4]: صاحب المثنوی، قاضی تلمذ حسین صاحب، ص ۲۳۷۔

وقت یہاں اسلام داخل ہو چکا تھا اور پھیل بھی چکا تھا۔ مگر شیخ شرف الدین کے نقوش دھندلے ہو گئے تھے اور مسلمان صرف نام کے مسلمان رہ گئے تھے جو تمام غیر شرعی رسوم و عادات پر عمل کرتے تھے۔ اس کا اندازہ اس بات سے ہوگا کہ سلطان قطب الدین جس نے حضرت امیر کبیرؒ کا ان کے ورود کشمیر پر پُرتپاک اور والہانہ استقبال کیا تھا، مسلمان ہونے کے باوجود اس بنیادی مسئلے کی اہمیت و نزاکت سے بھی آگاہ نہ تھا کہ اسلام میں ایک ساتھ دو سگی بہنوں کو نکاح میں رکھنا قطعاً حرام ہے۔

مسلک اہلحدیث کی اشاعت | اس طرح پورے پانچسو سال تک کشمیر کے مسلمان فقہ حنفی پر عامل رہے۔ بیسویں صدی کی ابتدا میں جب عدم تقلید کے رجحان نے ایک تحریک کی صورت اختیار کرلی، تو کشمیر بھی متاثر ہوا۔ میاں نذیر حسین صاحب دہلوی اور نواب صدیق حسن صاحب قنوجی کے فیض یافتہ لوگوں نے کشمیر میں اس کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا اور بہت سے کشمیری مسلمانوں نے غیر مقلدیت اختیار کرلی۔ مؤرخ مرحوم غلام حسن لکھتے ہیں:

خصوصاً فی زماننا سید صدیق حسن خان نواب بھوپال کہ از علمائے برجستۂ روزگار است در اشاعت ایں ملت مجتہد وقت شدہ۔ در وثوق ایں ملت و توہین مذاہب اربعہ و تردید

اس وقت خصوصی طور پر نواب صدیق حسن خان، جو عصر حاضر کے زود نگار علماء دین ہیں اس مذہب کی اشاعت میں مجتہد ثابت ہوئے۔ موصوف نے غیر مقلدین کی توثیق، مذاہب اربعہ کی توہین اور مقلدین کی

[^1] تردید میں کئی دفتر لکھ ڈالے ہیں۔

مؤرخ مرحوم آگے لکھتے ہیں:

"نواب صاحب نے اپنی تصانیف مواخات و مواسات کے بہانے سے کشمیر کے کچھ لوگوں کو بھیجی ہیں، جن میں حسین بٹ کو نام کے ایک شخص نے دہلی جا کر میاں نذیر حسین سے استفادہ کیا پھر وہاں سے عدم تقلید کا مبلغ بن کر کشمیر لوٹا مگر جب شہر (سرینگر) میں اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوا تو شوپیان (اسلام آباد) گیا، اور اپنے مسلک کی تبلیغ میں مصروف ہوا۔ یہاں فوراً دو سو آدمی اس کے پیرو ہوئے"[^2]

نواب صاحب مرحوم کی مسلسل کوششوں اور میاں صاحب محدث کے تلامذہ کی سرگرمیوں سے پہلے شوپیان اور اس کے ملحقہ دیہاتوں میں مسلک اہلحدیث سرعت سے پھیلا اور پھر آہستہ آہستہ دوسرے اضلاع میں بھی شائع ہوا۔ آج بھی اگرچہ کشمیر کے سُنّی مسلمانوں کی بھاری اکثریت حنفی مذہب پر ہی عامل ہے۔ تاہم اہلحدیث مسلک کے پیرو بھی ہزاروں کی تعداد میں موجود ہیں۔

اس تمہید کے بعد چند علمائے کشمیر کی اہم ترین فقہی تصانیف کا تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

ملا احمد علامہ اور الفتاوی الشہابیہ | ملا احمد صاحب علم بزرگ تھے جو حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانی سے کچھ پہلے اور حضرت سید شرف الدین عبدالرحمٰن (بلبل شاہ) کے کچھ بعد کشمیر وارد ہوئے تھے

[^1]: تاریخ حسن، ج ۱ ص ۴۴۔
[^2]: ایضاً

اور اپنے علم وفضل سے بہت جلد سلطان شہاب الدین شاہمیری کے ممتاز درباری عالم بن گئے اور شیخ الاسلام کا خطاب پایا، یہ شاید کشمیر کے پہلے سرکاری شیخ الاسلام تھے ان کے روحانی مرشد حضرت سید شرف الدین عبدالرحمٰن (بلبل شاہ) تھے جن کے مقبرہ میں وہ دفن بھی ہوئے۔

مُلّا احمد کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ ان میں الفتاویٰ الشہابیہ کشمیر میں بڑی مقبول ہوئی، یہ کتاب انہوں نے کشمیر کی اسلامی سلطنت میں سلاطین اور حکام کی رہنمائی کے لئے لکھی اور سلطان شہاب الدین کے نام پر معنون کی، پروفیسر صاحبزادہ حسن شاہ صاحب اس کتاب کی اہمیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وَتمّ فی هذا الزمان	
تقریباً تدوین مجموعة	تقریباً اسی زمانے میں کشمیر
الاولیٰ لقانون کشمیر	کے لئے قانون کا ایک مجموعہ
وَسُمّیت بالفتاوی الشهابیة	بھی مرتب ہوا جس کا نام فتاویٰ
وَبفضلها کان تنفیذ	شہابیہ رکھا گیا اسی کی بدولت
القانون الاسلامی فی کشمیر	کشمیر میں قانون اسلامی کا نفاذ
واصبح الاسلام سائداً علیٰ	عمل میں آیا اور اسلام
حیاتها العامة وسیاستها۔ [1]	سیاسی اور معاشرتی زندگی
	پر غالب آگیا۔

---

[1]: دیکھئے مقالہ: الارتقاء الثقافی بکشمیر فی عہد السلاطین "مجلہ ثقافۃ الهند" دہلی بابت جون ۱۹۶۵ء۔

تنویر السراج | سلطان سکندر کشمیری کے عہدِ حکومت میں جو ممتاز علماء وسطِ ایشیاء سے کشمیر وارد ہوئے تھے، ان میں حضرت سید احمد سامانی رح نامی ایک بزرگ بھی تھے۔ انہوں نے اپنی زیرِ تبصرہ کتاب کی ابتداء ہی میں لکھا ہے کہ "میں نے سلطان کی علم دوستی اور علماء نوازی کا شہرہ سُن کر ہی اس ملک کی جانب عزم کیا۔ چونکہ سلطان سکندر تک پہنچنے کے لئے کوئی رسائی نہیں تھی۔ اس لئے میں نے فرائض و میراث کے مشہور و مقبول رسالہ سراجی کی عربی زبان میں شرح لکھی اور مکمل کرنے کے بعد یہ شرح سلطان کی خدمت میں پیش کی ہے۔" مؤلف نے اس میں اپنی زندگی کے کسی گوشے پر روشنی نہیں ڈالی ہے البتہ انہوں نے اپنا پورا نام احمد بن محمود بن کمال الدین السامانی لکھا ہے۔ اپنی علمی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرنے کے لئے سراجی کو ترجیح دینے کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ اس میں سخت ایجاز ہے اور مسلمانوں کے لئے میراث کے مسائل سے جانکاری حاصل کرنے کے لئے اس کی شرح و تفصیل کی ضرورت تھی۔ نیز سراجی کے مؤلف ابوالمعالی محمد بن عبدالرشید السجاوندی نے اس میں کچھ اہم اصول و قواعد کی طرف خفیہ اشارے کئے ہیں، ان کی وضاحت بھی ضروری تھی۔ مزید برآں سراجی کے ایک شارح علامہ بہشتی اسفرائنی نے اس پہ جو اعتراضات کئے ہیں ان کا جواب دینا بھی ایک علمی فریضہ تھا۔

یہ شرح شارح کے عظیم المرتبت عالم ہونے کا ایک روشن

ثبوت ہے اسی سے اُن مہاجر علماء اور صوفیائے کرام کی عظمت و فضیلت کا بھی آسانی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے جو اُس زمانے میں ایک نوزائیدہ مسلمان مملکت میں تشریف لائے تھے اور جن کی مساعی سے کشمیر اسلامی مذہب اور اسلامی فکر و ثقافت کا بہت جلد مرکز بن گیا تھا۔ اس شرح میں شیخ احمد سامانی نے فقہ اور عربیت میں اپنی بصیرت و مہارت کا ثبوت پیش کیا ہے۔ انہوں نے سلیس عربی زبان میں جمع و تقسیم، تفریق و ضرب کی مدد سے میراث کے مسائل واضح کئے ہیں۔ کہیں اکابر علماء سے اختلاف کیا ہے اور اپنا موقف دلائل سے مدلل کرنے کی کوشش کی ہے۔ کتاب کی ابتداء ان الفاظ سے ہوتی ہے :

" الحمد لِلّٰہ الذی توحّدَ بالعظمۃ والکبریاء وتفرّدَ بوجوب الوجود والبقاء وَمَنْ سِواہُ فیتجرّع مِنْ کوسِ الفناءِ والسلام علی رسولہٖ محمد سیّد الانبیاء وسَنَدِ الاولیاء وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ خیرالبریۃ والاتقیاء "

رسالہ کا اختتام ان الفاظ پر کیا ہے :

" ھذا آخر ما اردنا ایرادہٗ حامداً لِلّٰہِ و مصلّیاً علیٰ رسولہٖ محمّد وعلیٰ آلِہٖ واصحابہٖ اجمعین ۔ "

اس شرح کا ایک عمدہ نسخہ ریاست جموں و کشمیر کی ریسرچ لائبریری میں زیر نمبر ع ۱۱۳ موجود ہے۔ جو ۱-۲۲/۲-۱۳ سم کے ۲۰۶ صفحات

پر مشتمل ہے۔ حضرت شارح سرینگر میں حضرت سید محمد خاوریؒ کے مزار سے متصل مدفون ہیں۔

قاضی حیدر اور فتاویٰ عالمگیری: علمائے کشمیر نے مغل عہد میں فقہ کی اچھی خدمت انجام دی ہے اور اس دور میں بعض علمائے کشمیر اپنی فقہی بصیرت کی بنا پر بیرونِ کشمیر بھی مشہور ہوئے اور ہندوستان کے مختلف مقامات میں قاضی، قاضی القضاۃ، میرِ عدل وغیرہ اہم مناصب پر فائز ہوئے۔ یہاں تک کہ بعض عورتیں بھی فقہ میں غیر معمولی دلچسپی لینے لگی تھیں۔ حافظ خدیجہ بنت عبد الفتاح مشکوٰۃ المصابیح اور حصن حصین کے ساتھ قدوری پر بھی دبدبہ نظر رکھتی تھیں[۱]۔ اسی عہد کے ایک نامور کشمیری عالم قاضی حیدر بھی تھے جو علمائے ہند میں بڑی قدر و منزلت رکھتے تھے۔

قاضی حیدر "قاضی خان" کے لقب سے بھی مشہور ہیں، ان کی وفات ۱۱۲۱ھ میں ہوئی۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد شاہجہان آباد دہلی آئے جہاں سعادت خان صدر الصدور کی وساطت سے اورنگ زیب عالمگیر کے دربار میں رسائی حاصل کی۔ کچھ مدت بعد اپنے علم و فضل کی بدولت دہلی کے قاضی بھی مقرر ہوئے[۲]۔ وزیر آباد کے امیر سے بھی گہرے تعلقات تھے، اورنگ زیب نے انہیں قاضی خان کا لقب دیا تھا[۳]۔

---

[۱] کشمیر میں فارسی ادب کی تاریخ، پروفیسر عبد القادر سروری، ص ۱۳۔
[۲] تذکرہ علمائے ہند، مولوی رحمان علی صاحب، ص ۵۴۔
[۳] The contribution of India to Arabic Literature by Dr. Zubid Ahmad; Introduction P. 27

عالمگیری یا الفتاویٰ الہندیہ اورنگ زیب کا عظیم الشان علمی کارنامہ سمجھا جاتا ہے، جو سینکڑوں علماء پر مشتمل ایک اکیڈمی کی کوششوں سے وجود میں آیا ہے۔ اس کتاب کے اکثر مرتبین کے نام ابھی تک پردۂ خفا ہی میں ہیں۔ مؤرخین لکھتے ہیں کہ ان علماء کی تعداد پانچسو تھی۔ مولانا عبدالحی حسنی صاحب مرحوم نے جن بیس علماء کی نشاندہی کی ہے[۱] ان میں کشمیر کا کوئی عالم نہیں ہے۔ مگر مؤرخین کشمیر کی تصریح کے مطابق قاضی حیدر بھی اس اکیڈمی کے ایک رکن تھے۔ علاوہ ازیں تاریخی حیثیت سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچی ہوئی ہے کہ کشمیر کے کئی اہلِ علم اور ادباء و حکماء کو عالمگیر اور اس کے پیشرو مغل سلاطین کے دربار میں بڑی عزت و قربت حاصل تھی۔ بعض علمائے کشمیر اور مغلوں میں تعلقات بھی تھے اور وہ شہزادوں کے استاذ بھی رہ چکے تھے۔ اس لئے اگر فتاویٰ عالمگیری کی تدوین میں کشمیر کے فضلاء نے بھی اپنی خدمت پیش کی ہو تو مستبعد نہیں ہے۔ مستند مؤرخِ کشمیر خواجہ محمد اعظم دیدہ مری نے عالمگیری میں قاضی حیدر کے اشتراک کا اگرچہ صراحت کے ساتھ ذکر نہیں کیا ہے، تاہم ان کے یہ الفاظ اسی حقیقت کے غماز ہیں۔

اکثر در مجالس تحقیق مسائل شرف حضور ہم داشت[۲]	عالمگیر کی تحقیقی مجلسوں میں بھی حاضر رہنے کا شرف بھی انھیں حاصل تھا۔

۱؂ : الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند، ص ۱۱۰ - ۱۱۱۔
۲؂ : تاریخ اعظمی، ص ۲۱۶۔

مورخ غلام حسن کھویہامی کی تاریخ میں قاضی صاحب کی فتاویٰ عالمگیری میں شمولیت کا ذکر صراحت سے موجود ہے [۱]

قاضی حیدر کا انتقال دکن میں ہوا تھا مگر نعش کشمیر میں لائی گئی تھی۔ وہ بچھ پورہ سرینگر میں مدفون ہیں۔

ملا عبید اللہ کشمیری، ترجمہ عالمگیری | ملا عبید اللہ کشمیر کے نامور عالم تھے، اپنے علم و فضل سے فرخ سیر کے دربار میں مقرب ہوئے اور اسی کے ایما پر فتاویٰ عالمگیری کا فارسی میں ترجمہ کرنے پر مامور ہوئے، مگر شہزادے کی قسمت کا آفتاب بہت جلد غروب ہو گیا جس کی وجہ سے ملا عبید اللہ اپنا کام چھوڑ کر اپنے وطن کشمیر لوٹ آئے۔ مورخین لکھتے ہیں کہ فہم و ذکا اور ذہانت و فطانت میں وہ عجوبہ روزگار تھے۔ ہندوستان اور ایران کے شیعہ علماء سے مناظرے کرتے تھے اور اپنے علم و فراست کا لوہا منواتے تھے تا عمر درس و تدریس سے وابستہ رہے اور سینکڑوں طلبہ کو مستفید کیا [۲]

حاشیہ توضیح و تلویح، حضرت شیخ یعقوب صرفی | حضرت صرفی نے دینی اور ادبی علوم پر عربی و فارسی میں ضخیم کتابیں لکھی ہیں۔ اصولِ فقہ میں ان کا کارنامہ توضیح و تلویح پر عالمانہ حاشیہ ہے، یہ حاشیہ آج بھی موجود ہے۔ وہ غالی حنفی تھے۔ اس حاشیہ میں بھی انہوں نے اپنا مسلک مؤید کرنے میں پوری دلچسپی لی ہے۔ [۳]

---

۱ : تاریخ حسن، ج ۳، ص ۲۵۳ - ۲ : ایضاً
۳ : حیات صرفی ؛ مفتی محمد شاہ سعادت مرحوم

مولانا معین الدین نقشبندی اور الفتاویٰ نقشبندیہ | عہدِ مغلیہ میں کشمیر کے علمائے فقہ اور اصولِ فقہ پر جو کتابیں لکھی ہیں ان میں الفتاویٰ النقشبندیہ خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اس کے مرتب مولانا معین الدین نقشبندی تھے اور انہوں نے ایک جامع تالیف بنانے کے لئے کشمیر کے درج ذیل پانچ سربرآوردہ علماء اور قضاۃ کی ایک انجمن قائم کی تھی۔

۱۔ ملا محمد طاہر: یہ مشہور محدث شیخ حیدر ریشلو کشمیری کے فرزند تھے۔ الفتاویٰ میں کتاب الصلوٰۃ سے کتاب البیوع تک انہوں نے ہی مواد جمع کیا ہے۔

۲۔ مولانا ابوالفتح کلو: یہ بھی شیخ حیدر کے تلمیذِ رشید تھے۔ فقہ، اصول اور عربی زبان و ادب میں وسیع نظر رکھتے تھے، خصوصاً فقہی مسائل کے استنباط و استخراج میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ درسی کتابوں پر شروح کے علاوہ کئی مستقل کتابیں بھی تصنیف کی ہیں جن میں سیف المتابلین اپنے وقت میں بڑی مقبول ہوئی تھی۔ یہ کتاب ردِّ شیعیت میں ہے۔ مولانا کا انتقال ۱۱۰۳ھ میں ہوا تھا۔ سرینگر میں مقبرۂ سلطان زین العابدین میں آسودۂ خاک ہیں۔[1]

۳۔ مولانا محمد یوسف: یہ خواجہ خاوند محمود (والد شیخ معین الدین صاحب) کے محبِ صادق تھے۔ فقہ کے اصول و فروع میں استحضار کے ساتھ معانی اور منطق کے فاضلِ جلیل بھی تھے۔ اپنے معاصر کشمیری علماء مولانا فاضل اور مولانا عبدالرزاق سے مناظرے کرنے میں بھی بڑی شہرت رکھتے تھے۔

۱؎ تذکرۂ علمائے ہند ص ۹۶، حدائق حنفیہ ص ۴۳۵، خزینۃ الاصفیاء ج ۲ ص ۲۵۱۔

اور اُن پر اکثر غالب آتے تھے۔ درس تدریس کے مشغلہ سے ہمیشہ وابستہ رہے، اسی وجہ سے مدرس بھی کہلاتے تھے[1]۔

مولانا غلام نبی، اور مفتی شیخ احمد، کے حالات کسی تذکرہ نگار نے قلمبند نہیں کئے ہیں۔

اس کتاب کی تالیف میں مرتبین نے فقہ کی جو اہم کتابیں پیش نظر رکھی ہیں، ان میں چند اہم کتابوں کے نام یہ ہیں:

(۱) کتاب الخلاصہ: (افتخار الدین طاہر بن احمد بن عبد الرشید البخاری)۔

(۲) خزانۃ المفتیین: (حسین بن محمد السمعانی)۔

(۳) الفتاوی الظہیریہ: (ظہیر الدین ابوبکر محمد بن احمد القاضی المحتسب م ۶۱۹ھ)۔

(۴) فصول الاشتروشنی: (محمد بن محمد الاشتروشنی حنفی م ۶۳۲ھ)۔

(۵) الفتاوی السراجیہ: (علی بن عثمان الاوشی الفرغانی)۔

(۶) قاضی خاں: (فخر الدین حسن بن منصور الاوزجندی م ۵۹۲ھ)

(۷) منیۃ المصلی: (شیخ سدید الدین الکاشغری)۔

(۸) الفتاوی الحمادیہ: (ابو الفتح رکن بن حسام الدین المفتی الناگوری)۔

(۹) خزانۃ الروایات: (قاضی جکن الہندی م ۹۲۰ھ)۔

(۱۰) فتاوی ابراہیم شاہیہ: (شہاب الدین احمد بن محمد معروف بہ نظام الجیلانی)۔

(۱۱) جامع الرموز: (شمس الدین محمد الخراسانی القہستانی م ۹۶۲ھ)۔

(۱۲) تحفۃ الفقہاء: (علاء الدین محمد بن احمد السمرقندی)۔

(۱۳) دستور القضاۃ: (صدر بن رشید بن صدر التبریزی معروف بہ قاضی خواجہ)

(۱۴) حسب المفتی: (قاضی ابو المعالی بن خواجہ البخاری)۔

---

[1] تاریخ اعظمی، ص ۱۴۸ و نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۴۲۴۔

ان اہم فقہی کتابوں کے علاوہ ہدایہ، کافیہ، غنیہ، شرح وقایہ فتاویٰ تاتار خانیہ وغیرہ مشہور و متداول کتابوں سے جگہ جگہ استفادہ کیا گیا ہے۔

شیخ معین الدین صاحب سلطان اورنگ زیب کی مذہبی حمیت سے بہت متاثر تھے، انہوں نے یہ شاندار تالیف عالمگیر کے نام معنون کی ہے۔ اس سے پہلے اپنی تفسیر بھی اسی کے نام منسوب کی ہے۔

ملاّ محمد محسن کشمیری، حاشیہ علی الہدایہ بارہویں صدی ہجری کے عالم اور مصنّف تھے۔ فقہ اور کلام دونوں پر کتابیں لکھی ہیں۔ مذکورہ حاشیہ کے بارے میں ڈاکٹر زبید احمد صاحب نے لکھا ہے کہ یہ دہلی میں موجود ہے[1]

مفتی ابوالوفا کشمیری، کتاب الفقہ مفتی صاحب صاحبِ افتا بزرگ تھے؛ مولانا محمد اشرف چرخی اور مولانا امان اللہ کے تلمیذ رشید تھے مولانا اکبر خاں کی سفارش پر بادشاہِ وقت کے مقرب ہوکر معززدینی منصب پر فائز ہوئے۔ فقہ میں ان کی مشہور تصنیف کتاب الفقہ ہے۔ اس کا ایک نسخہ ریاستی ریسرچ لائبریری (سرینگر) میں موجود ہے کتاب میں بڑی بے ترتیبی ہے؛ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ فقہ سے متعلق افادات اور حواشی کا مجموعہ ہے جو مفتی صاحب نے مختلف وقتوں میں یادداشت کے طور پر نوٹ کیے تھے۔ ۹ محرم ۱۱۷۹ھ میں انتقال کیا اور مزارِ شعراء میں دفن کیے گئے[2]

---

[1]: عربی لٹریچر ہندوستان میں (انگریزی)۔

[2]: الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند، مولانا عبدالحی حسنی، ص ۱۰۹؛ تاریخ حسن، ج ۳، ص ۳۶ نہم۔

ملّا نور محمد کشمیری: حاشیہ علی حاشیۃ السیالکوٹی علی التلویح | ملّا صاحب فقہ اور کلام کے متبحر عالم تھے۔ مذکورہ حاشیہ ملّا عبدالحکیم سیالکوٹی کے حاشیہ توضیح و تلویح کی تحلیل و تشریح ہے۔ ڈاکٹر زبید احمد لکھتے ہیں کہ اس حاشیہ (حاشیہ نور محمد کشمیری) کا ایک نسخہ رامپور میں موجود ہے[1]۔

مولانا محمد امین گانی: اور حاشیہ علی شرح تہذیب | حدیث کے باب میں ہم نے ان کے مختصر حالات بیان کئے ہیں۔ ان کے متعدد شرح و حواشی میں "شرح تہذیب" پر حاشیہ بھی شامل تھا جو تا حال مفقود ہے۔

خلیفہ ابو ابراہیم رفیقی کشمیری | ابو ابراہیم مشہور بزرگ یحییٰ بن معین الدین رفیقی کے فرزند تھے، ۱۲ ذوالحجہ ۱۱۹۲ھ میں تولد ہوئے۔ اپنے دادا معین الدین سے قرآن حکیم پڑھا، پھر درسی کتابوں کی تعلیم اپنے والد سے پائی اور آخر تک انہی کے دامن علم و تربیت سے وابستہ رہے خود بھی علوم متداولہ کے ماہر ہوئے۔ فقہ کی دو عظیم کتابوں پر ان کی تعلیقات ہیں جو ان کا بڑا کارنامہ ہے، یہ دو کتابیں امام محمد بن حسن شیبانی کی الجامع الصغیر اور علامہ ابن نجیم کی الاشباہ والنظائر ہیں[2]۔ شیخ ابو ابراہیم سے جن ممتاز اہل علم نے استفادہ کیا ہے ان میں مفتی قوام الدین، مفتی ہدایت اللہ، سید کمال الدین اندرابی اور مولانا محب اللہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ سنہ ۱۲۱۲ھ میں انتقال کیا[3]۔

---

[1]: ڈاکٹر زبید احمد کی انگریزی تصنیف، ص ۲۸۴۔

[2]: نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۳۲۰۔

[3]: روضۃ الابرار (قلمی)۔

ملّا حیدر پشلو : نور السراج | مشہور عالم مولانا جمال الدین کے فرزند تھے۔ روحانی تربیت اپنے نانا سید حیات خاں سے پائی۔ ایک اور بزرگ شیخ اکبر بادی سے بھی فیض حاصل کیا تھا۔ مؤرخ حسن اپنے زمانے کے علمائے کشمیر کے بارے میں لکھتے ہیں کہ سب کے سب اُن کے شاگرد رہ چکے ہیں۔ ۲۱ ربیع الاول ۱۲۱۴ھ میں انتقال کیا اور اپنے والد کے پہلو میں دفن ہوئے۔ نور السراج کے نام سے سراجی کی شرح لکھی جس میں میراث کے مسائل قواعدِ حساب اور بیسوں نقشوں کی صورت میں سمجھائے ہیں۔ انہوں نے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ یہ شرح "رفیقِ ظریف" کے اصرار پر لکھی گئی ہے۔ پیش لفظ میں ہی انہوں نے اپنے دور کے بدعمل علماء کی سخت الفاظ میں تنقید کی ہے۔ طلبہ کی تفہیم و تعلیم کے لئے سراجی کا منظوم فارسی ترجمہ بھی کیا تھا۔ اس کے علاوہ فقہ میں ان کی ایک اور تصنیف غرائب الرغائب کا نام بھی ملتا ہے۔[۱]

مولانا کریم اللہ اور ان کی فقہی خدمات | مولانا کریم اللہ بن خلیل اللہ کشمیری کے بارے کشمیر کی تاریخیں اور تذکرے خاموش ہیں۔ انہوں نے حضرت شاہ عبدالعزیزؒ صاحب کے فتاویٰ کے ایک مجموعہ کی جمع و ترتیب کا کام انجام دیا۔ یہ مجموعہ ایک ضخیم جلد پر مشتمل ہے، جس میں مولانا عبدالحی بن ہبۃ اللہ بڈھانویؒ اور شاہ محمد اسماعیل شہید دہلویؒ کے فتاویٰ بھی ہیں۔ مولانا کریم اللہ نے یہ خدمت ۱۲۵۳ھ میں انجام دی۔ (الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند، ص ۱۰۹-۱۱۰)

---

[۱] : تاریخ حسن، ج ۳ تذکرہ ملّا حیدر۔

الدرّ المنضود، مفتی صدر الدین آزردہ | مفتی صدر الدین آزردہ کے علمی رسائل اور فتاویٰ میں "الدُّرُّ المنضود فی حُکمِ امرأۃ المفقود" کو علمی حلقوں میں بڑی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی تھی۔ مفتی صاحب کے تمام سرکردہ تذکرہ نگاروں نے اس رسالے کا ذکر کیا ہے جن میں سر سید احمد خان، فقیر محمد جہلمی اور نواب سید صدیق حسن خان شامل ہیں۔ مفتی صاحب کا تحریری سرمایہ جمع و مرتّب کرنے کو (راقم سطور کے معلومات کی حد تک) یہ رسالہ آج تک نہ مل سکا۔ احقر اس اعتبار سے اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتا ہے کہ اسے اس اہم علمی رسالے کا ایک نسخہ ریاست جموں وکشمیر کے شعبۂ مخطوطاتِ عربی و فارسی میں دستیاب ہوا۔ ۱۸ × ۲۲" تقطیع کا یہ مخطوطہ صرف چودہ صفحات پر مشتمل ہے اور اس کے کاتب سرینگر (کشمیر) کے رفیقی خاندان کے ایک عالم حافظ محمد یحییٰ بن شیخ حبیب اللہ رفیقی ہیں۔ حافظ صاحب، مفتی صدر الدین آزردہ کے معاصر تھے، اگرچہ انہوں نے مؤلف سے اپنے کسی جسمانی تعلق یا شاگردی کا رشتہ رکھنے کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا ہے، تاہم صفحہ اوّل پر ہی رسالے کی ابتداء ان الفاظ سے کی ہے۔

"الدُّرُّ المنضود فی حکم امرأۃ المفقود" للفاضل المحقّق والنحریر المدقّق الحاوی للفروع والاصول الجامع بین المعقول والمنقول حُجّۃ الخلف بقیّۃ السلف قُدوۃ المحقّقین اکمل الکاملین صدر الملّۃ والدین المولوی مولانا المفتی صدر الدین دامت افضالہ،

افادته علی رؤس المستفیدین والمسترشدین"
یہ رسالہ استفتا اور فتوٰی کی شکل میں لکھا گیا ہے، اس کی زبان فارسی ہے اور ان الفاظ میں شروع ہوتا ہے:

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

ما قولہم رحمہم اللہ در اینکہ شخصی مفقود است یعنی از موتِ اُو خبرے و از مسکن او اطلاعی نیست و زوجہ اُو جوان است و خوف است کہ مرتکب حرامکاری و زنا شود..... الخ
استفتا میں یہ دریافت کیا گیا ہے کہ ایک ایسے مفقود الخبر شخص جس کی موت اور زندگی کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں ہے، کی بیوی کو جس کے متعلق یہ اندیشہ ہو کہ وہ زنا اور حرامکاری کی مرتکب ہو سکتی ہے، کسی حنفی المذہب عالم کو یہ فتوٰی دینے کا حق پہنچتا ہے کہ وہ اس عورت کو امام مالک کے مذہب کے مطابق اس طرح نکاحِ ثانی کرے کہ موت کی گزرنے کے بعد صرف چار سال تک پھر شوہر کا انتظار کرے۔ حالانکہ فتوٰی دینے والے اس عالم کو اس مسئلے میں امام ابو حنیفہ، صاحبین، امام شافعی (ان کے قولِ جدید کے مطابق) اور امام احمد بن حنبل کے آراء اور تحقیقات کا پورا علم ہے۔

اس کے بعد الجواب کی صورت میں مفتی صاحب نے اپنا فتوٰی اور فیصلہ لکھا ہے۔ انہوں نے دلائل و براہین سے اسے ناجائز قرار دیا ہے۔ وہ سب سے پہلے یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ ایسے مقدمے میں کسی مفتی کا فتوٰی ہی کافی نہیں ہوتا ہے بلکہ اس کے ساتھ قضائے قاضی ملحق ہونا ضروری ہے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ جس مسئلے میں علماء کے درمیان اختلاف

ہوگا وہاں اکثریت کا موقف ملحوظ رکھا جائے گا۔

مفتی صاحب دعویٰ کرتے ہیں کہ اس مسئلے میں امام مالک صاحب رحمتہ اللہ علیہ سے جو فتویٰ منقول ہے، اس میں کئی خامیاں ہیں مثلاً (مفتی صاحب ہی کے الفاظ ہیں)

"ایں حکم مودی مفاسد کثیر است و مستلزم خانہ ویرانی۔ ہزارہا غربائے بیچارہ کہ در سفر بتلاش معاش بفاصلۂ دور و دراز رفتہ اند و خط و کتابت از آنہا نمی رسد ...."

وہ کہتے ہیں کہ نکاح ثانی کے بعد اگر پہلا شوہر آ موجود ہوا تو اب امام مالک ہی کے مذہب کے مطابق وہ اس کی بیوی نہیں ہو گی بلکہ اس کا مالک نیا شوہر ہو گا۔ اس طرح پہلے شوہر کے بچے اور گھر تباہ و برباد ہو جائیں گے۔

اس ضمن میں مفتی صاحب نے تلفیق کے جائز اور ناجائز ہونے کے مسئلے پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ خود ان کا ذاتی رجحان اس کے باطل ہونے کی جانب ہے اور کہتے ہیں کہ مولانا عبدالعلی نے اسے مضبوط دلائل سے باطل ثابت کیا ہے۔ اگرچہ احناف میں ابن ہمام تلفیق کو جائز قرار دیتے ہیں مگر مفتی صاحب اسے اس شرط سے مشروط کرتے ہیں۔

"صورت تلفیق در آنجا ممکن است کہ اجماع ہر دو امر ممکن باشد۔"

وہ آگے کہتے ہیں کہ ایک طرف عقد ثانی کی اجازت دینا اور دوسری طرف مفقود الخبر کی جائیداد کو ہاتھ نہ لگانے دینا تناقض کا حامل ہے

وہ کہتے ہیں کہ امام مالک "کی یہ رائے قرآن، یا حدیث مرفوع یا اجماع

صحابہ میں سے کسی ایک پر بھی قائم نہیں ہے۔ اس کی بنیاد صرف حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ایک فیصلہ پر ہے، یا یہ بنیاد ایلا پر قیاس کر کے قائم کی گئی ہے۔ مفتی صاحب لکھتے ہیں کہ خود حضرت عمرؓ نے ابن ابی لیلیٰ کے مطابق اپنی رائے سے رجوع کیا تھا۔ اگرچہ بخاری شریف کی بعض شرحوں میں عبدالرزاق سے یہ مروی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عبداللہ بن عباس یا حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا مذہب بھی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے فیصلے کے مطابق ہے لیکن وہ صحیح نہیں ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ عبدالرزاق کو اگرچہ بعض ناقدوں نے شیعہ کہا ہے مگر وہ تفضیلی ضرور تھے البتہ ان میں غلو نہیں تھا۔ فتوٰی کا خاتمہ ان سطور پر ہوتا ہے:

"و بالجملہ صورت جواز نکاح زوجہ مفقود در غیبت او بعد انقضائے مدت چہار سال ہیچ گونہ معقول و مقبول نمی شود، درایۃً و نہ روایۃً۔"

اس لئے قابلِ قبول وہی راستہ ہے جسے امام ابو حنیفہ رحؒ نے اختیار کیا ہے:

"فالقول قول امامنا امام الائمہ سراج الامہ ابی حنیفۃ النعمان۔ افاض اللہ علیہ شابیب الغفران واسکنہ فرادیس الجنان۔"

اس رسالے میں اصول فقہ سے متعلق کچھ اہم مسائل بھی زیر بحث آئے ہیں اور چاروں مذاہبِ فقہ سے فاضل مؤلف نے اعتنا کیا ہے۔ رسالے کی علمی قدر و قیمت تسلیم کرنے کے لئے اگرچہ مفتی صدرالدین آزردہ کا نام ہی سند کی حیثیت رکھتا ہے تاہم کچھ مزید اندازہ اس ماخذ سے بھی لگایا

جا سکتا ہے جس کا اس مختصر سے علمی رسالے میں حوالہ ملتا ہے۔ چند کتب و رسائل کے نام ہم یہاں درج کرتے ہیں:

(۱) الرسائل الزینیۃ (۲) شرح ہدایہ: ابن ہمام (۳) مغنی: ابن قدامہ (۴) تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق (۵) شرح مختصر الوقایۃ: قہستانی (۶) المتفق والمختلف (۷) رحمۃ الامۃ فی اختلاف الائمۃ: عبدالرحمن الشافعی (۸) درر المنتقیٰ (۹) بدائع (۱۰) شرح تحقیق فی ابطال التلفیق: ملا حسن شرنبلالی حنفی (۱۱) شرح رسالہ ابن زید (۱۲) شرح مختصر خلیل (۱۳) ترتیب المسالک فی شرح موطا مالک (۱۴) سنن دارقطنی (۱۵) شرح جامع کبیر طحاوی (۱۶) بستان المحدثین: شاہ عبدالعزیز دہلوی (۱۷) ذخیرۃ الصالحین (۱۸) سراج الفقہ وغیرہ۔

کاتب نے رسالہ کے اختتام پہ لکھا ہے کہ "ہم اس کی کتابت سے ۶ ذوالحجہ ۱۲۸۰ھ بروز جمعہ بوقت ظہر فارغ ہوئے ہیں۔"

اثنا عشری فقہ اور تالیفات

کشمیر میں شیعیت کی منظم اشاعت کا آغاز میر شمس الدین صاحب عراقی کے ہاتھوں سے ہوا۔ اگرچہ ان سے پہلے بھی ایران کے اسماعیلی اور باطنی داعی کشمیر وارد ہوا کرتے تھے مگر انہوں نے اپنے پیچھے اپنی دعوت کا کوئی خاص نقش نہیں چھوڑا تھا۔ میر شمس الدین عراقی نے بھی کھل کر شیعیت کا اظہار نہیں کیا، وہ ایک مجدد، مصلح، مامور اور مبعوث کی صورت میں نمودار ہوئے۔ علاوہ ازیں انہوں نے اپنی دعوت پر نوربخشیت کا

خلاف چڑھایا جس میں حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانی کو بھی گھسیٹنے کی کوشش کی گئی مگر یہ ہر حیثیت سے بے بنیاد ہے۔ میر سید علی ہمدانی کے کتب و رسائل اور ان کے نقوش و آثار اُن کے مذہب اہلسنّت والجماعت کے علمبردار ہونے پر شاہد عدل ہیں۔ یہاں اُن کی ایک تحریری دعا پیش کی جاتی ہے:

"یا اکرمَ المسلمین و یا رجاءَ المؤمنین عافیت و آخرت ہمہ اُمتِ محمد صلعم را بخیر گردانی و روحِ مقدس سیّد انبیاء را بصلواتِ زاکیات معطر و منور گرداں۔ آثار فضلِ اہلبیت او را کوکب عرصۂ حقیقت اندر مفارقِ احوالِ سالکانِ راہِ دین و طالبانِ مقصدِ الیقین باقی دار۔ و از برکاتِ انفاسِ صحابۂ کرام رض بروزگار عامۂ اہلِ اسلام در رساں۔ بحرمت نبی المدنی صلعم و آلہ الکرام و اصحابہ العظام یا الٰہ العالمین و یا ارحم الراحمین، برحمتک یا ارحم الراحمین"[۲]

میر صاحب عراقی کے انتقال کے بعد اُن کے جانشینوں اور مقلدوں میں کوئی بھی شخص علم و قلم میں مہارت نہیں رکھتا تھا اس لئے نوربخشیت اپنی انفرادیت کھو کر مکمل طور پر اثنا عشری امامیت میں تحلیل ہو گئی۔ البتہ لداخ کے بعض دور دراز علاقوں میں یہ اپنی بعض خصوصیات محفوظ رکھنے میں کامیاب رہی۔ یورپی سیاحوں میں رائن Vigne اور ڈرگو Frederick Drew نے اپنے مشاہدات لداخی نوربخشیوں کے

---

[۱] مجالس المؤمنین: ملا نور اللہ شوستری (طہران) ص ۳۱۳-۳۱۵۔
[۲] رسالۂ مناجات (قلمی)۔

بارے میں نقل کئے ہیں، اور نوربخشیوں اور عام شیعوں کے کچھ باہمی اختلافات بھی ذکر کئے ہیں۔ اسی طرح میجر بڈلپ Major Biddulph نے Tribes of Hindu Kush, میں بھی نوربخشیوں کے متعلق کچھ دلچسپ معلومات فراہم کئے ہیں۔

کشمیر میں شیعہ فرقے نے آج تک کسی غیر معمولی صلاحیت کا عالم پیدا نہیں کیا۔ مذہبی معاملات میں یہ لوگ ہمیشہ ہندوستان اور ایران و عراق کے اکابر علماء کی طرف رجوع کرتے آئے ہیں۔ البتہ جب کچھ شیعہ گھرانوں نے کشمیر سے ہجرت کر کے ہندوستان کے مختلف مقامات میں طرحِ اقامت ڈالا تو یہاں اُن گھرانوں میں بڑی علمی شخصیتیں پیدا ہوئیں جن کی شہرت کا آوازہ ہندوستان سے باہر بھی پہنچ گیا، اس کا تھوڑا سا اندازہ آغا بزرگ کی "الذریعۃ الیٰ تصانیف الشیعۃ" اور العاملی کی "اعیان الشیعۃ" کا مطالعہ کرنے ہو سکتا ہے۔ بہت سے کشمیری شیعہ علماء قم، کربلا، طہران، شیراز اور نجف کی مشہور درسگاہوں کی زینت بن گئے۔ ہندوستان میں لکھنو شیعانِ کشمیر کا مرکزِ جذب و کشش بن گیا یہاں انہوں نے مستقل قیام کر کے علم کے ہر میدان میں دلچسپی لے لی، اور معقولات میں ناموری حاصل کی۔ اس کتاب کے مختلف ابواب میں ایسے شیعہ علماء کی علمی خدمات کے بارے میں ضروری معلومات (جنہیں ناچیز مؤلف حاصل کرنے میں کامیاب ہوا) پیش کئے جائیں گے۔

فقہ اور فقہیات میں جو مشہور علماء گزرے ہیں یہاں ان کے مختصر حالات درج کئے جاتے ہیں:

---

۱ Jammu & Kashmir Territories, P. 359

محمد بن عنایت اور ان کی تلخیصات کشمیری الاصل شیعہ علماء میں مرزا محمد بن عنایت احمد خاں اور علامہ تفضل حسین اسے قابل ہیں کہ ان پر مستقل کتابیں لکھی جائیں انکے زمانے میں دہلی اور لکھنؤ میں ان کی عظمت و احترام کا چرچا کافی بلند تھا

مولانا کے والد کشمیر سے دہلی وارد ہوئے اور یہیں ان کی ولادت ہوئی، بچپن ہی سے علم حاصل کرنیکا شوق دامنگیر تھا اور حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب سے درسی کتابیں پڑھیں، پھر دہلی کے ایک شیعی عالم سید رحم علی سے فقہ کی تحصیل کی اور حکمت حکیم شریف بن اکمل دہلوی سے پڑھی بحث و مناظرہ اور شیعہ مذہب کی مدافعت مقصد زندگی تھا۔ اس کے نتیجے میں اپنے استاذ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کی بھی سخت مخالفت کرتے تھے بلکہ انکی تصنیف تحفۂ اثنا عشریہ کی تردید میں ایک کتاب بھی لکھی جس کا نام النزہۃ الاثنی عشریۃ فی رد التحفۃ الاثنی عشریۃ تھا، یہ کتاب شیعہ فرقہ میں بڑی مقبول ہوئی اور شیعہ علماء بھی انکی بڑی قدر و منزلت کرتے تھے۔ سلطان العلماء سید محمد صاحب نے ان کے القاب میں یہ الفاظ بھی لکھے ہیں:

حافظ ثغور الملۃ القویمۃ	ملت جعفریہ کی سرحدوں کے محافظ
الجعفریۃ قالع قلاع البدعۃ والملحدۃ	اور ماتریدیہ و اشاعرہ کی بدعتوں کا
للماتریدیۃ والاشعریۃ[1]	قلع قمع کرنے والے تھے۔

یہ عجیب حسن اتفاق ہے کہ کشمیر کے اس نامور شیعہ عالم کے سب سے بڑے حریف وہیں کے سب سے نامور سنی عالم اور متکلم مولانا رشید الدین خاں کشمیری دہلوی تھے، مولانا محمد بن عنایت کا انتقال ۱۲۳۵ھ میں ہوا، ان کی تصانیف معدوم ہیں، فقہ میں درج ذیل تین مشہور کتابوں کی انہوں نے تلخیص تیار کی تھی[2] عالمگیری۔ کافی۔ بدایۃ

---

[1]: نجوم السماء، مرزا محمد علی، مطبع جعفری لکھنؤ ۱۳۰۲ھ، ص ۲۵۲۔
[2]: ایضاً، ص ۳۶۱، و نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۴۴۰۔

جامع الرضویۃ، ملا عبدالغنی کشمیری | والد کا نام ملا طالب تھا اور وہ بھی صاحب علم شخص تھے۔ یہ بارہویں صدی کے علماء شیعہ میں تھے جو ہندوستان سے زیادہ بیرونی ممالک میں مشہور رہے ہیں۔ ملا عبدالغنی نے شیعہ فقہ کی مشہور و متداول کتاب شرائع الاسلام کا فارسی میں ترجمہ کیا اور اسکی شرح بھی لکھی۔ جو ہند ایران اور عراق میں مقبول ہوئی اور مدارس میں داخل نصاب بھی کی گئی، اسی شرح و ترجمہ کا نام جامع الرضویۃ ہے۔ خود لکھتے ہیں:

شکر للہ کہ زیں عروج دو... یافت تالیف ایں نجستہ تمام

ایں چنیں یادگار دو عالم دیدہ کم دیدہ اولوالالباب

ملا صاحب کا انتقال سنہ ۱۱۶۹ھ میں ہوا اور اپنے آبائی مقبرہ میں سپرد خاک ہوئے۔

رسائل محمد باقر رضوی | محمد باقر بن علی بن صفدر بن صالح الرضوی القمی الکشمیری سنہ ۱۲۸۵ھ مطابق سنہ ۱۸۶۹ء میں تولد ہوئے اور سنہ ۱۳۴۶ھ مطابق سنہ ۱۹۲۸ء میں کربلا میں انتقال کیا عمر رضا کحالہ ان کے تذکرہ میں لکھتے ہیں:

فقیہ، اصولی، ادیب، شاعر، مشارک فی بعض العلوم[1]

وہ فقیہ، اصولی، ادیب، شاعر اور بعض علوم میں دستگاہ رکھتے تھے۔

عقلی علوم ریاضی، ہیئت، منطق اور فلسفہ کی تحصیل لکھنؤ میں علامہ تفضل حسین خان اور ملا حمید علی سے کی، پھر عراق کا سفر کیا، یہاں نجف میں شیخ کاظم خراسانی، حسن مامقانی اور ملا حمید علی سے دینی علوم کی تحصیل کی، کچھ مدت سامرا میں رہ کر کربلا آئے اس کے بعد لکھنؤ واپس ہوئے اور اپنے والد کے مدرسہ سلطان المدارس میں درس دینے لگے، بڑے بڑے علماء شیعہ کو ان سے شرف تلمذ حاصل تھا، پھر دوبارہ کربلا گئے اور وہیں ساٹھ سال کی عمر میں رحلت کی۔ فقہ میں ان کے درج ذیل تین رسائل یادگار ہیں اور طبع ہو چکے ہیں:[2]

۱: معجم المؤلفین، ج ۳، ص ۹۲، مطبعۃ الترقی بدمشق سنہ ۱۹۱۱ء۔

۲: اعلام الشیعۃ آغا بزرگ طہرانی، ج ۱، ص ۱۹۲، ۱۹۳۔ بروکلمن: ۱۱، ۸۶۴۔

(۱) الروضۃ الغنا فی حرمۃ الغنا (۲) القول المصون فی فسخ نکاح المجنون (۳) اسداء الرغائب۔

محمد رضوی: نجاسۃ الماء القلیل | محمد بن علی بن جعفر رضا صالح رضوی قمی کشمیری لکھنؤ میں ولادت ہوئی تھی اور کربلا میں ۴ محرم ۱۳۳۴ھ کو انتقال کیا۔ ان کے والد محمد باقر تھے جن کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ یہ حدیث، فقہ، کلام اور فقہ میں بڑی دستگاہ رکھتے تھے۔ فقہ میں ماء راکد سے متعلق نجاسۃ الماء القلیل کے نام سے ایک رسالے کا ذکر ملتا ہے۔[۱]

التمویہات: محمد مہدی کشمیری | مولانا مہدی بن حیدر الصفوی مشہور امامی عالم گزرے ہیں۔ فقہ میں انکی تصنیف "التمویہات العرویۃ فی فروع الفقہ" کے نام سے موسوم ہے انہوں نے نجف میں اپنے قیام کے دوران اس کا مواد جمع کیا، پھر کشمیر لوٹے اور یہاں اسکی ترتیب و تہذیب کا کام مکمل کیا، جیساکہ علامہ خیر الدین الزرکلی نے لکھا ہے:

فرغ منہ فی النجف و ہذبہ فی کشمیر[۲] — اسکی تصنیف سے نجف ہی میں فارغ ہو چکے تھے مگر ترتیب و تہذیب کشمیر میں کی۔

مولانا مہدی نے سنہ ۱۳۰۹ھ مطابق ۱۸۹۶ء میں انتقال کیا۔

ترجمہ شرائع الاسلام: محمد صادق کشمیری | سید محمد صادق بن محمد باقر الرضوی الکشمیری کے حالات نہیں ملتے۔ شرائع الاسلام کا اردو ترجمہ "روائع الاحکام" کے نام سے کیا تھا اور اسی کی بدولت شہرت پائی۔ مولانا عبدالحی حسنی صاحب نے اپنی تصنیف الثقافۃ میں "کتب الفقہ فی مذہب الشیعۃ" کے تحت اس کا ذکر کیا ہے۔[۳]

اقامۃ البرہان: سید ابو الحسن | مولانا سید ابو الحسن بن نقی شاہ کشمیری لکھنوی نامور علمائے ہند میں شمار کئے جاتے ہیں۔ فقہ میں رسالہ "اقامۃ البرہان فی حلۃ

۱: معجم المؤلفین، ج ۱۱، ص ۱۸   ۲: الاعلام، ج ۸، ص ۲۵۷۔
۳: الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند، ص ۱۳۲۔

القهوة والقلیان" اور اصول فقہ میں "اسعاف المامول شرح زبدۃ الاصول" ان کی علمی یادگار رہیں۔[1]

سید علی شاہ کشمیری | سید علی شاہ ہجرت کرکے عراق چلے گئے مگر پورے بارہ سال کے بعد حکیم مہدی علی خاں کشمیری نے انہیں فرخ آباد بلا کر امامت کا منصب سپرد کیا، جب مہدی علی فرخ آباد سے لکھنؤ آئے تو سید علی شاہ ان کے ہمراہ تھے۔ بالآخر یہیں ۲۵ ربیع الاول ۱۲۶۹ھ میں انتقال کیا، وہ شیعہ علماء میں متبحر فقیہ کی حیثیت سے بڑی عزت و احترام کے مالک تھے۔ حکیم اکبر شاہ ان کے بارے میں لکھتے ہیں۔

کان عالماً فاضلاً طویل	وہ عالم و فاضل اور فقہ و
الباع فی الفقه والاصول	اصول میں دستگاہ رکھتے تھے
لا باس بان اقول انه	اگر میں انہیں فقہاء کا
کان ملک المتفقهین۔[2]	بادشاہ کہوں تو یہ نامناسب
	نہیں ہوگا۔

ملا علی بادشاہ کشمیری | مولانا عبدالحکیم راست گو کے شاگرد تھے، کشمیر میں تولد ہوئے اور یہیں نشو و نما پائی۔ پھر فیض آباد آئے اور یہیں مستقل سکونت اختیار کی۔ انہوں نے نماز پنجگانہ اور جمعہ کو جماعت کے ساتھ ادا کرنے کے لئے فیض آباد کے شیعوں کو ترغیب دلائی اور اس مقصد میں کامیاب بھی ہوئے، انہوں نے باجماعت نماز ادا کرنے کی فضیلت میں ایک رسالہ بھی لکھا ہے جس میں احادیث

---

[1]: الثقافة الاسلامية فی الهند، ص ۱۳۲۔

[2]: سبیکة الذهب، ص ۸۴، مطبع اثنا عشری ۱۳۰۵ھ۔

اور شرعی دلائل کی روشنی میں اپنا موقف پیش کیا ہے۔ نواب آصف الدولہ اور اس کے وزیر سرفراز الدولہ، مرزا حسن رضا خان سے ان کے اچھے تعلقات تھے، ان دونوں نے نماز باجماعت کی تحریک و ترغیب میں ملا صاحب کی بڑی مدد کی۔ مذکورہ بالا رسالہ کے علاوہ انہوں نے کئی اور رسالے بھی لکھے تھے مگر وہ تلف ہو گئے۔[1] تبلیغ دین کے ساتھ درس و تدریس کا شغل بھی رکھتے تھے۔ حکیم سید اکبر لکھتے ہیں:

كان يشيع مسائل الحلال والحرام ويرشد الانام باصول الدين وفروعه شاغلاً بترويج الاحكام الشرعية وتدريس[2] للمسائل الاصلية والفرعية۔

وہ حلال و حرام مسائل کی اشاعت اور دین کے اصول و فروع کو سمجھانے میں لوگوں کی ہدایت کرتے تھے، شریعت کے احکام پھیلانے اور اصول و فروع مسائل سکھانے میں مشغول رہتے تھے

۱: نجوم السماء، مولوی مرزا علی کشمیری، مطبع جعفری لکھنؤ ۱۳۰۳ھ۔
۲: سبیکۃ الذہب، ص ۵۹۔